جنوری 2021 قیمت 15₹

قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ
www.urducouncil.nic.in

ماہنامہ

اردو دنیا

نئی دہلی

Monthly **URDU DUNIYA**, New Delhi

نیا سال مبارک

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ بچوں کی دنیا دہلی

Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

پیاری پیاری نظمیں

قسط وار ناول

دل چسپ کہانیاں

معلوماتی مضامین

ہنسنے ہنسانے کی باتیں

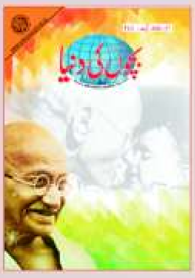

ان کے علاوہ:

کہکشاں ◆ سیاحتی مقامات

اردو فیس بک ◆ دماغی ورزش

ننھے فنکار ◆ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

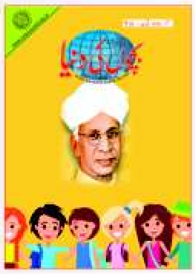

سب سے زیادہ چھپنے والا بچّوں کا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ: 10 روپے   سالانہ: 100 روپے

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

زرِتعاون سالانہ 100 روپے بنام NCPUL اکاؤنٹ نمبر: A/C: 90092010045326، IFSC: SYNB0009009 میں جمع کریں۔

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159،   E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

شاخ : 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون: 040 - 24415194

اردو دنیا

ماہنامہ

قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ

جلد:23، شمارہ:01، جنوری 2021

مدیر : ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

مشیر : حقانی القاسمی

معاونین: عبدالرشید اعظمی، یوسف رامپوری، نایاب حسن

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارت تعلیم، حکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

مطبع:

ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا

فیز-II، نئی دہلی-110020

مقام اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

کمپوزنگ: محمد اکرام

ڈیزائننگ: محمد زید

قیمت -/15 روپے سالانہ -/150 روپے

Total Pages: 100

- اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل NCPUL اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں
- ڈرافٹ NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر

فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا جسولہ، نئی دہلی-110025

فون: 49539000 شعبۂ ادارت: 49539009

ویب سائٹ

http://www.urducouncil.nic.in

E-mail: editor@ncpul.in

urduduniyancpul@yahoo.co.in

شعبۂ فروخت

ویسٹ بلاک-8، ونگ-7 آر کے پورم، نئی دہلی۔110066

فون: 26109746، فیکس: 26108159

ای میل: sales@ncpul.in,ncpulsaleunit@gmail.com

شاخ: 110-7-22 تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس

بلاک نمبر 5-1 پتھر گٹی، حیدرآباد۔500002

فون: 040-24415194

مشمولات

اداریہ

ہماری بات — 4

خطوط

آپ کی بات — قارئین کے خطوط — 5

تعلیم ترسیل تحقیق

جدید ٹیکنالوجی اور تدریسی نظام — روبینہ — 9

موجودہ امتحانی نظام: مسائل اور امکانات — شکیل — 11

پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ میں اردو تحقیق — محمد عرفان ملک — 13

نقد و نگاہ

اردو تذکرہ نویسی اور مولوی عبدالحق کی تحقیق — محمد نذیر احمد — 16

حسرت جے پوری کی غزل گوئی — نذیر فتح پوری — 19

دور اوّل کی اردو شاعری میں حب الوطنی — عبدالحفیظ — 21

ن م راشد اور اقبال — رئیسہ پروین — 25

عطیہ حسین اور زوال پذیر جاگیردارانہ نظام — محبوب حسن — 28

یاد رفتگاں

زیر لب: صفیہ اختر کی ایک سرگوشی جو گونج اٹھی — محبوب ثاقب — 31

گمشدہ معصومیت کا متلاشی محمد علوی — قمر جہاں — 34

پیغام آفاقی کی فکشن نگاری — محمد شارب — 37

خصوصی گفتگو

زاہد جعفری جلال پوری سے گفتگو — ساجد جلال پوری — 40

عربی ادبیات

سعودی میں ناول نگاری — صہیب عالم — 43

بوکر انعام یافتہ ناول نگار عبدالوہاب عیساوی — جسیم الدین — 46

عبدالحمید جودہ سحار — محمد قاسم — 48

شخصیات

وامق جونپوری — آفتاب عالم اعظمی — 51

مخمور سعیدی کی شعری کائنات — عرفان رشید — 54

شہر ستارے

بیکانیر میں غیر مسلم فنکاروں کی اردو خدمات — شکیلہ بانو — 57

نیا آسماں نئے ستارے

خودنوشت سوانح نگاری میں ہیئتی تجربہ کاری — سید وجاہت مظہر — 61

علی جواد زیدی اور تعمیری ادب — عبداللہ اسلم — 65

اردو میں ادبی تاریخ نگاری — ارشاد قمر — 68

صحت اور سماجیات

کورونا، بحران اور پیشہ ورانہ سوشل ورک — محمد اسرار عالم — 71

کمپیوٹر

ورک شیٹ کو سجانا — 75

کتابوں کی دنیا

تبصرہ و تعارف — ادارہ — 77

خبرنامہ

اردو دنیا کی خبریں — ادارہ — 85

ہماری بات

یوم جمہوریہ کی مبارکباد!

26 رجنوری بحیثیت قوم ہم سب کے لیے بہت اہم ہے۔ اسی دن آئین ہند کا مکمل طور پر نفاذ ہوا تھا یعنی اس دن انگریزوں سے ہمیں پورے طور پر خلاصی حاصل ہوئی تھی جس کے لیے ہمارے آباؤ اجداد نے بڑی قربانیاں دیں، صعوبتیں اٹھائیں، جیل گئے اور شہید ہوئے۔ ان کی اس جدوجہد سے ہمیں یہ پیغام ملتا ہے کہ ہمیں ملک کی حفاظت اور ترقی کے لیے ہر سطح پر جدوجہد کرنی چاہیے اور باہم متحد رہنا چاہیے۔ آپسی میل جول اور اتحاد ہی کی وجہ سے انگریزوں کے لیے ہندوستان پر مزید اپنے تسلط کو جاری رکھنا مشکل ہوگیا تھا اور بالآخر انھیں ہندوستان چھوڑنا پڑا تھا اور پھر دستور ہند کے نفاذ کے بعد ہمیں ان کے بنائے ہوئے قانون سے بھی نجات مل گئی تھی۔ لہٰذا ہم سب آئین ہند کا احترام کریں اور اس پر پوری طرح سے عمل پیرا ہوں۔ نیز جمہوریت کے جو بھی تقاضے اور مطالبات ہیں ان کو بروئے کار لائیں۔ ہم جس قدر جمہوریت کو مضبوط کریں گے، اسی قدر ملک بھی مضبوط ہوگا اور ملک کے تمام طبقات اور افراد بھی پرسکون زندگی گزاریں گے۔ یاد رکھیں کہ جمہوریت کے استحکام کے لیے 'اتحاد' بہت ضروری ہے۔ 'اتحاد' آج بھی ہماری طاقت ہے۔ آج بھی ہم اتحاد کی بنیاد پر ہی اپنے ملک کو آگے لے جاسکتے ہیں، اختلافات کی صورت میں ملک کی ترقی و سالمیت کا حقیقی خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہ ہوگا۔ ہمارے ملک میں بہت سے مذاہب ہیں، تہذیبیں ہیں، زبانیں ہیں اور یہ سب چیزیں مل کر ملک کو مضبوط بناتی ہیں۔ کثرت میں وحدت کے تصور کو ہمیں آگے لے جانے کی ضرورت ہے۔ جمہوریت کا تقاضہ ہے کہ ہم جہاں بھی رہیں، جو بھی کریں، ایمانداری اور دیانت داری کے ساتھ کریں اور اپنے عمدہ کردار سے ملک کے نام کو روشن کرتے رہیں۔

اردو ہمارے ملک کی ایسی زبان ہے جس نے ہمیشہ جمہوری اقدار کا پاس ولحاظ رکھا ہے اور اپنے کردار سے جمہوریت کو تقویت بخشی ہے۔ اس زبان کے صحافیوں، ادیبوں اور شاعروں نے گنگا جمنی تہذیب کی بھرپور ترجمانی کی۔ اردو کے شعری اور نثری سرمائے کا مجموعی جائزہ خود اس بات کو آشکار کر دیتا ہے کہ اردو کی جبلت میں جارحیت نہیں جمہوریت ہے۔ اس زبان میں انجذاب و انکساری، شگفتگی و شیرینی ہے اور انہی عناصر سے اردو کا خمیر تیار ہوا ہے۔ اگر بات نرم لہجے میں کی جائے تو وہ سخت دل کو بھی پگھلا دیتی ہے۔ عجز وانکساری سے ہر شخص متاثر ہوتا ہے، اور لچک و منکسر المزاجی شقی القلب لوگوں کے دلوں میں اپنا مقام بنا لیتی ہے۔ چونکہ یہ سب چیزیں اردو زبان میں بدرجہ اتم موجود ہیں، اس لیے وہ انسانی معاشرے میں محبت پھیلانے میں زیادہ کامیاب رہی ہے۔ اردو کے شعرا کو اس لیے ہمیشہ پسند کیا گیا کہ انھوں نے نرم، شگفتہ اور لچک دار لہجہ میں اپنی بات اور خیالات کو پیش کیا۔ اسی طرح کا کردار اردو کے ان ادیبوں نے نبھایا جنھوں نے افسانے، ڈرامے اور ناول لکھے۔ آج بھی اردو زبان کے اندر انسانی اور جمہوری اقدار کے احیا اور فروغ کی بھرپور صلاحیت ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اردو کے قلمکار، صحافی، ادیب اور شعرا پوری قوت کے ساتھ محبت کی خوشبو کو ہر جگہ پھیلائیں اور انسانی معاشرے کو امن و محبت کے نغمات سے بھر دیں۔ آج کے مادی دور میں جب کہ ہر طرف لوگوں کے درمیان فاصلے بڑھ رہے ہیں، مفادات کے تصادم سے انسانیت جاں بلب ہے، اس لیے محبت، یگانگت، اتحاد و اخوت کو فروغ دینے کی شدید ضرورت ہے۔

عقیل احمد

شیخ عقیل احمد

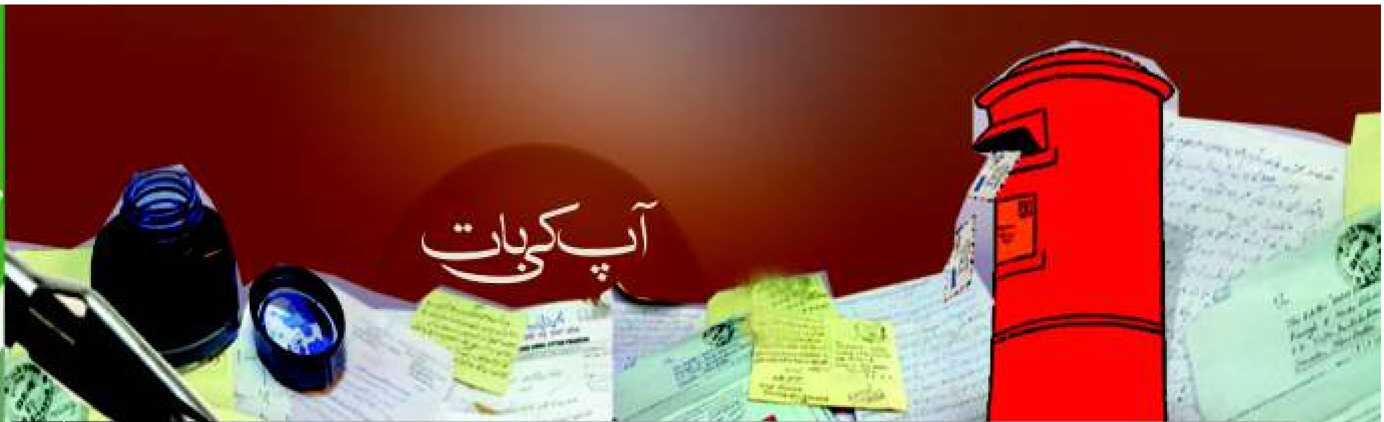

آپ کی بات

ماہنامہ 'اردو دنیا' میں 'آپ کی بات' کے تحت قارئین کے خطوط شائع کرنے کا قطعی مقصد نہیں ہوتا کہ محض ستائشی اور تحسینی کلمات لکھے جائیں بلکہ رسالے کے مشمولات کے حوالے سے نئے مباحث پر گفتگو کو آگے بڑھانا ہوتا ہے۔ ماضی میں مکتوبات بہت سے مضامین سے بھی زیادہ بیش قیمت ہوتے تھے کہ ان میں مشمولہ مضامین کے تعلق سے نئے نکات، مباحث کی نشاندھی کی جاتی تھی۔

قارئین سے گذارش ہے کہ ماہنامہ 'اردودنیا' کے مشمولات کے حوالے سے بحث انگیز خطوط ارسال کریں اور ان نئے موضوعات، عنوانات، شخصیات اور علاقوں کی نشاندھی کریں جنھیں نظرانداز کیا جاتا رہا ہے۔ آپ کے خطوط ہمارے لیے بہت اہمیت کے حامل ہوتے ہیں، ان سے ہمیں رسالے کو خوب سے خوب تر بنانے میں مدد ملتی ہے۔ (ادارہ)

آپ کی اقبال دوستی اور قدر شناسی کے لیے میں ممنون التفات ہوں۔ آپ نے میری تحریر کو موقر جریدے میں جگہ دے کر میری توفیقات میں اضافہ کیا ہے۔ ناچیز محسوس کرتا ہے کہ آپ کی معاونت اور ڈاکٹر شیخ عقیل احمد کی سرپرستی میں رسالے کے علمی وقار اور عوامی مقبولیت نے ایک خوشگوار صورت پیدا کی ہے۔ رسالے میں معلومات کے حوالے اور تخلیقی ادب کے تجزیے نے ہر صاحب ذوق کے لیے اسے ناگزیر حیثیت بخشی ہے۔ آپ کے تجربات نے مزید امکانات روشن کیے ہیں۔ ترتیب و تزئین کی دلکشی نے رسالے کو فروزاں کیا ہے اور قاری کو فہم و فرزانگی بھی بخشی ہے۔

پروفیسر عبدالحق: پروفیسر ایمریٹس، یونیورسٹی آف دہلی، دہلی

اردو دنیا نومبر 2020 کا شمارہ باصرہ نواز ہوا جس میں 'ہماری بات' کے زیرعنوان مدیر اعلیٰ کا پرمغز اداریہ 'آپ کی بات' کے زیرعنوان قارئین کے تاثرات زینت شمارہ ہیں۔ تخلیق ادب، تحقیق و تنقید، سائنس و ٹیکنالوجی، ادبی تاریخ وغیرہ موضوعات کی نمائندگی کے ساتھ اس مرتبہ مذکورہ شمارے میں بچوں کے ادبی گوشے پر مشتمل شائع مضامین خود اپنے میں منفرد نوعیت کے حامل ہیں۔ صادقہ نواب سحر نے اپنے مضمون موجودہ عہد کے بچوں کا ادب میں ہمہ لسانی ادب اور عالمی ادب کے تناظر میں ادب اطفال کی غرض و غایت، اہمیت و افادیت سے تفصیلی بحث کرتے ہوئے بچوں میں تخلیق ادب کے رجحان اور افزائش ادب کی حوصلہ افزائی کرنے پر زور دیا ہے نیز بچوں میں تخلیق ادب کے تعلق سے بچوں کی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کو بنظر تحسین دیکھا گیا ہے جسے لائق تحسین و ستائش ہی کہا جائے گا۔ ڈاکٹر آفاق عالم صدیقی نے اپنے مضمون بعنوان 'بچوں کا تحریر کردہ ادب' میں بچوں کے تخلیق ادب کا گوشۂ صحافت میں جگہ دینے کو ناگزیر بتاتے ہوئے بچوں کے تخلیق کردہ ادب کے مثبت امکانات کی روشنی میں بھرپور تفصیلی مضمون تحریر کیا ہے جس کی ستائش نہ کرنا ادبی دیانت داری کے خلاف ہوگا۔ پرویز اشرفی کا مضمون 'مرتضیٰ ساحل تسلیمی' نہ صرف مرحوم کو خراج عقیدت ہے بلکہ ادب اطفال کے تناظر میں مرتضیٰ ساحل تسلیمی کی خدمات کو اجاگر کرتا ہوا انتہائی اہم مضمون ہے جس کے لیے یقیناً پرویز اشرفی صاحب بھی مبارکباد کے مستحق ہیں۔ محترمہ سعدیہ سلیم صاحبہ نے اپنے مضمون 'بچوں کے ادب کے فروغ میں رسالہ نور کی خدمات' میں رسالہ مذکور کے تاریخی حوالہ جات سے ماہنامہ نور کے مذہبی، اصلاحی صحافتی رنگ کو بھرپور طریقے سے قارئین سے روبرو کرایا ہے، یقیناً آج ماہنامہ 'نور' جیسے ادبی پرچوں کی کمی کا احساس ہوتا ہے جس کی تلافی نہیں ہو پا رہی ہے۔ شاہد جمال صاحب کا مضمون 'ادب اطفال اور بچوں کی نفسیات' اوّل تا آخر اپنے موضوع کی بھرپور ترجمانی و نمائندگی کرتا ہوا بھرپور مضمون ہے جس میں موصوف نے بچوں کی نفسیات اور عمر کے لحاظ سے تخلیق زبان کا درست مشورہ عالمی ادب اطفال کے تناظر میں دیتے ہوئے اس امر پر اظہار تاسف کیا ہے کہ آج بچوں کے لیے لکھنا چند دانشور و ادیب خود کے لیے کسر شان سمجھتے ہیں جب کہ ادب اطفال ہر عہد میں ایک سنجیدہ اور تعمیری کوشش ہے۔ علاوہ ازیں جناب عبدالحق صاحب کا مضمون 'اقبال کی داستان سرائی'، 'اردو طنز و مزاح کی روایت اور نظیر اکبرآبادی' از مظہر احمد، محمد اختر کا مضمون 'مولانا آزاد اور سائنس و ٹیکنالوجی'، 'پروفیسر فضل امام کی یادیں' از فاروق بخشی، 'ورڈس ورتھ کی فطرت پرستی' از محمد جلیل 'شہر ناندورہ کا ادبی منظرنامہ' از محمد علیم اسماعیل، 'اردو کے اہم محققین' از محمد راشد اقبال، 'سیاسی مذہبی جبر اور انگارے' از محمد اسد، 'تقسیم ہند کا المیہ' از رضوان احمد، 'افسانوی روایت کا منفرد راوی نیر مسعود' از نثار احمد وغیرہ مضامین تاریخی، تحقیقی و تنقیدی رنگ و آہنگ رکھنے کے ساتھ تنوع رکھتے ہوئے ادبی اوصاف کے حامل ہیں جن کی مناسب پذیرائی ہونی چاہیے۔ سرورق بچوں کے جرائد اور بچوں کے ادب سے متعلق کتب کے ٹائٹل کور پیج سے سجا ہوا ہے جس سے رسالے کی صوری معنویت میں مزید چار چاند لگ گئے ہیں۔

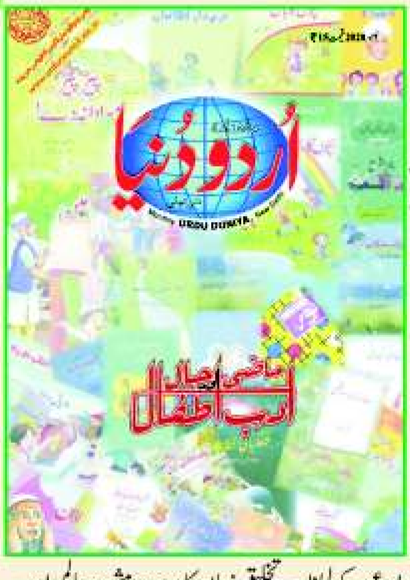

محمد احمد دانش روانوی: کاشانۂ گلزار، نزد تاج پیلیس، پوسٹ راجہ کا تاجپور، بجنور، یوپی

نومبر ماہ کے شمارے میں آپ نے سرقے کی بات کی ہے، تصنیفات میں نام نہاد ادبا کے سرقے کی خصلت کی جانب بھی اشارہ کرکے تلخ حقیقت کی بخوبی خط کشی کی ہے۔

اس شمارے میں شہرۂ آفاق عوامی شاعر جناب نظیر اکبرآبادی کی شاعری پر مظہر احمد کا مضمون معیاری ہے، مگر اس میں نظیر کی شاعری کی بجائے اس پر کی گئی پیروڈیوں کا تبصرہ قدرے زیادہ ہو گیا ہے۔اس کے برعکس موصوف کی بے نظیر شاعری کی متعدد صفات کا ذکر بالخصوص درکار تھا۔

محترمہ صادقہ نواب سحر کا مضمون 'موجودہ عہد کے بچوں کے ادب' کے موضوع کا تحقیقی تجزیہ انصاف کرتا ہے۔اس میں سنسکرت کی نصیحت آموز کتاب 'پنچ تنتر' کے علاوہ لاتعداد ضروری بالخصوص انگریزی کتب کا جس طرح سے اجمالاً محاکمہ ومحاسبہ کیا گیا ہے وہ قابل تقلید ہے۔شمارے میں ادارے نے نئی پرانی کتب کو شائع کرنے کا جو فیصلہ کیا ہے، اس کی بھی تصدیق ہوتی رہتی ہے۔یہی محترمہ کے مقالے کا ایک مزید ماحصل ہے۔انگریزی زبان کے شہرۂ آفاق پوئٹ ولیم ورڈسورتھ کے مضمون کے تحت جناب محمد جلیل نے فقط ایک ہی نظم 'کوئل' کا جائزہ پیش کیا ہے۔

دسمبر ماہ کے شمارے کے گوں ناگوں سرورق پر اردو ادب کی نابغہ روزگار اہم ہستیوں کی تعداد 18 دیکھ کر اس ناچیز کو شہرۂ آفاق ہندو صحیفہ 'شری مد بھاگود گیتا' کے 18 ہی ادھیاؤں (ابواب) کی تعداد سے مماثلت کا خوشگوار احساس ہوا ہے۔

اگرچہ 'ہندوستانی روحانیت کے مسیحا' جناب اروبندو گھوش کے لاثانی فلسفے کی بابت چند کتب شائع ہوکر مقبول عام بھی ہو چکی ہیں، تاہم مضامین کی تاریخ میں ڈاکٹر شیخ عقیل احمد کا عرق ریزی سے لبریز مقالہ ایک نایاب تاریخی دستاویز کا رتبہ رکھتا ہے۔اس میں موصوف کے بارے میں مابعد الطبیعت اور مابعد الجدیدیت ان دونوں میں کون سا فلسفہ اول نمبر پر رکھنے کا مستحق ہے اور کون سا دوئم نمبر پر، اسکا فیصلہ کرنا مشکل ہے یا یہ کہیں کہ ان دونوں میں باہمی تعامل قائم کرنا اروبندو گھوش کا ہی حصہ ممکن ہو سکتا تھا۔قاری مطالعہ کرتے وقت ایک ناتمام روحانی سفر کی لاجواب گپھاؤں سے گزرتے ہوئے مڑکر بازگشت کرنے کی کوئی بھی گنجائش نہیں پاتا ہے اور پے در پے آگے ہی آگے گامزن ہوتا چلا جاتا ہے۔بقول قتیل شفائی

جادونگری ہے یہ پیارے آوازوں پر دھیان نہ دو
پیچھے مڑ کر دیکھ لیا تو پتھر کے ہو جاؤ گے

ہمارے ملک کی تہذیب وتمدن کو ساری دنیا میں سرفہرست رکھنے والے یہی اروبندو گھوش گویا راحت اندوری صاحب کے ہی اس شعر میں یوں گویا ہونے لگتے ہیں۔

میں چپ مر جاؤں، میری الگ پہچان لکھ دینا
لہو سے میری پیشانی پہ ہندوستان لکھ دینا

جناب محمد نوشاد عالم نے ڈاکٹر راحت اندوری کی منفرد شاعری وتشخص پر مبنی اپنے مضمون میں تُرش طنزوں کی بے بہا معقول مثالوں کے ساتھ استعارات کا بھی قابل مدح استعمال کیا ہے۔

جگر مرادآبادی کی منفرد شاعری پر مبنی ندیم احمد صاحب کے مضمون میں بھی انھیں تمام خصائص کے علاوہ ضرب المثل بن جانے والے لاتعداد اشعار کا ذخیرہ انکی شاعری کی خاصیت رہی ہے۔مثلاً 'میرا پیغام محبت ہے...'، 'محبت میں ایک ایسا وقت...'، 'ہم کو مٹا سکے...' اور 'یہ عشق نہیں آساں...' وغیرہ کا لافانی مرقع پیش کیا گیا ہے۔ان کی شاعری میں اس 'اسلوب تضاد' کے وہ متعدد نمونے دستیاب ہوتے ہیں، جو کہ قدیم سے لے کر جدید ترین شعرا کی شاعری کی متواتر زینت رہے ہیں۔شمارے کے آخر میں ڈاکٹر شیخ عقیل احمد کی تدوین کردہ اہم کتاب 'آج کے تناظر میں اردو کا تحفظ اور فروغ' کا جیسا طویل، لیکن قابل تقلید تبصرہ پیش کیا گیا ہے، اس کے لیے جناب حقانی القاسمی یقینی طور پر مبارک باد وتہنیت کے اس لیے حامل ہیں، کیونکہ کتاب کے سات ابواب میں شامل علما وفضلا کے مضامین کا گویا ایک سیر حاصل وپُر مغز خلاصہ کرنے میں کوئی بھی کور کسر نہیں چھوڑی گئی ہے اور ہر ایک مضمون نگار کے مفید اور اہم افکار کا خلاصہ کرتے ہوئے قارئین کو کتاب کو خرید کر اسکا مطالعہ کرنے پر آمادہ کر دیا ہے، جو کہ ہر ایک بلند مرتبت والے تبصرے کا نصب العین ہوا کرتا ہے۔

ڈاکٹر کرشن بھاوک : کوٹھی نمبر A-201، گورونانک نگر گلی نمبر 18-K، A-201، پٹیالہ (پنجاب)

ماہنامہ 'اردو دنیا' اکتوبر 2020 کے اداریہ میں گاندھی جی کی شخصیت، سیرت، کردار، تعلیمات اور فلسفیانہ عدم تشدد کی اہمیت کو اجاگر کیا گیا۔انھوں نے ہمیشہ گنگا جمنی تہذیب سے محبت کی اور اسے قولاً وعملاً فروغ بھی دیا۔انھوں نے مذہبی تہذیبی علاقائی اور لسانی تنازعات کو ختم کرنے کے لیے جو حل پیش کیا اسے اپنانے کی ضرورت ہے تاکہ ہر جگہ محبت ویگانگت اور انسانیت کی بالادستی قائم ہو۔آپ کی بات میں دو خطوط شائع ہوئے مزید شائع کریں کیونکہ اس کالم سے مشمولات کی قدر و قیمت کا اندازہ ہوتا ہے۔ نایاب حسن نے 'الیکٹرانک اور سوشل میڈیا کے عہد میں اردو قلمکاروں کی ذمے داریاں' قومی اردو کونسل کا عالمی ویبینار 2020 رپورٹ شائع ہوئی ہے، محمد اسداللہ نے انٹرویو میں کہا کہ زبان قوموں کی ترقی کی ضامن ہے۔سلیم محی الدین نے 'غالب ہاکنگ، خدا اور کائنات' میں کہتے ہیں کہ غالب کی منطقی فکر کے پیچھے سائنس یا فلسفہ نہیں ہے۔ یہ تصوف کی دین ہے۔ پروفیسر لطف الرحمٰن کا ادبی سرمایہ مشتاق احمد وانی میں لطف الرحمٰن کی ادبی ذہانت کا احاطہ کیا گیا ہے۔'پروین شجاعت حقوق نسواں کی ایک بلند آواز: پروفیسر شمیم نکہت' کا اچھا مضمون ہے۔ ارشد جمیل نے تاریخی اور سماجی اہمیت میں سفرنامے کی تعریف، تاریخ اور اس کی سماجی اہمیت کو واضح کیا ہے۔عادل حیات نے اختر انصاری کا افادی ادب پر ان کے تخلیقی وتنقیدی نظریات کا احاطہ کیا ہے۔کتابوں کی دنیا، تعارف وتبصرہ، خبرنامہ وغیرہ 100 صفحات کا یہ شمارہ اپنے اندر ہمہ جہت ادبی خوبیاں لیے ہوئے ہے۔اس میں مواد عمومی اور جدید انداز کا ملتا ہے۔ نئے ادبی، تنقیدی، تحقیقی نکات ملے ہیں۔ یہ شمارہ اسکالر اور ادب کے طالب علموں کے لیے مفید، ثمرآور ثابت ہوگا۔ اردو کے ہر طالب علم کے لیے اس کا مطالعہ کرنا ناگزیر ہے۔ NCPUL کا یہ شمارہ ایک کتاب سے کم نہیں ہے۔یہ رسالہ اردو داں حضرات کے گھروں وخاندانوں تک پہنچنا چاہیے۔

ڈاکٹر محمد ناظم علی: مکان نمبر 17-7-335، برہمن واڑی، یاقوت پورہ، حیدرآباد، تلنگانہ

پہلی تخلیق پہلا تاثر

ماہنامہ اردو دنیا نومبر 2020 کا شمارہ نظر نواز ہوا۔'پہلی تخلیق پہلا تاثر' کے عنوان کے تحت تحریری سلسلے کا آغاز بہت خوب ہے۔ یقیناً قلمکاروں کو اپنے خیالات کا اظہار کرنے کا موقع ملے گا۔ان کے ادبی سفر اور ادبی خدمات کا مختصر جائزہ پیش ہوگا۔ واقعی یہ بہت اچھا قدم ہے۔

درحقیقت پہلی تخلیق پہلا تاثر چھوڑتی ہے۔اس مسرت کی کوئی انتہا نہیں رہتی ہے۔ اس مسرت کے ساتھ ایک نئی تحریک جنم لیتی ہے۔تحریک کے معنی رغبت دلانا جوش دلانا، آمادہ کرنا، شوق دلانا یا ساکن کو متحرک کرنا ہوتے ہیں۔تخلیق کی قبولیت، ادب، قلمکار اور اس کی ادبی خدمات کا اعتراف ہوتا ہے۔ واقعی یہ اعتراف اور تحریک، قلمکار کی زندگی میں تغیر وتبدیلی رونما کرتی ہے۔ایک نیا جوش اور نیا ولولہ پیدا کر دیتی ہے۔اگرچہ یہ اس کی ہمت افزائی اور عزت افزائی ہوتی ہے۔ادب کی خدمت کا جذبہ موجزن ہوتا ہے۔ اس کا عزم وحوصلہ بلند ہو جاتا ہے بلند حوصلوں کے ساتھ اس کی اڑان ہوتی ہے۔ وہ

اپنے ادبی سفر میں بہتری کی جانب رواں دواں ہوتا ہے۔ساتھ ہی اس کی دلچسپی، توجہ، یکسوئی، وقت مطالعہ اور طرز تحریر میں بیش بہا تبدیلی اور اضافہ دکھائی دیتا ہے۔ وہ اچھے سے بہتر اور صالح ادب کی جانب گامزن ہوتا ہے۔

اگر چہ اخبارات کی زندگی مختصر لیکن اہم ہوتی ہے اور اس کی اشاعت کے فیصلے بہت ہی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ان کے متعلق بقول شاعر یہی کیا جاسکتا ہے۔

یہ بڑے نصیب کی بات ہے　　　یہ بڑے کرم کے ہیں فیصلے

رسائل کی زندگی طویل اور دیرپا ہوتی ہے۔اچھے رسائل تو اچھا کردار ادا کرتے ہیں۔ یہ تو سونے پہ سہاگا ہوتے ہیں۔کسی قلمکار کو ایک اچھا ادیب یا شاعر بنانے میں ان کا اہم رول ہوسکتا ہے۔ان کی صرف 'ایک بلے' قلمکار کے پیج کو کامیاب و کامران بناسکتی ہے۔(بلے ابلی :کلمہ ایجاب 'ہاں' جی ہاں (فارسی) ہے۔اس کے ایک بلے 'ہاں' قلمکار کی زندگی سنوار دیتی ہے ورنہ اس کے یہ دروازے سدا کے لیے بند ہوجاتے ہیں۔مشاہدہ ہے۔ان کے بارے میں بالکل صحیح کہا ہے، 'جو چاہیں معتبر ہوجائے ہستی'۔

واقعی ایک قلمکار کو معتبر کرنے میں ان کا اہم رول ہوتا ہے۔ کیونکہ ذہنی اور تحریری تربیت میں ادبی رسائل بہت اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ میں آپ کے سامنے اپنی پہلی تخلیق کی اشاعت کے سلسلے میں اپنے دلی جذبات وخیالات کا اظہار کروں گا۔

میرے ادبی سفر کا آغاز 1977 سے ہوتا ہے۔جس کی ابتدا ادب اطفال کی کہانیوں اور مضامین سے ہوئی ۔درس وتدریس کے دوران طلبہ کا ساتھ رہا۔ان کی نفسیات' ضروریات اور مسائل کی واقفیت بھی ضروری ہے۔ابتدا میں تعلیم نسواں پر قلم اٹھایا۔عورت، شمع فروزاں، عورت سرچشمہ محبت، عورت شمع علم کی روشنی میں، عورت مرد کی نظر میں' وغیرہ عنوانات پر تعریفی وتوصیفی خیالات پر مضامین اور کہانیاں سپرد قلم ہوئیں۔روزنامہ اردو ٹائمز ممبئی کے کالم' آنچل' کے تحت مضامین شائع ہوئے جس کی نگراں محترمہ رفیعہ شبنم عابدی تھیں اور ادب کالم 'لوح وقلم' کے نگراں انجم رومانی تھے۔

'شمع فروزاں عورت' کے تحت مضمون شائع ہوا۔اخبار دیکھتے ہی دوتین اخبارات خرید لیے۔خوشی کا ٹھکانہ نہیں تھا۔گھر اور اسکول میں ہمارے مضمون کا ذکر ہورہا تھا چونکہ اہلیہ معلّمہ تھیں۔ان کی ساتھی معلّمات انہیں نشانہ بنارہی تھیں لیکن مضمون کی اشاعت کی خبریں دونوں مدارس میں پھیل چکی تھیں۔متحرک کن قدم سے ہماری آمادگی آنچل کی جانب جھک گئی۔اب آنچل میں نئے نئے مضامین اور کہانیاں زینت بنتی گئیں۔

تعطیلات گرما میں ممبئی جانا ہوا۔اردو ٹائمز کے دفتر میں مرحوم انجم رومانی صاحب سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔موصوف اردو ٹائمز کے ادبی صفحہ 'لوح وقلم' کے نگراں تھے۔ بہت خوش ہوئے ہماری یہ ملاقات پر مغز و پر معلومات رہی۔میری ایک ادیب اور ایک صحافی سے پہلی ملاقات تھی۔جن کی گفتگو اور شخصیت نے مجھے کافی متاثر کیا تھا۔کچھ دنوں بعد موصوف کا خط موصول ہوا۔خط مختصر تھا۔میرے بارے میں لکھا تھا،

''عزیزی عزیز عرفان صاحب سے دفتر اردو ٹائمز میں ملاقات ہوئی۔
صالح اور باعمل نوجوان ہیں۔ان کی کاوشوں سے پتہ چلتا ہے کہ مستقبل
میں یہ اپنی جداگانہ شناخت بنانے میں کامیاب رہیں گے۔
اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔''

انجم رومانی
اردو ٹائمز ممبئی

Date:29-10-1987

بعدازاں اردو ٹائمز ممبئی کے ادبی کالم 'لوح وقلم' اور خواتین صفحہ' آنچل' کا مستقل قلمکار بن گیا۔ 1987 میں آنچل کا مجموعہ' آنچل کے ستارے' منظر عام پر آیا۔ 1988 میں بچوں کے لیے ہی ہمارے بیتا' شمع فروزاں' اور' درخشاں ستارے' جیسے ادب اطفال کی تصانیف منظر عام پر آئیں۔مہاراشٹر اردو اکادمی ممبئی نے انہیں مالی تعاون اور انعام سے نوازا۔

دوسرے تاثر میں ماہنامہ' اردو دنیا' قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کا ذکر کروں گا۔یہ بات بھی اظہر من الشمس ہے کہ ماہنامہ اردو دنیا رسائل کی دنیا کا ایک مشہور و معروف نام ہے جو بین الاقوامی شہرت کا حامل ہے۔ایک قلمکار کی اس سے امید یں وابستہ رکھنا لازمی ہے۔جب میرا مقالہ بنام، 'پہلی جنگ آزادی 1857 اور بہادر شاہ ظفر'، 'اردو دنیا' کی پہلی تخلیق ثابت ہوا۔خوشی ہوئی۔یہ اشاعت سنگ میل ثابت ہوئی۔ دوسرے دن چیک بھی موصول ہوا جس نے خوشی دوبالا کردی۔دوسرے ماہ اردو دنیا کے خطوط میں آپ کی بات میں الحاج شفیق احمد صاحب نے میرے اس مضمون کی تعریف بیان کی اور کہا کہ بہادر شاہ ظفر کی قربانیوں کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

یہ تاثر اور قومی کونسل کا تعاون میرے لیے مبارک ثابت ہوا۔متحرک ہوکر مطالعہ کتب کا شوق سوا ہوا۔تاریخ وتحقیق اور تاریخ ادب اردو کا مطالعہ وسیع ہونے لگا۔ پرواز فکر اور تخلیقی قوت میں بیش بہا اضافہ ہونے لگا۔اگر چہ یہ میرا دور وظیفہ یاب معلّم کی حیثیت سے تھا لیکن میرے لیے اُردو ادب کا زریں دور تھا۔

فی الحال میں اردو دنیا کی ہی مثال پیش کروں گا۔اگر' اردو دنیا' میں قلمکاروں کے لیے یہ 'پہلی تخلیق پہلا تاثر' نہ ہوتا تو میں اپنے دلی جذبات کا اظہار سپرد قلم نہیں کرسکتا تھا؟ اگر آپ 'سوال نامہ برائے انٹرویو' نہ دیے ہوتے تو ڈاکٹر اسد اللہ صاحب ناگپور اور دیگر حضرات انٹرویو کے جوابات 'اردو دنیا' میں تحریر نہیں ہوتے۔'اردو دنیا' خصوصاً قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کا کردار بہت ہی اہمیت کا حامل ہے۔اردو زبان وادب کے ارتقا میں ان کا اہم رول ہے۔

❖ **ڈاکٹر عبدالعزیز عرفان**: روبرو مولانا آزاد کالج جینٹل کالونی، پلاٹ نمبر 34، اورنگ آباد، مہاراشٹر

یہ داخلی احساس کی بات ہے کہ اردو رسائل میں شائع ہونے کا احساس الگ ہوتا ہے اور اردو دنیا میں آپ کی کوئی تحریر شائع ہوتی ہے تو اس کا احساس الگ ہوتا ہے۔میرا پہلا مضمون مارچ 2020 میں بعنوان 'ترجمہ سے ترجمانی' شائع ہوا۔اس مضمون سے مجھے اتنا حوصلہ ملا کہ اس کا احصا لفظوں میں مشکل ہے. اس مضمون کو فیس بک پر لگایا تو پروفیسر مرزا حامد بیگ نے جو کمینٹ کیا وہ ہو بہو نقل کرتا ہوں ''ترجمہ نگاری سے مشکلات کے متعلق بہت انوکھے پہلو سامنے لائے ہیں، جو تاحال میری نظر میں تو آئے نہیں، نہ فن ترجمہ نگاری سے متعلق کسی نے ڈسکس کیا۔ یہ بات وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ فروری 1974 تاحال فن ترجمہ نگاری سے جوجھ رہا ہوں۔ میری پی ایچ ڈی 1986 کا یہی موضوع تھا۔اگر یہ مضمون پہلے پرنٹ ہوجاتا تو ہو بہو میری تالیف کردہ کتاب 'فن ترجمہ نگاری' 2019 کا حصہ ہوتا۔میرا نقصان ہوا جس کا افسوس ہے۔''

ان کے بعد پروفیسر محمد صادق نے بھی فون پر حوصلہ افزا کلمات سے نوازا اور ان سے مستقل علمی رابطہ ہوا۔اس مضمون میں چند عربی اشعار استعمال ہوئے ہیں مجھے ان اشعار کے مضامین یاد تھے لفظ ہو بہو یاد نہیں تھے۔اشعار کو جاننے کے لیے اپنے مدرسہ کے ابتدائی درجہ کے استاد مولانا عبدالحمید کے پاس پرتاپ گڑھ یوپی ایک دن کے لیے جانا پڑا، کیونکہ وہ اشعار میں نے انہی کی زبان سے تقریباً پندرہ برس پہلے سنے تھے اتفاق سے وہ انھیں یاد نہیں بلکہ مختلف متون کے ساتھ یاد تھے۔الغرض اردو دنیا نے جب اس مضمون کو شائع کیا تو اس سفر کا نتیجہ مل گیا جس کا احساس دیگر مضامین کی اشاعت سے الگ تھا۔

❖ **امیر حمزہ**: K-12، تھرڈ فلور، حاجی کالونی، جامعہ نگر، اوکھلا، نئی دہلی 110025

قلمکاروں سے چند معروضات

ماہنامہ 'اردو دنیا' علمی اور ادبی مجلہ ہے جس میں ادبیات، سماجیات، اقتصادیات، تہذیب و ثقافت، تعلیم و تدریس، زبان و لسانیات، سائنس و ٹکنالوجی، طب و فلسفہ، فنونِ لطیفہ، نفسیات، زبان کی زمینی صورت حال، عالمی ادبیات اور دیگر موضوعات پر مضامین شائع کیے جاتے ہیں۔ یہ خالص علمی اور ادبی نوعیت کا رسالہ ہے۔ اس میں مذہبی مباحث اور متنازعہ فیہ مسائل پر مضامین کی اشاعت کی گنجائش نہیں ہے۔ یہ رسالہ صرف 100 صفحات پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس رسالے میں پوری اردو دنیا کے دانشوروں، ادیبوں اور قلمکاروں کی تحریریں اشاعت کے لیے موصول ہوتی ہیں۔ بہت سے مضامین اشاعت کے لیے منظور کر لیے جاتے ہیں لیکن بہت سی تحریریں اشاعت سے محروم رہ جاتی ہیں۔ بہ کثرت مضامین موصول ہونے کی وجہ سے ادارے کو بہت سی دقتوں کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے۔ اس لیے قلمکاروں سے گذارش ہے کہ اپنی تحریریں بھیجتے وقت مندرجہ ذیل امور کا بطورِ خاص لحاظ رکھیں۔

- مضمون غیر مطبوعہ ہو۔ کسی اخبار/ مجلے میں ارسال نہ کیا گیا ہو اور نہ ہی اپنی یا کسی مرتب کردہ کتاب میں شامل ہو۔
- مضمون ادارے کے مزاج، معیار اور پالیسی کے منافی نہ ہو۔
- مضمون ان پیج پروگرام میں ہو اور 2500 (پچیس سو) الفاظ سے کم اور 4000 الفاظ سے زیادہ نہ ہو۔
- مضمون میں اعداد و شمار رومن میں لکھیں اور مضمون کے آخر میں حوالے/حواشی (کتب اور مضامین) کا اندراج ضرور کریں۔
- اچھوتے، نئے اور اہم موضوعات پر بھیجے ہوئے مضامین ترجیحی طور پر شائع کیے جائیں گے اور عمومی نوعیت کے مضامین کی اشاعت موصول ہونے کی ترتیب کے لحاظ سے کی جائے گی۔
- ایسے موضوعات یا شخصیات پر مضامین کی اشاعت ممکن نہیں جن پر بہ کثرت کتابیں یا مقالے شائع ہو چکے ہوں۔ ایسے موضوعات/شخصیات پر مضامین بھیجتے وقت چند سطروں میں نئے نکات اور نئے زاویے کی نشاندہی لازمی ہوگی۔
- جن مضامین میں زبان و بیان کی خامیاں اور حقائق، حوالے املا جملہ کی غلطیاں ہوں گی انھیں کسی بھی صورت میں اشاعت کے لیے منظور نہیں کیا جائے گا۔
- مضمون میں اشعار اور اقتباس کی صحت کا التزام اور ضرورت سے زیادہ اشعار اور اقتباسات سے پرہیز لازمی ہے۔
- شخصیات پر مضمون بھیجتے وقت متعلقہ فنکار کی تصویریں، کتابوں کا عکس اور دیگر ضروری معلومات ضرور ارسال کریں۔
- شہر یا ادارے پر لکھتے ہوئے اس سے متعلق تصاویر اور دیگر اہم معلومات لازمی بھیجیں۔
- درج ذیل تصدیق نامہ موصول ہوئے بغیر مضمون کی اشاعت پر غور نہیں کیا جائے گا:

''میرا مضمون غیر مطبوعہ ہے۔ کسی اخبار/ مجلہ/ اپنی یا مرتب کردہ کتاب میں شامل نہیں ہے۔ یہ کسی کتاب/ مضمون کا سرقہ یا چربہ نہیں ہے۔ اگر کچھ نقص پایا گیا تو اس کے لیے میں خود ذمہ دار ہوں گا/ ہوں گی۔''

- کسی دوسری زبان کا ترجمہ اصل متن کے ساتھ ارسال کریں اور مصنف کا اجازت نامہ بھی منسلک کریں۔
- مضمون میں پہلے یا آخری صفحے پر مضمون نگار کا نام، مکمل پتہ مع پن کوڈ (انگلش میں) اور موبائل نمبر ضروری ہے۔

مضمون کی حتمی منظوری ایڈیٹوریل ریویو کے بعد ہی دی جائے گی۔

قلمکار حضرات اخلاقی ضوابط Ethical guidelines کا پورا خیال رکھیں۔

—ادارہ

جدید ٹکنالوجی اور تدریسی نظام

روبینہ

اکیسویں صدی میں ٹیکنالوجی نے تیز رفتار ترقی کی ہے۔ خاص طور پر انفارمیشن ٹیکنالوجی کے شعبے میں بہت بڑا انقلاب آیا ہے۔ اکیسویں صدی میں جدید ٹیکنالوجی زندگی کے ہر شعبے میں داخل ہوگئی ہے اور ٹیکنالوجی کا استعمال اپنے کام کو بہتر بنانے میں لازمی تصور کیا جارہا ہے۔ تعلیم کے شعبے میں بھی ٹیکنالوجی کا اثر محسوس کیا جارہا ہے۔ آج تعلیم کے حصول کے ذرائع میں اسکول کالج یونیورسٹی، اساتذہ اور کتابوں کے علاوہ الیکٹرانک ذرائع جیسے ای کلاس روم، اسمارٹ کلاس، اوور ہیڈ پروجیکٹر، کمپیوٹر سی ڈیز، ٹیابلیٹ کمپیوٹر، لیپ ٹاپ وغیرہ شامل ہیں۔ جن کی مدد سے عصر حاضر کا استاد اپنے نئے زمانے کی تعلیم کو بہتر بنا سکتا ہے۔

اکیسویں صدی کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے معلم کا کردار انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ یہ معلم موجودہ تعلیمی رجحانات اور ٹکنالوجی کے ساتھ اپ ڈیٹ رہتے ہیں اور جانتے ہیں کہ برسوں سے اپنائے ہوئے اپنے پرانے سبق کے منصوبوں کو مزید جدید بنانے کے لے ان کو کیسے موافق بنانا ہے۔

آج کل طالب علم انٹرنیٹ، ٹیلی ویژن اور سیل فون کے اچھے برے اثرات کے ساتھ تعلیم کے ماحول میں قدم رکھ رہے ہیں۔ ایسے میں طالب علم کی صلاحیتوں کو مثبت افکار کی جانب موڑنا ایک ماہر تعلیم استاد کی اولین ذمے داری ہوتی ہے۔ چنانچہ کلاس روم میں بھی روایتی کتاب: بلیک بورڈ اور چاک پیس و نقشہ جات کے علاوہ ایک ماہر استاد اپنے لیپ ٹاپ اور پروجیکٹر کی مدد سے طلبا کو اپنے سبق کو بہتر طور پر سمجھا سکتا ہے۔ اس کے لیے استاد کو کمپیوٹر کا ماہر ہونا ہوگا۔ اور وہ پاور پوائنٹ سہولت کی مدد سے مختلف معلوماتی سلائیڈز کی مدد سے اپنے سبق کو بہتر دلچسپ اور عصر حاضر کے تقاضوں سے متعلق ہم آہنگ کرسکتا ہے۔

تعلیم میں ٹکنالوجی کے فوائد

تعلیمی معیار کو زمانے کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کے لیے ٹیکنالوجی کا استعمال کیا جارہا ہے آج آن لائن خدمات کا سلسلہ شروع ہوگیا ہے۔ تعلیمی ادارے آن لائن درخواستوں کا حصول اور مختلف امتحانات کے ہال ٹکٹ بھی آن لائن فراہم کررہے ہیں۔ طلبا کے لیے آن لائن داخلوں کی کونسلنگ ہورہی ہے۔ فیس کا ادخال کور بینکنگ کے ذریعے ہورہا ہے۔ اور طلبا کے ہال ٹکٹ اور او ایم آر بارکوڈ شیٹ بھی کمپیوٹر کی مدد سے تیار کیے جارہے ہیں اور امتحانات کے بعد نتائج کا اعلان اور مزید کارروائی بھی کمپیوٹر اور آن لائن ٹیکنالوجی کی مدد سے ہورہی ہے۔ اس آن لائن سہولت کو تدریس میں بھی استعمال کیا جارہا ہے۔ اور آؤٹ سورسنگ خدمات کے ذریعے طلبا کو درس دیا جارہا ہے۔ دنیا کے کسی ایک مقام پر رہنے والا ایک قابل استاد دنیا کے کسی بھی گوشے میں موجود اپنے شاگرد کو ایک تیز رفتار کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کنیکشن کی بدولت آن لائن پڑھا سکتا ہے اور یہ طرز تدریس ان دنوں بہت مقبول ہے۔

تعلیم میں ٹکنالوجی کے استعمال کے مندرجہ ذیل فوائد ہیں۔

ٹیکنالوجی اب صرف ایک مضمون کا مسئلہ نہیں رہا بلکہ تمام مضامین کا لازمی حصہ ہے:

1. اس سے سائنسی، معاشی، تکنیکی معلومات اور کثیر الثقافتی خواندگی اور عالمی سطح پر آگاہی ملتی ہے۔
2. یہ اختراعی سوچ کو فروغ دیتی ہے۔ جو درج ذیل کی حوصلہ افزائی کرتی ہے:

الف) موافقت اور پیچیدگیوں کو ہینڈل کرنا.
ب) تجسس، تخلیقی صلاحیت اور Risk لینا۔
پ) اعلی سطح کی سوچ اور صحیح استدلال۔

1. اس سے موثر مواصلات فروغ پاتے ہیں جو ٹیم، اشتراک اور شخصی مہارتوں کو پروان چڑھاتی ہے۔ اس کے علاوہ، یہ ذاتی، معاشرتی اور شہری ذمے داری کو فروغ دیتی ہے۔
1. یہ اعلی پیداواریت کو فروغ دیتی ہے جو منصوبہ بندی اور نتائج کو ہینڈل کرنے کی صلاحیت پیدا کرتی۔ اس کے علاوہ یہ آپ کو موثر، متعلقہ اور اعلی معیار کے نتائج کے ساتھ حقیقی دنیا کے آلات کے استعمال کا احساس کرواتی ہے۔

ٹکنالوجی کے ساتھ اور ٹکنالوجی کے بغیر تعلیم

تعلیم صرف کتابی نہیں ہوتی۔ بلکہ زندگی میں آنے والا ہر دن اور اس دن ہونے والے کسی واقعہ سے سبق حاصل کرنا تعلیم کا ہی حصہ ہے۔ اچھی تعلیم وہی ہے جس میں فرد کی ہمہ جہت ترقی ہو۔ تعلیم کا فائدہ یہ ہے کہ انسان کی زندگی سنورتی ہے۔ اور وہ اپنی زندگی کو بہتر بنا سکتا ہے۔ تعلیم روشنی ہے۔ ٹکنالوجی کے استعمال سے حاصل ہونے والے فوائد کی پیمائش کے لیے ہم تعلیم کو دو قسموں میں تقسیم کررہے ہیں:

اگر ہم ٹیکنالوجی کے بغیر تعلیم دیتے ہیں تو یہ نتائج ہیں:

یہ غیر فعال ہے/ یہ رسمی ہے/ یہ معلم کارفرما ہے/ یہ وقت پر منحصر ہے/ دوسروں کے ذریعہ فراہم کردہ مواد/ تکمیلی تشخیص کے بعد ہی گریڈ دیا جاتا ہے/ تمام طلبہ مکمل طور پر حصہ نہیں لیتے ہیں۔

اب، اگر ہم ٹیکنالوجی کے ذریعے تعلیم دیتے ہیں تو یہ نتائج ہیں:

یہ فعال ہے/ یہ غیر رسمی ہے/ یہ طالب علم کارفرما ہے/ یہ وقت پر منحصر نہیں ہے/ طلبا کے ذریعے بیان کردہ مواد/ انفرادی شراکت کی پیمائش کی جاتی ہے/ ترقی تک رسائی/ تمام طلبہ مکمل طور پر حصہ لیتے ہیں۔

اکیسویں صدی کا استاد

One book, one pen, one child, and one teacher can change the world.

- Malala Yousafzai

اکیسویں صدی کی تدریس کا مطلب ہے ایسے تعلیم دینا جیسا کہ آپ نے ہمیشہ پڑھایا ہے لیکن آج کے ٹولز اور ٹکنالوجی کے ساتھ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آج کی دنیا میں جو بھی اہم ہے اس کو بروئے کار لائیں تاکہ طلبا آج کی معیشت میں خوشحالی کے ساتھ زندگی گزار سکیں اور ساتھ ہی طلبا کی رہنمائی کریں اور مستقبل کے لیے انھیں تیار کریں۔ اکیسویں صدی کے اساتذہ کی توجہ کا مرکز طلبا اعلی ترتیب سے سوچنے کی مہارت، موثر رابطے، تعاون اور دیگر مہارتوں کی ترقی کی طرف راغب کرنا ہے جن کی انھیں 21 ویں صدی میں ضرورت ہے۔ اساتذہ کو نئی تدریسی حکمت عملی تیار کرنی ہوگی جو یکسر مختلف ہوں۔ استاد کا کردار رہنما اور سہولت کار کا ہے جو محض علم فراہم کرنے والا نہیں۔ ٹکنالوجی کی مدد سے متعدد طریقوں اور تعلیمی اصولوں کا استعمال کرتے ہوئے ہدایات فراہم کرنا چاہیے اور طلبا کو لازمی طور پر سیکھنے میں مصروف رکھنا چاہیے۔ جدید ترین ٹیکنالوجی چاہے اسباق کے لیے ہو یا گریڈ کے لیے اساتذہ اور طالب علم کو بہتر اور تیز تر سیکھنے کے قابل بنائے گی۔ ایک موثر استاد جانتا ہے کہ جدید ترین گیجٹ

کے بارے میں جاننے سے وہ اپنے طلبا کی تعلیم کو واقعتاً بدل سکتا ہے۔ لہٰذا وہ صرف نئے رجحانات کے مطابق نہیں ہوتا بلکہ واقعتاً جانتا ہے کہ طلبا میں مہارت کیسے پیدا کی جائے۔

Technology is just a tool, in terms of getting the kids working together and motivating them, the teacher is the most important. -Bill Gates

اکیسویں صدی کے ایک استاد میں بہت سی خصوصیات ہیں جو اسے روایتی استاد سے ممتاز کرتی ہیں۔

1. اساتذہ کو عالمی سطح پر سوچنا ہوگا:

اس پر اتفاق ہے کہ مقامی یا بین الاقوامی اسکولوں میں اساتذہ کی تدریس سے قطع نظر دنیا سکڑ گئی ہے۔ اساتذہ کو سیکھنے والوں کی نئی نسل جو عالمی سطح پر سوچتے اور عمل کرتے ہیں تیار کرنے کی ضرورت ہے۔ لہٰذا استاد کو واقف حقائق اور روزمرہ کے تجربات کے علاوہ پوری دنیا کی مثالوں اور بیانات کو شامل کرنا ہوگا۔

1. اساتذہ کو مختلف ثقافتی اختلافات اور تنوع کی طرف حساسیت پیدا کرنا ہوگا:

چونکہ لگتا ہے کہ طلبہ مقامی طور پر کام کرتے ہیں لیکن پھر بھی وہ دنیا بھر کے طلبہ سے لاشعوری طور پر جڑے ہوئے ہیں۔ بہت سے طلبا ممکن ہے کہ وہاں کام کرنے کے لئے مختلف ثقافتی ماحول والے دور دراز مقامات کا سفر کریں۔ ثقافتی اختلافات کو سنبھالنے کی صلاحیت انھیں مستقبل کے مسابقتی مقامات میں ایک برتری دیتی ہے۔

1. اساتذہ کو تکنیکی طور پر جانکاری ہونی چاہیے:

تمام اساتذہ کو اپنے مضامین، وسائل کے ذخایر، اسکولوں کی ترتیبات وغیرہ سے قطع نظر اپنی صلاحیتوں خصوصاً Technical تکنیکی مہارتوں کو مستقل طور پر اپ گریڈ کرنا ہوگا۔ انہیں مسلسل تبدیل ہونے والی ٹکنالوجی کے ساتھ اپنی سطح میں اضافہ کرنے کی ضرورت ہے۔

A.P.J. Abdul Kalam, "Excellence is a continuous process and not an accident."

4. اساتذہ کو کمرہ جماعت کے باہر شراکت اور اتحاد قائم کرنا ہوگا:

اساتذہ کو نصاب کی تعلیم کے لیے مضامین کے ماہرین کو شامل کرنا ہوگا تاکہ سیکھنے کا عمل موثر ہو اور حقیقی دنیا پر اس کا اطلاق ہو سکے۔ جیسے ویڈیو کلپ کے ذریعے ماہر تعلیم کے لکچر سننے میں مدد مل سکتی ہے یعنی یہ کلاس روم میں کسی ماہر تعلیم کو مدعو کرنے کا متبادل ہے۔ طلبا کے لیے مواقع پیدا کرے کہ وہ حقیقی زندگی کے ماہر تعلیم/ سائنس دانوں/ ماہرین سے ملنا پسند کریں ان سے وہ براہ راست سوالات کر سکتے ہیں جو ان پر ہمیشہ دیرپا اثر ڈالتے ہیں۔

5. اساتذہ کو کمرہ جماعت میں مشترکہ اکتساب کرنا ہوگا:

حقیقت اور میرا ذاتی تجربہ یہ ہے کہ اساتذہ طلبا سے اتنا ہی سیکھتے ہیں جتنا کہ طلبا استاد سے۔ اساتذہ کو کلاس رومز میں مشترکہ تعلیم کی اہمیت اور ضرورت کو قبول کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ روایتی کلاس رومز کو چیلنج کرتا ہے سیکھنے کے عمل کو مستقل کرتے ہوئے یہ درس و تدریس کے عمل کو نئے معنی عطا کرتا ہے اور اساتذہ کو یہ قبول کرنے میں مدد کرتا ہے کہ سیکھنا کبھی نہیں رکتا۔ اس طرح یہ تعلیمی تجربات کو تقویت بخشتا ہے۔

دیگر خصوصیات میں استاد کو درج ذیل کا مالک ہونا چاہیے:

- اکتسابی عمل طالب علم مرکوز ہونا ضروری ہے۔
- اساتذہ کو پڑھاتے وقت کمپیوٹنگ کے نئے آلات استعمال کرنے کی ضرورت ہے۔
- اساتذہ کو کلاس روم میں فعال سیکھنے کی حمایت کرنی ہوگی۔
- اساتذہ کو سیکھنے کے لے مدعو ماحول بنانا ہوگا۔

''میں اپنے شاگردوں کو کبھی نہیں سکھاتا، میں صرف ان حالات کو فراہم کرنے کی کوشش کرتا ہوں جس میں وہ سیکھ سکیں۔'' البرٹ آئن سٹائین

- طلبا کو کارکردگی کی سطح پر جانچنا چاہیے۔ اور طلبا کی کارکردگی پر مبنی تشخیص پر ہمہ وقت اساتذہ کی نظر ہونی چاہیے۔
- اساتذہ کو تدریس باہمی تعاون کی تائید کرنی چاہیے۔

اکیسویں صدی کا استاد مندرجہ بالا خصوصیات کا حامل ہونا چاہیے۔ ٹیکنالوجی مسلسل طور پر تبدیل ہوتی رہتی ہے اور متروک ہو جاتی ہے لیکن استاد مستقل رہتا ہے۔ وہ طلبا میں روزانہ سیکھنے کے جذبے کو آگے بڑھاتے ہیں رہنمائی کرتے ہیں طلبا کو ہر دن بہتر کام کرنے کی ترغیب دیتے ہیں اور اپنے خوابوں کو سمجھنے اور پورا کرنے کے لیے تیار کرتے ہیں۔ آج کی دنیا میں استاد بننے کا مطلب یہ ہے کہ اساتذہ کو تعلیمی اداروں میں استعمال ہونے والے بدلتے ہوئے ٹولز اور تبدیلیوں کو اپنانا ہوگا۔ اسمارٹ بورڈز چاک بورڈز کی جگہ لے رہے ہیں اور ٹیب لیٹ درسی کتب کی جگہ لے رہے ہیں اور 21 ویں صدی کے اساتذہ کو اس سے واقف ہونے کی ضرورت ہے۔

21 ویں صدی تبدیلی کی صدی ہے جہاں تعلیم کا مطلب علم کی منتقلی (Transmission) نہیں بلکہ فرد اور معاشرے کی تبدیلی (Transformation) ہے۔ اشد ضرورت ہے کہ اساتذہ انتہائی حد تک کام کرے۔ صحت عامہ سے لے کر معاشی امور تک تعلیم خود ہی بڑی تبدیلیوں سے جدوجہد کر رہی ہے۔ اساتذہ کے تربیتی نظام کو بہتر بنانے کے لیے ان پروگراموں کی تیاری کے لیے ریاستوں کو زیادہ سے زیادہ رقم خرچ کرنی ہوگی اور خود اساتذہ کو بہتر تربیت کا مطالبہ کرنا ہوگا۔ نئی عالمی منڈی میں طلبا کو زندگی بھر سیکھنے اور کامیاب شراکت دار بنانے کے لیے تعلیم دینے کے لیا ساتذہ کو اپنی تعلیم کے طریقے اور طلبا کے سیکھنے کے انداز کو بدلنا ہوگا۔ ہمیں یہ یاد رکھنے کی ضرورت ہے کہ اگر ہم طلبہ کو اعلی سطح کی قابلیت اور مسابقت کے حصول میں مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہمارے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے کہ استاد تعلیم کے میدان میں ٹکنالوجی کو ایک مربوط ٹول بنائیں۔ منظم اور تجرباتی طور پر سنبھالتے ہوئے اساتذہ کو ان ٹکنالوجیوں کو استعمال کرنے کے لیے تیار کیا جاسکتا ہے۔

موجودہ دنیا اور معاشرے کی ضروریات پہلے کی بہ نسبت مختلف ہوگئی ہیں، اس لیے طلبہ اور اساتذہ کی تربیت مقامی کی بجائے عالمی سطح پر کرنے کی ضرورت ہے۔ جدید ترین تعلیم کے حصول کے لیے Technology ٹکنالوجی کے موثر استعمال کی ضرورت ہے۔ آج کل کی تعلیم کے طریقہ کار اور معیار میں بہت تبدیلی آگئی ہے۔ جن تکنیکوں سے کبھی ہم آشنا نہیں تھے۔ اب ہماری آنے والی نسل فیضیاب ہو رہی ہے۔ روایتی تدریسی طریقہ کار اب مستعمل نہیں رہا۔ انفارمیشن ٹیکنالوجی کا استعمال لازمی ہو گیا ہے۔ تعلیم اب صرف پڑھنے لکھنے تک محدود نہیں رہ گئی۔ اب اس کا تقاضا بدل رہا ہے۔ اس لیے موجودہ دور میں روایتی تعلیمی طریقہ کار کے مقابلے میں ٹیکنالوجی کی اہمیت بڑھ گئی ہے۔

آج انٹرنیٹ، ویڈیوز، بلاگز اور ویب سائٹس کے علاوہ سکائپ وغیرہ کے ذریعے ہم متعلقہ سائنسدان اور مصنف سے مل سکتے ہیں۔ آج مارکیٹ میں مختلف تعلیمی آیپس موجود ہیں جیسے classroom, Google kahoot, zoom, Demos Voki, وغیرہ وغیرہ۔ ان آیپس کے استعمال سے تدریس کو موثر بنایا جا سکتا اور آن لائن کلاسیس کا انعقاد کیا جا سکتا ہے۔ اور موجودہ صورت حال میں ان آیپس کا استعمال بہت ہو رہا ہے۔ لہٰذا اکیسویں صدی کے فعال و متحرک طلبا کے لیے ٹکنالوجی میں ماہر اساتذہ کی اشد ضرورت ہے۔

حوالہ جات:

1. ڈی ایس گورڈن، اصول تعلیم اور عمل تعلیم، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی۔
2. محمد اختر صدیقی، تدریس- آموزشی حکمت عملیاں، مکتبہ جامعہ نئی دہلی
3. ایم یسین اطہر، اکیسویں صدی میں معلم کا کردار، نوائے وقت۔
4. آئی سی ٹی پر مبنی تدریس و اکتساب

■

Rubeena
Asst. Professor, Dept. of Education and Training
Maulana Azad National Urdu University
Hyderabad - (Telangana)
Email.: syedarubeena1@gmail.com

شکیل

موجودہ امتحانی نظام مسائل اور امکانات

اسکول کا دور ہر بچے کی زندگی کا اہم ترین مرحلہ ہوتا ہے۔ یہی وہ وقت ہوتا ہے جب بچہ ذہنی اور عملی لحاظ سے اپنی صلاحیتوں میں اضافہ کر سکتا ہے۔ پہلے وہ ہر فکر سے آزاد رہتا تھا۔لیکن اب وہ کئی کئی گھنٹے سیکھنے اور یاد کرنے کی تعلیمی سرگرمیوں میں صرف کرنے لگتا ہے۔اس کے اوپر والدین، استاد، ہم عمر ساتھی اور خود اپنی طرف سے ایک با مقصد اور عملی انسان بننے کے لیے دباؤ ہوتا ہے۔ یہاں آ کر اسے زندگی کی اہم اقدار، مثلاً نظم وضبط، احساس ذمے داری، امداد باہمی، پیار و محبت، محنت اور حصول علم سے آگاہی ہوتی ہے۔ساتھ ہی اسے ایک دور اہے کا بھی سامنا کرنا پڑتا ہے۔

ملک کے تعلیمی نظام میں امتحانات کے خوف کا آغاز بچپن سے ہی شروع ہو جاتا ہے۔اسکول اور گھر دونوں جگہوں پر طلبا اس طرح کے حالات سے دو چار ہوتے ہیں۔ان کے خوف کی وجوہات امتحان کے مقصد میں پوشیدہ ہیں۔اس مقصد کی تکمیل کے لیے امتحان میں ناکام ہونے کا لفظ خوف کو بڑھاوا دیتا ہے۔ ناکام ہونے کا مطلب اساتذہ، والدین، ہم عمر ساتھی اور سماج کی نظر میں حقیر سمجھا جاتا ہے۔ اس طرح بچے کو امتحانی نظام بچپن سے ہی سنگین نفسیاتی خوف میں جینے کا عادی بنا دیتا ہے۔ چھوٹے چھوٹے نونہال اس عادت سے بیزار ہو کر یہ سمجھ چکے ہوتے ہیں کہ اسکول کا کام صرف ''فیل یا پاس کرنا ہے''۔اس سے طلبا کے اندر ایک طرح کے امتحان کا خوف بنا رہتا تھا اور اس سے طلبا کی شخصیت کے ہر پہلو کی مکمل نشو ونما بھی نہیں ہو پاتی تھی۔ بہت سے طلبا نتائج برآمد ہونے کے بعد خودکشی اور اپنی بیش بہا قیمتی زندگی سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتے تھے۔موجودہ عہد میں ہمارے سماج کا تانا بانا کچھ اس طرح بن دیا گیا ہے کہ اس میں کامیاب آدمی کی جہاں ہر طرف تعریف و تحسین ہوتی ہے وہیں ناکام ہونے یا زندگی کی دوڑ میں پیچھے رہ جانے والے کو حقارت بھری نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔کوئی کامیابی یا ناکامی کا پس منظر جاننے کی کوشش نہیں کرتا جو جیتا وہی سکندر کی کہاوت یہاں پوری طرح صادق آتی ہے۔

کئی مواقع پر جانچ کے ذریعے عدم تحفظ کا تصور، دباؤ فکر، تکلیف، موازنہ کرنا،نفرت، اپنے آپ کو احساس کمتری میں مبتلا کرنا، انسانی رشتوں کو زہر آلود کرنا جیسے تاثرات طلبا میں پیدا ہوتے ہیں۔ جانچ جہاں تدریس واکتساب کو دلچسپ اور نتیجہ خیز بناتی ہے وہیں امتحانی طریقہ کار سے اس میں رکاوٹ پیدا ہو رہی ہے جو باعث فکر ہے۔ یاد کرنے کے بجائے طلبا مواد حاصل کا فہم حاصل کریں۔ نئے مواد کی تشکیل کے لیے تخلیقی انداز فکر کی راہ اختیار کریں۔ طلبا اپنے حاصل کردہ علم کے ذریعے مسائل کو حل کرنے کی سعی کریں۔ایک حادثے کا مختلف پہلوؤں سے جائزہ لے کر اس کے حل کرنے کے لیے نت نئے طریقہ اختیار کرنے کی استعداد ان میں ہونی چاہیے۔لیکن کسی بھی امتحان میں ان صلاحیتوں کی جانچ نہیں ہوتی ہے۔موجودہ طریقہ تعلیم میں امتحان کا مطلب سماج کو خوف میں مبتلا کرنا، شرمندہ کرنا، امتحانی عدم اعتماد، ڈر، تشدد وغیرہ میں تبدیل ہو گیا ہے۔ ہر سال کتنے ہی طلبا محض امتحان میں ناکام ہونے کی بنا پر خودکشی کر رہے ہیں اور ایسی ہی خبریں اخبار میں آئے دن شائع ہوتی رہتی ہیں۔ امتحانات جن مقاصد کے تحت منعقد کیے جا رہے ہیں ان کا بنیادی مقصد حاصل نہیں ہو رہا ہے۔

تعلیم کے بنیادی سروکار ہیں کہ بچوں کو اتنا اہل بنایا جائے کہ وہ زندگی کے معنی سمجھ سکیں، اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لاسکیں، زندگی کا مقصد متعین کر سکیں اور اسے حاصل کرنے کی سعی و جستجو کریں کیونکہ "قومی نصابی خاکہ 2005 نے واضح انداز میں بتا دیا ہے کہ" جانچ کا اہم مقصد تعلیمی مقاصد کا حصول ہے نہ کہ اچھے نشانات اور رینکس حاصل کرنا ہے''۔

سال 2003 میں یشپال کمیٹی نے فرسودہ نظام تعلیم اور نظام جانچ کے طریقوں پر شدید مذمت کرتے ہوئے ''Learning Without Burden'' بنا بوجھ کے تعلیم کی اہمیت کے بارے میں حکومت ہند کو رپورٹ پیش کی۔اس کی بنیاد پر قومی درسیاتی خاکہ 2005 کو روبہ عمل لایا گیا۔ بچے خوشگوار انداز میں بامعنی طریقے پر سیکھنے کے لیے امتحانی طریقوں میں اصلاحات کے لیے NCF-2005

نے وضاحت کی۔ اس کی عمل آوری کے لیے قانون بنا کر تمام بچے معیاری تعلیم حاصل کرنے کے لیے اپنے بچپن کو اسکولی تعلیم کے ذریعے بامعنی انداز میں خوشگوار طور پر گزارنے کے لیے بچوں کے حقوق کے تحفظ کے لیے قانون حق تعلیم (RTE Act, 2009) نافذ ہوا۔

قانون حق برائے مفت و لازمی تعلیم 2009 کے مطابق جانچ:

حق تعلیم کے ساتھ ساتھ تعلیم کے معیار پر بھی RTE نے توجہ مرکوز کی ہے۔ ایلمنٹری تعلیم میں معیار کے حصول کے لیے ضروری قوانین کا قانون حق تعلیم کے پانچویں باب میں تذکرہ کیا گیا ہے۔

تعلیمی منصوبہ اور جانچ کو روبہ عمل لانے کے لیے درجہ ذیل امور کو مدنظر رکھنے کی ہدایت دی ہے۔

* دستور ہند میں بتائے گئے اقدار کے مطابق اسباق ہونے چاہیے۔
* بچوں کی ہمہ جہت ترقی ہونی چاہیے۔
* بچوں کی مجموعی حد تک جسمانی اور ذہنی نشوونما ہونی چاہیے۔
* بچوں میں علم اور مہارتوں کا فروغ ہونا چاہیے۔
* بچوں کے جذبات کو ٹھیس نہ پہنچاتے ہوئے انھیں کسی قسم کے دباو میں مبتلا نہ کرتے ہوئے آزادانہ طور پر اپنے خیالات کا اظہار کرنے میں ان کی ہمت افزائی کی جائے۔ کمرہ جماعت کا ماحول خوف سے مبرا، آزادانہ اور مشفقانہ ہو۔
* تدریسی لائحہ عمل میں بچوں کو مرکز مانتے ہوئے، خود سے سیکھنے کے موزوں طریقے یعنی انکشاف، مشاہدہ، تحقیق اور حقائق دریافت کرنے پر مبنی ہو۔

قومی درسیاتی خاکہ کے رہنما اصول:

* باہر کی زندگی کو کمرہ جماعت سے مربوط کرتے ہوئے معلومات بہم پہنچانا۔ یعنی سیکھی ہوئی معلومات کا روزمرہ زندگی میں اطلاق کرنا۔
* رٹنے رٹانے کے عمل کو خیرباد کہتے ہوئے بامعنی انداز میں اکتساب مہیا کرنا۔
* نصاب کو درسی کتاب تک محدود نہ کرتے ہوئے تشکیل علم Construction of Knowledge فراہم کرنا۔
* جانچ کے طریقہ کار کو سہل بنانا اور نظام امتحانات میں تبدیلی لانا۔
* امتحانات کو آسان بناتے ہوئے کمرہ جماعت کی زندگی کو اس سے مربوط کرنا۔

ملک کے جمہوری اقدار کو مدنظر رکھتے ہوئے بچوں کی خواہشات اور دلچسپیوں کو فروغ دینا۔

ہندوستان میں ہر سال ہزاروں لوگ خودکشی کرتے ہیں جس کی مختلف وجوہات ہوتی ہیں۔ 1998 سے تو یہ اعداد و شمار لاکھ کے اوپر پہنچ گئے ہیں۔ NCRB جو مرکزی وزارت داخلہ کے تحت کام کرتا ہے کے اعداد و شمار پر نظر ڈالیں تو یہ کافی چونکانے والے ہیں خاص طور سے طالب علموں اور نوجوانوں کے معاملے میں اس کی رپورٹ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ پڑھائی کو لے کر طالب علموں پر کتنا دباو ہوتا ہے۔ رپورٹ کے مطابق ہندوستان میں ہر پانچ منٹ پر ایک آدمی خودکشی کرتا ہے۔ خودکشی کرنے والے 3 لوگوں میں سے ایک 19-15 سال کا ہوتا ہے۔ ظاہر ہے اس ایج گروپ میں طالب علموں کی تعداد ہی زیادہ ہوتی ہے اور اس ایج گروپ کا تناسب خودکشی کرنے والوں میں 33 سے 36 فیصد ہے مزید برآں خودکشی کرنے والے 74 فیصد لوگ پڑھے لکھے ہوتے ہیں۔

ملک کی تعلیمی پالیسی کی تاریخ پر روشنی ڈالی جائے تو پتہ چلتا ہے کہ روز اول سے معیاری تعلیم، تحقیق اور تعلیم کے میدان میں اختراع پر خاص توجہ مرکوز کرتے ہوئے اس عزم کا اظہار بھی کیا گیا ہے کہ ملک کو نالج سپر پاور بنانا ہے تاکہ افرادی قوت کی قلت کا خاتمہ ہو۔ بھارت کا ہر شہری بلا تفریق مذہب و ملت یہ حق رکھتا ہے کہ اسے دولت مند طبقے کے مساوی، تعلیم کے مواقع مہیا ہوں۔ اس ملک کی کثیر آبادی دیہی علاقوں میں رہتی ہے۔ حکومت کے عدل و انصاف کا تقاضا ہے کہ گاؤں کے بچے بھی کم سے کم سنزل اسکول سے معیاری تعلیم حاصل کرسکیں۔ ملک کی مختلف ریاستوں میں طرح طرح کے سرکاری تعلیمی ادارے موجود ہیں۔ ان اداروں کے بیشتر اساتذہ کا ٹیچنگ معیار ناگفتہ بہ ہے۔ ان ہی اساتذہ کے

کسی بھی تعلیمی ادارے کا استاد صرف ٹیچر ہی نہیں ہوتا بلکہ تربیت بھی اس کی ذمے داری ہوتی ہے۔ تعلیم کو تربیت سے جدا نہیں کیا جاسکتا، دونوں لازم وملزوم ہیں۔ لہٰذا اساتذہ کو پابند کیا جائے کہ تعلیم کے ساتھ ساتھ تربیت بھی ان کا فریضہ ہے۔ ملک میں یونیورسٹی کی سطح پر تحقیق کا معیار انتہائی پست ہے۔ بھارت کو نالج سپرپاور بنانے کے لیے ملک میں صد فیصد تعلیمی انقلاب پر توجہ مرکوز کرتے ہوئے تعلیم میں تفوق کو ترجیح دی جائے۔

سبب Dropouts کے واقعات سب سے زیادہ ہوتے ہیں کیونکہ ان طلبا کی تخلیقی صلاحیت کی شناخت کرنے کی لیاقت نہیں ہوتی حکومت کی اولین ذمے داری عائد ہوتی ہے کہ وہ ملک میں رہنے والے تمام علاقوں کے بچوں اور نوجوانوں کے لیے معیاری تعلیم کو یقینی بنائے تاکہ نالج سپر پاور ہونے کا خواب شرمندہ تعبیر ہو سکے۔ مختلف ریاستوں کے تعلیمی نظام کو بہتر بنانے کے لیے حکومت کی طرف سے کسی مصالحت سے کام نہ لیا جائے۔ تعلیمی پالیسی میں ایسے نکات کو جگہ نہ دی جائے جن سے علاقائی ولسانی منافرت کا خدشہ ہو۔ امیر، غریب ہر شہری کو یکساں حقوق حاصل ہیں۔ صرف معاشی طور پر پسماندہ طبقوں کو مالی امداد مہیا کی جائے تاکہ بچے معاشی پسماندگی کے سبب تعلیم سے بے بہرہ نہ رہ جائیں۔ نئی تعلیمی پالیسی میں مادری زبان کو خصوصی اہمیت دی جائے۔ محض یوم مادری زبان کا اعلان کرنے سے ہم اپنی ذمے داری سے عہدہ برآ نہیں ہوسکتے۔ ملک ہی نہیں بلکہ دنیا کی ہر زبان قابل صد احترام ہے۔ ملک میں مادری زبان کو اولیت دیتے ہوئے دیگر زبانوں کے سیکھنے اور پڑھنے کی ترغیب دی جائے اور کسی بھی زبان کی اہمیت کو کم نہ کیا جائے۔ البتہ موجودہ بین الاقوامی رابطے کی زبان انگریزی پر اسکول میں درجہ اول سے توجہ مرکوز کی جائے اور ملک کے تمام اسکولوں میں درجہ اول سے ہی طلبا کو مادری زبان کے ساتھ انگریزی زبان میں مکالمے کی ترغیب دی جائے۔

کسی بھی تعلیمی ادارے کا استاد صرف ٹیچر ہی نہیں ہوتا بلکہ تربیت بھی اس کی ذمے داری ہوتی ہے۔ تعلیم کو تربیت سے جدا نہیں کیا جاسکتا، دونوں لازم وملزوم ہیں۔ لہٰذا اساتذہ کو پابند کیا جائے کہ تعلیم کے ساتھ ساتھ تربیت بھی ان کا فریضہ ہے۔ ملک میں یونیورسٹی کی سطح پر تحقیق کا معیار انتہائی پست ہے۔ بھارت کو نالج سپر پاور بنانے کے لیے ملک میں صد فیصد تعلیمی انقلاب پر توجہ مرکوز کرتے ہوئے تعلیم میں تفوق کو ترجیح دی جائے۔ یعنی صد فیصد ایسے نوجوان پیدا ہوں جن میں ہمہ جہت صلاحیت کے ساتھ ان کا علمی و تعلیمی معیار بین الاقوامی سطح پر ایکسیلنس کے درجے پر ہو۔ ہمیں توقع ہے کہ تفوق کے ساتھ صد فیصد تعلیمی انقلاب کا ہدف مقرر کیا جائے تو ہمارا ملک نالج سپر پاور کی طرف گامزن ہوسکتا ہے۔

■

Dr. Shakil
Assistant Professor
Shri Govind (PG), Bilari, Moradabad
Shakil.ahmed015@gmail.com
Mobile: 9849043565

محمد عرفان ملک

پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ میں اردو تحقیق

پنجاب اور اُردو کا گہرا رشتہ شروع سے ہی رہا ہے۔ پنجاب کے مشترکہ کلچر نے ہندوستان کو پنجابی زبان کے ساتھ ساتھ اُردو زبان سے بھی مالا مال کیا۔ جس کے متعلق اکثر ماہرین لسانیات کا کہنا ہے کہ اُردو کی اصل جائے پیدائش پنجاب ہی ہے۔ خطہ پنجاب شروع سے ہی اُردو کی تعلیم و تدریس کا گہوارہ رہا ہے۔ پنجاب کے اُردو تعلیمی مراکز اور درسگاہیں فروغ اُردو میں نمایاں کردار ادا کرتے رہے ہیں۔ پنجاب نے اُردو کا دامن ہمیشہ مختلف رنگوں کے پھولوں سے بھرا ہے اور یہ سلسلہ آج بھی جاری وساری ہے۔

تقسیم وطن کے بعد پنجاب کے لگ بھگ سبھی اسکولوں، کالجوں اور دفتروں سے یہ زبان غائب ہوچکی تھی لیکن پنجاب کے لوگوں کی اردو سے دلچسپی اور دوستی کی اس سے بڑی مثال اور کیا ہوسکتی ہے کہ انھوں نے اپنی مادری زبان پنجابی کے ساتھ ساتھ اردو کو اپنے دلی جذبات کا ترجمان بنایا۔ اس صوبے میں اُردو پڑھنے اور لکھنے والوں کی کمی نہیں ہے۔

پنجاب کی قدیم ریاستوں میں سے پٹیالہ ایک ایسی ریاست ہے جو اپنی جداگانہ شناخت رکھتی ہے۔ پٹیالہ پنجاب کا ایک اہم شہر ہے جس کی عظمتوں کے کئی حوالے ملتے ہیں۔ علم وادب کے لحاظ سے یہاں کی درسگاہیں تشنگان علوم کو برسوں سے سیراب کررہی ہیں۔ پنجابی یونیورسٹی کا شمار بھی یہاں کے اہم تعلیمی، تدریسی اداروں میں ہوتا ہے۔

پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ کا قیام 1961 کے ایکٹ نمبر 35 کے تحت 30 اپریل 1962 کو شمالی ہندوستان میں عمل میں آیا۔ NAAC کی جانب سے Five Star کی حصولیابی فخر کی بات ہے۔ پنجابی یونیورسٹی جو پٹیالہ اور راجپورہ روڈ پر واقع ہے۔ 316 / ایکڑ میں پھیلا ہوا وسیع وعریض کیمپس اپنی مثال آپ ہے۔ ڈاکٹر محمد جمیل ادب تحقیق میں لکھتے ہیں:

’’پنجابی یونیورسٹی اعلیٰ تعلیم کا واحد ادارہ ہے جو ہبریو یونیورسٹی (اسرائیل) کے بعد زبان کے نام پر قائم کی گئی دوسری یونیورسٹی ہے۔ جس کے پس پردہ پنجابی زبان و ادب وتہذیب کو فروغ دینا شامل ہے۔‘‘ (جمیل محمد ڈاکٹر، ادب تحقیق، نئی دہلی، 2013، ص 15)

پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ میں فیکلٹی آف آرٹس کے تحت زبان وادب کے نام پر قائم کیے گئے دیگر شعبہ جات کی طرح شعبۂ فارسی، اردو اور عربی بھی ہے۔ فارسی زبان وادب کا پنجابی سے گہرا تعلق ہونے کی بنا پر 1967 میں یہ شعبہ وجود میں آیا۔ جو درس وتدریس کے ساتھ ساتھ تحقیقی خدمات کے لیے ایک الگ شناخت رکھتا ہے۔ اس شعبے کی ایک انفرادیت یہ بھی ہے کہ اس کے دو حصے ہیں، بنیادی حصہ یونیورسٹی کیمپس پٹیالہ میں ہے اور دوسرا حصہ نواب شیر محمد خاں، مالیرکوٹلہ میں ہے لیکن ریسرچ کرانے سے متعلق فیصلے دونوں شعبے مل کر ہی لیتے ہیں۔ پنجابی یونیورسٹی کے کچھ کالجوں میں شعبۂ اردو قائم ہے اور کالجوں کے کچھ اساتذہ ریسرچ گائیڈ کے فرائض بھی انجام دے رہے ہیں۔

پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ نے فروغ اُردو کے لیے جو خدمات انجام دی ہیں وہ قابل ستائش ہیں۔ شعبۂ فارسی، اُردو اور عربی پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ میں پی ایچ ڈی (اردو ،فارسی)، ایم اے (اُردو، فارسی)، اُردو، فارسی اور عربی میں ایک سالہ سرٹیفکیٹ کورس، ڈپلوما اور پوسٹ گریجویٹ سطح کی تعلیم کے کورسز دستیاب ہیں۔ اُردو والوں کو یہ جان کر خوشی ہوگی کہ پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ ایسی پہلی یونیورسٹی ہے کہ جس میں شعبہ اُردو فارسی اساتذہ کے تعاون سے پنجابی ڈپارٹمنٹ کے بی۔ اے آنرز ان پنجابی اور ایم اے آنرز ان پنجابی طلباء کو بھی اُردو، فارسی زبان سکھانے کے لیے باقاعدہ ریگولر کلاسیز لگائی جارہی ہیں۔

> پنجاب کی قدیم ریاستوں میں سے پٹیالہ ایک ایسی ریاست ہے جو اپنی جداگانہ شناخت رکھتی ہے۔پٹیالہ پنجاب کا ایک اہم شہر ہے جس کی عظمتوں کے کئی حوالے ملتے ہیں۔ علم و ادب کے لحاظ سے یہاں کی درسگاہیں تشنگان علوم کو برسوں سے سیراب کررہی ہیں۔پنجابی یونیورسٹی کا شمار بھی یہاں کے اہم تعلیمی، تدریسی اداروں میں ہوتا ہے۔

ڈاکٹر ناشر نقوی ادب تحقیق میں ایک جگہ لکھتے ہیں کہ:

''ہر سال یونیورسٹی میں داخلہ لینے والے اُردو فارسی طلبا زیادہ تر وہ ہوتے ہیں جن کی مادری زبان پنجابی ہوتی ہے۔ایسی صورتِ حال میں ہماری کوشش رہتی ہے کہ اُردو، فارسی اور پنجابی کے مابین لسانی رشتہ بھی استوار کیا جاتا رہے۔''

(ناشر نقوی ڈاکٹر، ادب تحقیق، نئی دہلی، 2013،ص9)

تحقیق حق اور سچ کی تلاش کا نام ہے۔تحقیق میں نگراں کا اہم رول ہوتا ہے۔تحقیق میں پہلا کام موضوع کا انتخاب ہوتا ہے جس میں ریسرچ اسکالر اپنے نگراں کار کی مدد سے ایسے موضوع کا انتخاب کرتا ہے جس میں مواد کی فراہمی میں کوئی دشواری پیش نہ آسکے۔تحقیق کے کچھ اپنے اصول وضوابط ہوتے ہیں اور ان اصولوں کی پابندی کرتے ہوئے مقالہ قلم بند کیا جاتا ہے۔

شعبۂ اردو، فارسی میں جو ریسرچ ورک ہو رہا ہے یا ابھی تک کیا گیا ہے اُس میں بھی خیال رکھا جاتا ہے کہ تحقیق کے لیے ایسے موضوعات کا انتخاب کیا جائے جس سے علاقائی ادب کی تاریخ سامنے آسکے۔شعبے میں تحقیقی کام کے ذریعے اُردو اور پنجاب کے رشتہ کو برقرار رکھنے کے لیے زیادہ تر تحقیقی کام پنجاب کے حوالے سے ہی کروایا جارہا ہے۔

پنجابی یونیورسٹی میں علاقائی ادب کے ساتھ شخصیات پر بھی کئی مقالات تحریر ہو چکے ہیں۔عام طور پر شخصیات پر لکھے گئے مقالوں کو قدر کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا۔لیکن یہ ضروری نہیں کہ شخصیات پر تحریر کردہ تمام مقالے اسی زمرے میں آئیں۔ریسرچ اسکالر میں محنت ولگن کا جذبہ کارفرما ہو تو شخصیات پر تحریر کیے گئے مقالات میں بھی اعلیٰ درجہ کے تحقیقی حقائق منکشف ہو سکتے ہیں۔

پنجابی یونیورسٹی میں طلبا کی تعداد میں دن بدن اضافہ ہو رہا ہے۔اب شعبۂ فارسی، اُردو میں پیش کردہ مقالات کی تعداد (53) ہے جن میں (7،ایم فل) اور (46 مقالہ جات پی ایچ۔ڈی) کے لیے تحریر کیے جا چکے ہیں اور مزید (15) مقالوں پر تحقیقی کام چل رہا ہے۔ان کے علاوہ ابھی (2) طلبا کورس ورک میں انرولڈ ہیں۔'اکیسویں صدی میں اُردو فروغ اور امکان' میں ڈاکٹر ناشر نقوی لکھتے ہیں:

''پنجاب میں اسکولی سطح سے یونیورسٹی سطح تک طلباء کی تعداد میں دن بدن اضافے ہو رہے ہیں۔اس اضافے کو اس مثال سے واضح کیا جاسکتا ہے کہ 1968 سے 2000 تک پنجابی یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو سے صرف آٹھ لوگوں نے پی ایچ۔ڈی کی ڈگری حاصل کی جب کہ 2001 سے 2013 کے دوران گیارہ اسکالرز کو پی ایچ ڈی کی ڈگری مل چکی ہے۔اور بیس ریسرچ اسکالرز پی ایچ ڈی میں رجسٹرڈ ہیں۔اس طرح اکیسویں صدی کے ابتدائی تیرہ برسوں میں اکتیس پی ایچ ڈی ایک ہی یونیورسٹی سے ہونا اُردو کے بہترین مستقبل اور وسائل کی طرف اشارہ کرتا ہے۔''

(ناشر نقوی ڈاکٹر، اکیسویں صدی میں اُردو فروغ اور امکان، نئی دہلی، 2014، ص77)

اس کاروانِ تحقیق میں پہلا پی ایچ۔ڈی مقالہ پیش کرنے کا سہرا شیخ زینت اللہ جاوید کے سرجاتا ہے جنھوں نے پروفیسر گلونت سنگھ کی نگرانی میں 'تلوک چند محروم: شخصیت اور شاعری' موضوع پر 1979 میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔جس میں موصوف نے تلوک چند محروم کی زندگی کا عہد، ماحول، حالاتِ زندگی کو پیش کرتے ہوئے شخصیت اور کردار پر دلائل سے روشنی ڈالی ہے۔تاکہ محروم کی شخصیت کا نقشہ قارئین کے سامنے آجائے۔آخر میں تلوک کی نظموں، غزلوں اور رباعیوں پر مدلل بحث کی ہے۔تازہ ترین مقالہ محمد عرفان نے بعنوان 'مشرقی پنجاب میں اُردو زبان وادب کی تعلیم کا اجمالی جائزہ' ڈاکٹر محمد جمیل کی نگرانی میں قلم بند کیا۔جن موضوعات پر ایم فل اور پی ایچ ڈی کی ڈگری ایوارڈ ہو چکی ہے، ان کے نام اور تحقیقی کام کے موضوعات کی فہرست درج ذیل ہے:

ایم فل

شمار	مقالہ نگار	ایم۔فل کا موضوع	نگراں	ڈگری
1	نذیر حسن	غنی کشمیری بحیثیت غزل گو (ایک تنقیدی مطالعہ)	سید ذاکر حسین نقوی	1977
2	طارق کفایت اللہ	گرامی جالندھری شخصیت اور فن	ڈاکٹر شیخ زینت اللہ	1984
3	عبدالرشید	سجاد ظہیر کی ناول نگاری، لندن کی ایک رات	سید ذاکر حسین نقوی	1986
4	رحمت اللہ خان	جوش ملسیانی حیات وخدمات	سید ذاکر حسین نقوی	1987
5	خالد کفایت اللہ	غزلیات نظیر لدھیانوی کا تنقیدی جائزہ	ڈاکٹر شیخ زینت اللہ	1991
6	ایوب خان	آزادی کے بعد پنجاب کے اُردو افسانہ نگار	ڈاکٹر شیخ زینت اللہ	1992
7	محمد لیاقت	منٹو کے شاہکار افسانے: تحقیق وتجزیہ	ڈاکٹر شیخ زینت اللہ	1993

پی ایچ ڈی:

شمار	مقالہ نگار	موضوع	نگراں	ڈگری
1	شیخ زینت اللہ جاوید	تلوک چند محروم: شخصیت اور شاعری	پروفیسر گلونت سنگھ	1979
2	سید ذاکر حسین نقوی	انسانی شخصیت کا تصور مثنوی رومی کی روشنی میں	پروفیسر گلونت سنگھ	1981
3	ڈاکٹر شیخ زینت اللہ	غزلیات کی بنا پر نظیری کے تخلیقی شعور کا تجزیہ	پروفیسر گلونت سنگھ	1983
4	عراق رضا زیدی	مثنویات فانی کشمیری کا تنقیدی جائزہ	ڈاکٹر شیخ زینت اللہ	1990
5	محمد رفیع	شعرائے مالیر کوٹلہ کی ادبی دین	ڈاکٹر شیخ زینت اللہ	1990
6	محمد جمیل	عبدالحلیم شرر کی غیر تاریخی ناول نگاری	امرونت سنگھ	1990
7	اودھ نرائن پاٹھک	سدرشن: شخصیت اور فن افسانہ	ڈاکٹر شیخ زینت اللہ	1990
8	انوار احمد انصاری	پنجاب میں طنز ومزاح کا نثری ادب	ڈاکٹر شیخ زینت اللہ	1992
9	طارق کفایت اللہ	پنجاب کے برگزیدہ فارسی غزل گو	ڈاکٹر شیخ زینت اللہ	1993
10	محمد ایوب خان	ناصر علی سرہندی، شخصیت اور فن غزل گوئی	شیخ زینت اللہ	1997
11	رحمان اختر	اردو اور پنجابی ناول میں پنجاب کی ثقافتی اور ادبی نمائندگی	ڈاکٹر ناشر نقوی	2000
12	روبینہ شبنم	پروین شاکر کا شعری کارنامہ	ڈاکٹر شیخ زینت اللہ	2002
13	شہباز چاندنی	دبستانِ داغ اور پنجاب کے شعرا: ایک تجزیاتی مطالعہ	ڈاکٹر ناشر نقوی	2006
14	ندیم احمد	پنجاب میں اُردو تنقید نگاری کا ارتقا	ڈاکٹر ناشر نقوی	2007
15	محمد سلیم زبیری	پنجاب میں اُردو غزل کے پچاس سال (1951 سے 2000 تک)	ڈاکٹر شیخ زینت اللہ	2008
16	نازنین	گوپال متل کی ادبی خدمات: تنقیدی اور تجزیاتی مطالعہ	ڈاکٹر محمد جمیل	2009
17	شبنم حیات	سردار انجم شخصیت اور شاعری، تفہیم وتجزیہ	ڈاکٹر ناشر نقوی	2010
18	محمد انور	بشریٰ اعجاز شخصیت اور ادبی خدمات کا تنقیدی مطالعہ	ڈاکٹر طارق کفایت اللہ	2010
19	محمد شفیق تصدق	اُردو کی ادبی تحریکات اور پنجاب، تفہیم وتجزیہ	ڈاکٹر ناشر نقوی	2013
20	انعام الرحمن	پنجاب میں اُردو ڈرامہ کی روایت: ایک تجزیاتی مطالعہ	ڈاکٹر ناشر نقوی	2013
21	پرویز احمد پالہ	ادبیات فارسی میں وادی کشمیر کے غیر مسلم قلمکاروں کا حصہ	ڈاکٹر محمد جمیل	2013
22	محمد اسلم	مشرقی پنجاب میں اُردو کی ادبی صحافت: ایک تجزیاتی مطالعہ	ڈاکٹر محمد جمیل	2014
23	محمد اشرف	پنجاب میں صوفیانہ اُردو شاعری کا فکری نظام (تحقیقی وتنقیدی مطالعہ)	ڈاکٹر ناشر نقوی	2014

24	عابدہ رفعت	پنجاب میں اُردو مرثیہ: تفہیم وتجزیہ	ڈاکٹر ناشر نقوی	2015
25	محمد جمیل	کنور مہندر سنگھ بیدی سحر: شخصیت اور ادبی خدمات	ڈاکٹر محمد اقبال/ ڈاکٹر روبینہ شبنم	2015
26	کہکشاں فلک	پنجاب کی خواتین افسانہ نگار: تفہیم وتجزیہ	ڈاکٹر محمد جمیل	2016
27	للتی	ہندوستانی پنجاب کے اعزاز یافتہ شعراء: حیات وخدمات	ڈاکٹر محمد جمیل	2016
28	محمد سلیمان حجام	جموں کشمیر میں اُردو ناول کا تجزیاتی مطالعہ	ڈاکٹر محمد جمیل	2017
29	نسیم اختر	آزادی کے بعد اُردو کی پنجابی شاعرات	ڈاکٹر روبینہ شبنم	2017
30	مہر النساء زیدی	فیض احمد فیض: ایک صدی پر محیط شاعر (افہام وتفہیم)	ڈاکٹر روبینہ شبنم	2017
31	نازیہ کوثر	پنجاب میں اُردو خود نوشت نگاری: تاریخی وفنی مطالعہ	ڈاکٹر رحمان اختر	2018
32	مہناز کوثر	اُردو میں مطبوعہ مکتوب نگاری فن اور روایت: ادبی اور تاریخی مطالعہ	ڈاکٹر رحمان اختر	2018
33	عمرانہ خاتون	اُردو رباعی اور انسانی اقدار: تنقید وتجزیہ	ڈاکٹر روبینہ شبنم	2018
34	جتندر پال	اُردو کی جدید شعری اصناف کا تنقیدی مطالعہ	ڈاکٹر ناشر نقوی	2018
35	عابد علی خان	اُردو نثر نگاری میں مالیر کوٹلہ کی خدمات	ڈاکٹر روبینہ شبنم	2018
36	مدثر رشید	جموں وکشمیر میں اُردو افسانہ نگاری کا تنقیدی جائزہ	ڈاکٹر محمد جمیل	2018
37	شوکت احمد ملک	آزادی کے بعد اُردو نثر میں طنز ومزاح	ڈاکٹر روبینہ شبنم	2018
38	روبی سلطان	اُردو میں کربلائی نثر کے اہم شہ پاروں کا تنقیدی مطالعہ	ڈاکٹر محمد جمیل	2018
39	محمد امین نجار	اُردو میں سکھ نثر نگاروں کی ادبی خدمات: ایک مطالعہ	ڈاکٹر محمد جمیل	2018
40	تبسم بانو	اُردو میں پنجابی سے در آمد ناولوں کا تنقیدی جائزہ	ڈاکٹر محمد جمیل	2018
41	وحید احمد ڈار	مشرقی پنجاب میں اُردو سفرنامہ نگاری: تاریخی وتنقیدی مطالعہ	ڈاکٹر رحمان اختر	2019
42	غلام رسول بھٹ	مشرقی پنجاب میں اُردو نظم ۱۹۴۷ کے بعد: افہام وتفہیم	ڈاکٹر رحمان اختر	2019
43	سید حسن عباس	بابا گورونانک سے اُردو شعراء کی عقیدت: تسلیم وتفہیم	ڈاکٹر ناشر نقوی	2019
44	محمد شمس الحسن خاں	احمد رضا خان کی صوفیانہ نثری تصنیفات کا تنقیدی جائزہ	ڈاکٹر رحمان اختر	2019
45	امتیاز احمد الائی	جموں وکشمیر میں اُردو کی ادبی صحافت کا جائزہ	ڈاکٹر روبینہ شبنم	2019
46	محمد عرفان	مشرقی پنجاب میں اُردو زبان وادب کی تعلیم کا اجمالی جائزہ	ڈاکٹر محمد جمیل	2019

مندرجہ بالا محققین کی طویل فہرست سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ شعبۂ فارسی، اُردو اور عربی کی جانب سے کروایا گیا تحقیقی کام ہر لحاظ سے معیاری ہے۔ شعبہ میں تحقیق کا سفر اپنے پورے کروفر کے ساتھ جاری ہے۔ پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ کے شعبۂ اُردو، فارسی سے اُردو زبان وادب میں (15) ریسرچ اسکالرز پی ایچ ڈی میں رجسٹرڈ ہیں۔ جن نئے موضوعات پر تحقیق کا کام جاری ہے، ان کے نام اور تحقیقی کام کے موضوعات کی فہرست مندرجہ ذیل ہے:

پی ایچ۔ڈی رجسٹرڈ

نمبر	مقالہ نگار	موضوع	نگراں
1	منظور احمد ملاح	اُردو کے مطبوعہ انٹرویوز کا ادبی مطالعہ	ڈاکٹر محمد جمیل
2	محمد سالک جمیل	مشرقی پنجاب میں ادب اطفال کی روایت: تحقیقی وتنقیدی جائزہ	ڈاکٹر محمد جمیل
3	محمد حنیف	1980 کے بعد مشرقی پنجاب کے اہم افسانہ نگار: ایک تنقیدی جائزہ	ڈاکٹر محمد جمیل
4	اقبال احمد	مشرقی پنجاب میں اُردو کی ادبی تحقیق: ایک مطالعہ	ڈاکٹر محمد جمیل
5	محمد فاروق قادری	1980 کے بعد ہندوستان کے مشاہیر افسانچہ نگار: تفہیم وتجزیہ	ڈاکٹر محمد جمیل
6	محمد الطاف ملک	کرپال سنگھ بیدار کی شاعری کا اہم معاصرین کے ساتھ تقابلی مطالعہ	ڈاکٹر محمد جمیل
7	ثمیرہ خانم	ہریانہ کے اہم شعرا کی شعری خدمات کا تنقیدی جائزہ	ڈاکٹر رحمان اختر
8	برکت علی	اُردو نظم میں منظر نگاری: تحقیقی اور تنقیدی جائزہ	ڈاکٹر ناشر نقوی
9	طارق احمد	جدید اُردو نثر کے معمار کتب کا تجزیاتی مطالعہ (بحوالہ آب حیات، مقدمہ شعر وشاعری، موازنہ انیس ودبیر)	ڈاکٹر روبینہ شبنم
10	جگ موہن سنگھ	وحشی سعید: حیات اور تخلیقات کا معاصرین کے ساتھ تقابلی جائزہ	ڈاکٹر روبینہ شبنم
11	شاہد جاوید میر	اُردو میں سیرت نگاری کا مطالعہ ادب کے آئینے میں	ڈاکٹر روبینہ شبنم
12	شمیم اختر	صادق نواب سحر اور دیپک بدکی کی فکشن نگاری کا تقابلی مطالعہ	ڈاکٹر روبینہ شبنم
13	گلاب سنگھ	تقسیم ہند کے حوالے سے اُردو کے نمائندہ فکشن نگاروں کا تقابلی مطالعہ	ڈاکٹر روبینہ شبنم
14	عابد ابراہیم پارا	پنجاب میں اہم فارسی رباعی گو شعراء: ایک تجزیاتی مطالعہ	ڈاکٹر زین العباء
15	رخسانہ	درعہدِ مغول اخلاقی عنصر در ادبیات فارسی: در ہند وایران	ڈاکٹر زین العباء

پی ایچ ڈی انرولڈ:

شمار	مقالہ نگار	انرولڈ	نگراں
1	محمد عرفان گنائی	انرولڈ	ڈاکٹر رحمان اختر
2	زرینہ	انرولڈ	ڈاکٹر رحمان اختر

'پنجابی یونیورسٹی میں اُردو تحقیق' مقالہ سے یونیورسٹی میں اُردو تحقیق کی موجودہ صورتِ حال کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ یونیورسٹی میں طلبا کی تعداد میں دن بدن اضافہ ہورہا ہے۔ اُردو کی صورتِ حال میں روز افزوں بہتری آرہی ہے۔ شعبۂ فارسی، اُردو اور عربی اس بات کا ثبوت دیتا ہے کہ یونیورسٹی میں ذہین وفطین افراد کی کمی نہیں ہے۔

المختصر ان حقائق کی روشنی میں اتنا ضرور کہا جاسکتا ہے کہ پنجابی یونیورسٹی میں اُردو کی دن بہ دن ترقی ہورہی ہے اور اُردو کا مستقبل روشن ہے۔ خدا کرے روشنی کی یہ کرنیں یوں ہی پھیلتی رہیں اور اُردو زبان کی کشش پنجابیوں کے دلوں میں ہمیشہ زندہ رہے۔ وثوق کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ پنجابی یونیورسٹی، پٹیالہ اُردو زبان وادب کے فروغ کے لیے ہر ممکن کوشش کرنے کے لیے تیار ہے۔

پنجابی یونیورسٹی میں اُردو کی دن بہ دن ترقی ہورہی ہے اور اُردو کا مستقبل روشن ہے۔خدا کرے روشنی کی یہ کرنیں یوں ہی پھیلتی رہیں اور اُردو زبان کی کشش پنجابیوں کے دلوں میں ہمیشہ زندہ رہے۔ وثوق کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ پنجابی یونیورسٹی، پٹیالہ اُردو زبان و ادب کے فروغ کے لیے ہر ممکن کوشش کرنے کے لیے تیار ہے۔

■

Dr. Mohd Irfan Malik
Asst. Prof, Dean Faculty of Arts & Languages
Kurukshetra University
Kurukshetar -136119 (Haryana)

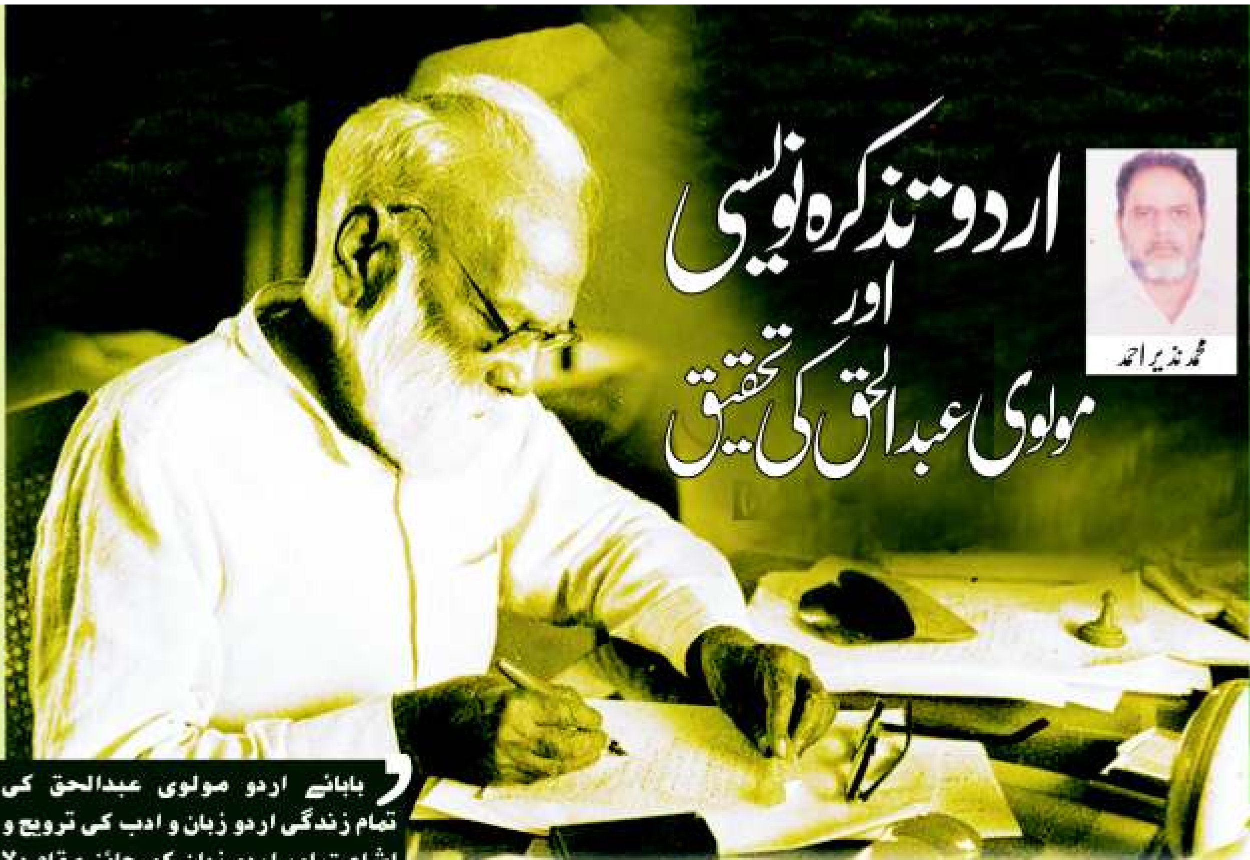

اردو تذکرہ نویسی اور مولوی عبدالحق کی تحقیق

محمد نذیر احمد

> بابائے اردو مولوی عبدالحق کی تمام زندگی اردو زبان و ادب کی ترویج و اشاعت اور اردو زبان کو جائز مقام دلا نے کی جدو جہد میں گزر گئی۔ انہوں نے اپنے تحقیقی کارناموں سے ان شاعروں اور ادیبوں کے ناموں کا افشا کیا جو تاریخ کے گرد آلود اوراق میں اپنی گم نامی کا ماتم منا رہے تھے۔

تحقیق انسانی ارتقا کا ایک اہم جزو ہے۔ اسی لیے انسان اپنی کھوج، تلاش اور جستجو سمندر کی اتھاہ گہرائیوں سے لے کر کائنات کے ذرے ذرے میں پنہاں قدرت کے پوشیدہ رازوں پر سے پردہ ہٹاتا ہے، فطرت سے ہم کلام ہوتا ہے، تاریخ کے گرد آلود اوراق سے حقائق دریافت کر کے ایک نئی تاریخ رقم کرتا ہے، اتی اور سرے کی جوڑ لگاتا ہے گویا کائنات کو مسخر کرنے کی طاقت رکھتا ہے۔

تحقیق حکم خداوندی بھی ہے اللہ رب العزت نے حق کی تلاش و بازیافت، کھوج اور جستجو پر زور دیا ہے۔ قرآن مجید میں جگہ جگہ تحقیق کا ذکر ملتا ہے۔ اللہ رب العزت 'سورۃ الحجرات' کی آیت نمبر 6 میں فرماتا ہے:

"اے ایمان والو اگر کوئی فاسق آدمی تمھارے پاس کوئی خبر لائے تو اس کی تحقیق کیا کرو۔ ایسا نہ ہو کہ کہیں نادانی سے کسی قوم کو ضرر پہنچادو اور پھر اپنے کیے پر پشیماں ہو جاؤ"

قرآن کریم میں اور بھی بہت سے مقامات پر تحقیق کے متعلق اشارے موجود ہیں۔ علم حدیث کے لیے بھی جو اصول وضوابط مقرر کیے گئے ہیں اس میں بھی تحقیق کے اصول وضوابط کو خاص اہمیت دی گئی اور داخلی شہادتوں پر زور دیا گیا ہے۔ یہاں تک کہ راوی کی شخصیت اور کردار ہی کے پیش نظر تحقیق کا معیار مقرر ہوا۔ تحقیق ہی کی بازیافت کے لیے 'علم الرجال' کی داغ بیل پڑی۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمان محققین نے علم حدیث کے دائرے سے ہٹ کر حیرت انگیز تحقیقی کارنامے انجام دیے، جن میں علم وادب، تاریخ، سفرنامے وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

اردو ادب میں تحقیقی روایت کا پتہ تذکروں کے ذریعے چلتا ہے۔ اردو کے ابتدائی دستیاب تذکروں میں گردیزی کا تذکرہ 'ریختہ گویاں' قائم کا 'مخزن نکات' اور میر کا 'نکات الشعرا' قابل ذکر ہیں۔ یہ تذکرے 1165ھ تا 1208 کے درمیان لکھے گئے جن میں میر کے تذکرے کو اولیت حاصل ہے۔ اردو ادب میں تحقیق کے جدید رجحان کے علمبردار سرسید احمد خاں، مولوی چراغ علی، محسن الملک، مولانا شبلی، مولانا حالی، مولوی ذکاء اللہ، مولانا محمد حسین آزاد اور مولوی عبدالحق ہیں۔

بابائے اردو مولوی عبدالحق کی تمام زندگی اردو زبان و ادب کی ترویج و اشاعت اور اردو زبان کو جائز مقام دلانے کی جدو جہد میں گزر گئی۔ انھوں نے اپنے تحقیقی کارناموں سے ان شاعروں اور ادیبوں کے ناموں کا افشا کیا جو تاریخ کے گرد آلود اوراق میں اپنی گم نامی کا ماتم منارہے تھے۔

مولوی عبدالحق نے نوجوانی ہی میں اپنی علمی و ادبی صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔ سرسید جنھیں جدید اردو نثر کا بانی کہا جاتا ہے انھوں نے اردو تحقیق کی جو داغ بیل ڈالی تھی اس کو خواجہ الطاف حسین حالی، شبلی نعمانی، مولوی چراغ علی، محسن الملک، ذکاء اللہ اور محمد حسین آزاد نے پروان چڑھایا اور بابائے اردو نے ان اساتذہ کی تحقیقی روایات کو نہ صرف آگے بڑھایا بلکہ اسے ایک نئی جہت بھی عطا کی۔ مولوی عبدالحق سے قبل اردو تحقیق مذہب و تاریخ ہی تک محدود تھی لیکن بابائے اردو نے اس حصار کو توڑ کر لسانی اور ادبی تحقیق کی ایک نئی داغ بیل ڈالی۔ جانچ پرکھ کے جدید پیمانے وضع کیے، قیاس آرائیوں کے بجائے حقائق کی چھان بین، مستند داخلی و خارجی شہادتوں پر زور دیا اور اردو تحقیق کو جدید مغربی تحقیق کے ہم پلہ بنادیا۔

مولوی عبدالحق نے شعرائے اردو کے تذکرے مرتب کر کے شائع کیے ان پر مقدمات لکھے تذکرہ نویسوں کے متعلق حقائق کی کھوج، متن اور املا کی غلطیوں کی درستی میں بڑی دیدہ ریزی اور عرق ریزی سے کام لیا۔ ان کی تحقیقی خدمات کا دائرہ اس قدر وسیع ہے کہ ایک مضمون میں پیش کرنا دشوار ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے۔ اسی لیے سرسری ذکر کرتا چلوں۔

بابائے اردو نے جو تذکرے مرتب کیے اور جن پر مقدمات لکھے ان کی ترتیب اشاعت کے اعتبار سے اس طرح ہے:

1. تذکرہ گلشن عشق 1906
2. چمنستان شعرا 1928
3. مخزن نکات 1929
4. تذکرہ ریختہ گویاں 1933
5. مخزن شعرا 1933

6 تذکرہ ہندی 1933
7 عقد ثریا 1934
8 ریاض الفصحا 1934
9 نکات الشعرا 1935
10 گل عجائب 1936

تذکروں کی اہمیت کے متعلق ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں:

"اردو شعرا کے تذکروں کو ادبی تنقید، سوانح اور تاریخ کی اساس خیال کرنا چاہیے۔ ان تذکروں کو نظر انداز کر کے نہ ہم اردو زبان و ادب کی ارتقائی منزلوں کا سراغ لگا سکتے ہیں اور نہ اس کے ماضی، حال اور مستقبل میں کوئی رشتہ قائم کر سکتے ہیں۔ چنانچہ کلاسیکی شاعری اور ادب دونوں کے متعلق ہم آج جو کچھ جانتے ہیں، ان ہی تذکروں کے توسط سے جانتے ہیں اور آئندہ بھی اردو کی ادبی تاریخ یا تحقیق و سوانح نگاری کا کوئی کام ان قدیم ماخذ سے یکسر بے نیاز رہ کر نہیں کیا جا سکتا۔ تذکروں کی یہی وہ اہمیت ہے جو کسی ادیب یا ناقد کو ان کے تفصیلی مطالعہ پر اکساتی ہے اور مجبور بھی کرتی ہے"

(اردو شعرا کے تذکرے اور تذکرہ نویسی، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، نگار پاکستان، تذکروں کا تذکرہ نمبر، کراچی 1964، ص 7)

گلشن ہند: مولوی عبدالحق نے شعرا کے تذکروں کا تحقیقی سفر 'گلشن ہند' سے شروع کیا۔ گلشن ہند کے دیباچے میں بابائے اردو لکھتے ہیں:

"گلشن ہند مشہور شعرا اردو کا ایک تذکرہ جس کو مرزا علی متخلص بہ لطف نے بعہد مارکوئس آف ویزلی گورنر جنرل اردو کے مشہور سرپرست جان گل کرسٹ کی فرمائش پر علی ابراہیم خاں کے فارسی تذکرے 'گلزار ابراہیم' سے مع اضافوں کے اردو زبان میں جو آج سے پانچ سو سال کی سادہ اردو نثر کا ایک عمدہ نمونہ ہے۔ 1801 میں تصنیف کیا اور 1906 میں شمس العلما مولوی شبلی نعمانی کی تصحیح و تحشیہ اور مولوہ عبدالحق صاحب بی اے کے ایک عالمانہ مقدمے کے ساتھ اردو زبان کی خدمت کے لیے عبداللہ خاں نے حیدرآباد دکن سے شائع کیا اور دار الاشاعت پنجاب کی رفاہ عام اسٹیم پریس لاہور میں چھپا"

(گلشن ہند میرزا علی لطف، لاہور، رفاہ عام اسٹیم پریس 1906، سرورق)

مولوی عبدالحق نے گلشن ہند کے مقدمے میں اہم نکات پر روشنی ڈالی ہے۔ اس تذکرے میں مولوی عبدالحق نے مرزا علی لطف کے حالات کلام کی داخلی شہادتوں کی روشنی میں بڑی ہی محنت وجستجو سے رقم کیے ہیں۔ واضح رہے کہ صاحب تذکرہ نے اپنے حالات نہیں لکھے تھے، دیباچے میں بھی ذکر نہ تھا، جب شعرا کا تعارف پیش کیا تو دیگر شعرا کے مقابلے اپنا تعارف بہت ہی کم پیش کیا ہے۔ آگے میر تقی میر، فورٹ ولیم کالج وغیرہ کے متعلق بہت سے انکشافات کیے ہیں۔

چمنستان شعرا: مولوی عبدالحق نے لالہ لچھمن داس شفیق کے تذکرے چمنستان شعرا کو 1928 میں مرتب کیا۔ بابائے اردو نے اس تذکرے میں نہ صرف مقدمہ تحریر کیا بلکہ محنت و مشقت سے ان کے خاندانی پس منظر، حالات زندگی اور ادبی خدمات پر روشنی ڈالی ہے۔ اصل ماخذ کی کتب سے متن کی غلطیاں درست کیں۔ شعرا کے اصل دیوانوں اور بیاضوں سے ڈھونڈ کر مشکوک اشعار کی اصلاح کی، جو حقائق اخذ نہ ہو سکے یا ان کی صحت نہ ہو سکی ان پر قیاس آرائیوں کے بجائے سوالیہ نشان لگا دیا تا کہ آئندہ محقق کے لیے راہ نمائی ہو سکے۔

چمنستان شعرا ریختہ گو شعرا کا تذکرہ ہے جس میں 213 شعرا کا تذکرہ شامل ہے۔ اس تذکرے میں شعرا کا کلام اردو میں ہے جب کہ حال احوال تعارف وغیرہ فارسی میں ہیں۔ یہ تذکرہ سراج الدین آرزو سے شروع ہوتا ہے۔

سید معراج نیر کی تصنیف 'بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق فن اور شخصیت' کے مطابق مولوی صاحب نے 'چمنستان شعرا' میں حسب ذیل شعرا کا اضافہ کیا ہے۔ میر عبدالوہاب افتخار، محمد رضا قزلباش خاں، مرزا علی نقی ایجاد، میر یوسف خاں بسمل، آقا امین، میر عبدالحیی وقار، نواب ذوالفقار الدولہ بہادر جنگ، نورالدین علی رنگین اور مولوی محمد باقر شہید۔ جن شعرا کے کلام اور حالات میں اضافہ کیا ہے وہ ہیں میر سراج الدین سراج، سید عبدالولی عزلت، عارف الدین خاں عاجز، نور محمد عاصی، فیض الدین نقش بندی، فضلی اور شیخ احمد فدا۔

مخزن نکات: مولوی عبدالحق نے 1929 میں محمد قیام الدین قائم چاندپوری کا تذکرہ 'مخزن نکات' انجمن ترقی اردو کے تعاون سے شائع کیا۔ اس تذکرے میں کل 119 شعرا کے حالات رقم کیے گئے ہیں، جن میں قابل ذکر نام حضرت امیر خسرو، حضرت شیخ سعدی، سلطان عبداللہ قطب شاہ، شاہ مبارک آبرو، سراج الدین علی خاں آرزو، خواجہ میر درد، میر تقی میر وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ اس تذکرے کو قائم نے طبقہ اول، دوم اور سوم میں منقسم کیا ہے۔ طبقۂ اول حضرت سعدی شیرازی سے شروع ہو کر میر جعفر پر ختم ہوتا ہے۔ طبقۂ دوم شاہ مبارک سے شروع ہو کر کمتران پر ختم ہوتا ہے اور طبقۂ سوم میر شمس الدین فقیر سے شروع ہو کر مصنف کے ذکر پر ختم ہوتا ہے۔

مذکورہ تذکرے میں کثیر تعداد میں شمال و جنوب کے شعرا ایک دوسرے سے متعارف ہوتے ہیں۔ بابائے اردو نے اپنے مقدمے کے ساتھ قائم کے تذکرے کو جامع شکل میں شائع کر کے اولیت حاصل کی ہے۔ بابائے اردو کے بعد کچھ اساتذہ نے بھی اس تذکرے کو مرتب کیا ہے۔

تذکرہ ریختہ گویاں: بابائے اردو نے اپنے تحقیقی مقدمے کے ساتھ مرتب کر کے 1933 میں اورنگ آباد سے شائع کیا۔ اس تذکرے کو فتح علی حسینی گردیزی نے 1156ھ میں لکھنا شروع کیا تو 1166ھ میں مکمل کیا۔ اپنے تذکرے میں گردیزی نے حروف تہجی کے اعتبار سے شعرا کے نام ترتیب دیے ہیں اور 99 شعرا کے مختصر حالات و کلام کا تذکرہ کیا ہے، ان میں 72 سے زائد ایسے شعرا ہیں جن کا ذکر میر تقی میر کے تذکرے نکات الشعرا میں بھی ملتا ہے۔

مولوی صاحب نے اس تذکرے کے مقدمے میں گردیزی کے حالات زندگی

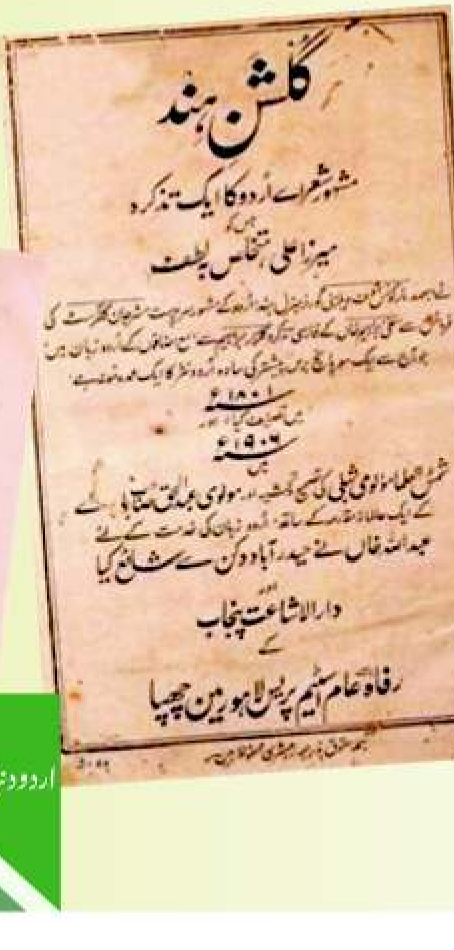

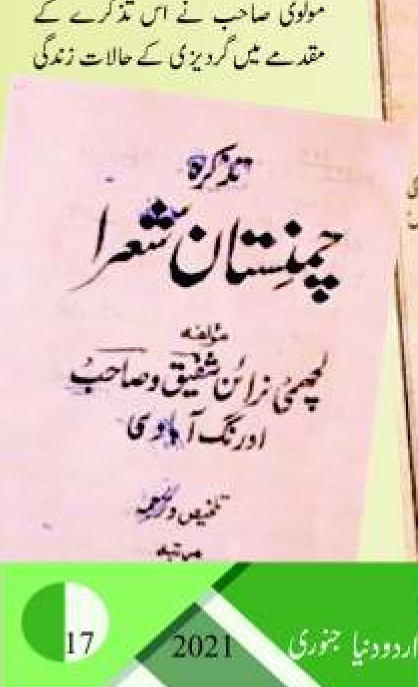

اور خاندانی پس منظر پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔مقدمہ میں لکھتے ہیں کہ گردیزی نے اپنا تذکرہ ایسے زمانے میں لکھا جب کہ ریختہ گو شعرا کے چند ہی تذکرے لکھے گئے تھے نیز میر کے تذکرے نکات الشعرا سے گردیزی کے اس تذکرے کا موازنہ کرتے ہوئے گردیزی کے تذکرے کی خصوصیات کا بھی اعتراف کیا ہے۔مثلاً گردیزی کے تذکرے سے ہمیں بعض ایسے شاعروں کے احوال سے آگاہی ہوتی ہے جن کا ذکر میر کے تذکرے میں نہیں ملتا۔

مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ بابائے اردو نے اس تذکرے کو تین مختلف نسخوں کی مدد سے مرتب کیا ہے اور متن کے حواشی، مختلف نسخوں کے اختلاف متن اور املا کی غلطیوں کی نشاندہی بڑی ہی دیدہ ریزی سے کی ہے۔

اس تذکرے میں گردیزی نے اپنے عہد کے تذکروں سے بےزاری کا اظہار کرتے ہوئے ان کی تصنیف وتالیف، علت نمائی، معاصرین سے ستم ظریفی اور اپنے ہم عصروں کی خوردہ گیری جیسے الزامات عائد کیے لیکن مولوی عبدالحق نے اپنے مقدمے میں یہ ثابت کیا کہ گردیزی کی پہنچ اپنے عہد کے تذکروں تک نہیں تھی اور نہ ہی کہیں ان تذکروں کے حوالے ملتے ہیں، گویا گردیزی نے اس عہد کے اہم تذکرے میر کے 'نکات الشعرا' کو راست ہدف تنقید بنایا ہے جب کہ اسی تذکرے سے اس نے استفادہ بھی کیا ہے۔

مخزن الشعرا: مخزن الشعرا قاضی نور الدین حسین خاں فائق کا شعرائے گجرات پر مبنی تذکرہ ہے جس میں انھوں نے 111 گجراتی اردو شعرا کا ذکر کیا ہے۔اس تذکرے کو مولوی عبدالحق نے 1933 میں اورنگ آباد سے شائع کیا۔ یہ تذکرہ اس لحاظ سے بھی اہمیت رکھتا ہے کہ اس کے آخر میں 14/جولائی 1896 میں لکھا گیا غالب کا ایک مکتوب شامل ہے۔مولوی صاحب نے اس تذکرے کو دو نسخوں کی مدد سے مرتب کیا ہے، ایک نسخہ جو خود فائق کے پوتے نے انھیں دیا تھا اور دوسرا ممبئی یونی ورسٹی کے کتب خانے کی ملکیت تھا۔ مذکورہ تذکرے کو بابائے اردو نے تین حصوں میں منقسم کیا ہے۔ پہلے حصے میں گجرات کا تاریخی پس منظر اور اس خطے سے مسلمانوں کے تعلق پر تحقیقی مواد پیش کیا ہے۔ دوسرے حصے میں مسلمان فاتحین کی لشکر کشی کے نتیجے میں معاشرتی ولسانی اثرات کا ذکر کرتے ہوئے ان صوفیائے کرام اور شعرا کا ذکر کیا ہے جو 'گجراتی اردو' میں لسانی خدمات انجام دے رہے تھے۔ تیسرے حصے میں صاحب تذکرہ کے احوال کو بڑی ہی کھوج اور جستجو کے بعد یکجا کرکے پیش کیا ہے۔

سید معراج نیر اپنی کتاب 'بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق فن اور شخصیت' میں لکھتے ہیں کہ مولوی صاحب نے گجرات میں زبان کی اجمالی کیفیت کا ذکر کرتے ہوئے حضرت قطب عالم (متوفی 850ھ) حضرت شاہ عالم (متوفی 922ھ) شاہ علی جیوگام (متوفی 972ھ) میاں بخش حسینی (متوفی 1023ھ) اور سید شاہ غلام ہاشمی (متوفی 1059ھ) کا ذکر کیا ہے اور ثابت کیا کہ یہ حضرات اپنی زبان کو عربی و عجمی، گجراتی کہتے تھے جس کے معنی قدیم گجراتی اردو کے ہیں۔ بابائے اردو کی تحقیق اور مخزن الشعرا کے متن سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ سب سے پہلے اردو کی نشوونما گجرات میں شروع ہوئی چنانچہ اس وقت گجرات بھی اردو کا ایک اہم مرکز تھا۔

مولوی عبدالحق نے مصحفی کے تین تذکرے مرتب کرکے شائع کیے۔

عقد ثریا: اس تذکرے کو مولوی عبدالحق نے نسخہ خدابخش خاں اور نسخہ رام پور کی مدد سے مرتب کرکے 1933 میں شائع کیا۔ یہ تذکرہ فارسی گو شعرا کا ہے، جس میں شعرا کو تین حصوں میں منقسم کیا گیا ہے۔ اول شعرائے ایران جو کبھی ہندوستان نہیں آئے، دوسرے وہ شعرائے ایران جو ہندوستان آئے اور تیسرے فارسی گو ہندوستانی شعرا۔

تذکرہ ہندی: مصحفی نے اس تذکرے کو 1209ھ میں لکھا، جس میں 188 شاعروں کے علاوہ 5 شاعرات کا بھی ذکر کیا ہے۔ اس طرح شعرا کی تعداد 193 ہے۔ مولوی عبدالحق نے تذکرہ ہندی کی تدوین ایشیا ٹک سوسائٹی بنگال کے نسخے کی مدد سے کی ہے اور اس کا موازنہ کتب خانہ خدابخش پٹنہ اور کتب خانہ ندوہ کے نسخوں سے کیا ہے اور اختلاف کی نشاندہی بھی کردی ہے۔

ریاض الفصحا: اس تذکرے کو مصحفی نے 1221ھ میں لکھا اور اس میں 323 شاعروں کا ذکر شامل ہے۔ بابائے اردو نے اس تذکرے کو خدابخش لائبریری پٹنہ کے قلمی نسخے کی بنیاد پر مرتب کیا ہے۔ مصحفی نے اس تذکرے میں بالخصوص ان شعرا کا ذکر کیا ہے جو اس سے پہلے کے تذکروں میں رہ گئے تھے اور کچھ ایسے شاعر بھی ہیں جو پہلے تذکروں میں بھی شامل رہے گویا ریاض الفصحا مذکورہ بالا تذکروں کا تکملہ کہا جاسکتا ہے۔

نکات الشعرا: مولوی عبدالحق نے اس تذکرے کو 1935 میں سید عبدالحیی کے قلمی نسخے کی مدد سے مرتب کیا۔ محققین نے اس تذکرے کا سنہ تالیف 1165ھ لکھا ہے اور یہ اردو کا پہلا تذکرہ تسلیم کیا جاچکا ہے۔ میر سمیت اس تذکرے میں 101 شاعروں کا ذکر ملتا ہے جن میں اکثریت دہلوی شعرا کی ہے جب کہ دکن کے چند ہی شاعر شامل کیے گئے ہیں۔

مولوی صاحب نے اپنے مقدمے میں نہ صرف اس تذکرے کی علمی وادبی اہمیت منوائی ہے بلکہ بہت سے تاریخی، تحقیقی وتنقیدی گوشوں کو بھی اجاگر کیا ہے۔ جس سے حقائق کی نشاندہی ہوتی ہے۔

گل عجائب: مولوی عبدالحق نے 1939 میں اسد اللہ خاں تمنا کے تذکرے کو مرتب کرکے انجمن ترقی اردو اورنگ آباد سے شائع کیا ہے۔ بابائے اردو نے اس تذکرے کو بڑی ہی عرق ریزی سے خراب وخستہ حالت میں کتب خانہ آصفیہ میں موجود قلمی نسخے کی مدد سے مرتب کیا ہے۔ مولوی صاحب اس تذکرے کے مقدمے میں لکھتے ہیں کہ اس کی ترتیب میں ہمیں بہت دقت اٹھانی پڑی کیوں کہ کاتب نے کئی غلطیاں کی تھیں۔ اکثر املا کی بھی غلطیاں تھیں۔ اشعار غلط نویسی کے سبب وزن اور بحر سے خارج ہو چکے تھے۔ چنانچہ انھوں نے دوسرے تذکروں اور دیوانوں کے سیاق وسباق کی مدد سے درست کیا ہے۔

مذکورہ تذکرے میں 51 شاعروں کا ذکر ملتا ہے، جن میں اکثریت تمنا کے ہم وطن ہیں۔ ان شعرا کا تفصیلی ذکر پیش کیا گیا ہے اور بعض شعرا کا سرسری ذکر ملتا ہے۔ گل عجائب کی تدوین اور مقدمہ بابائے اردو کا تذکرہ نویسی پر آخری کام تھا۔

■

Mohd Nazeer Ahmed
Head, Dept. of Urdu
Usmania University College for Women
Kothi, Hyderabad - 500095 (Telangana)

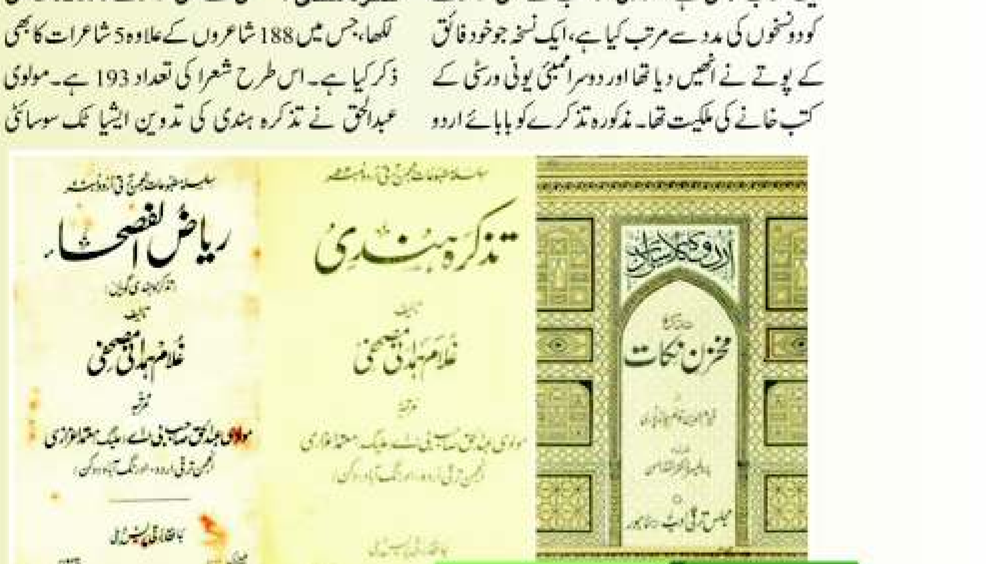

حسرت جے پوری کی غزل گوئی

نذیر فتح پوری

حسرت جے پوری کا نام زبان پر آتے ہی ہندوستانی فلموں کے خوبصورت گیت کانوں میں گونجنے لگ جاتے ہیں۔ فلمی دنیا کے پرانے گیتوں پر جب بھی گفتگو ہوتی ہے حسرت جے پوری کا نام ہر حال میں لیا جاتا ہے۔ آج بھی جب کہیں حسرت کے گیتوں کے ریکارڈ بجتے ہیں تو راہ چلتے لوگ بھی کچھ لمحوں کے لیے رک کر اپنی سماعتوں کو ان گیتوں سے نہال کرتے ہیں مثلاً

بہارو! پھول برساؤ، مرا محبوب آیا ہے
تیری پیاری پیاری صورت کو کسی کی نظر نہ لگے
یہ میرا پریم پتر پڑھ کر کہ تم ناراض نہ ہونا

حسرت کے گیتوں میں تغزل کی آمیزش کو ہمیشہ اوّلیت دی جاتی تھی۔ ان کے گیت سن کر جوان دلوں کی دھڑکنیں بڑھ جایا کرتی تھیں۔ جدائی کے غم سے زیادہ ان کے گیتوں میں وصال کی لذت اور حسن و جمال کا تذکرہ ہوتا تھا۔ وہ جوان جذبوں کی نمائندگی کرنے والے گیت کار تھے۔ ان کے گیتوں کی شمولیت سے فلمی کہانی کو بڑا سہارا ملتا تھا۔ وہ ایسے گیت لکھتے تھے جو فلمی کہانی کے منظرنامے کا حصہ بن کر فلم کو کامیابی سے ہمکنار کرنے میں معاونت کرتے تھے۔

اپنے گیتوں میں امنگوں، ترنگوں، حوصلوں اور لاابالی جذبات کی عکاسی کرنے والے حسرت جے پوری نے سب سے پہلا جو گیت لکھا تھا۔ وہ بہت ہی حزن و ملال کا عکاس تھا۔ بدحال زندگی کی درد بھری کیفیت کی نمائندگی کرنے والا یہ گیت راج کپور کی فلم برسات کے لیے لکھا گیا تھا۔ جسے اپنے وقت کے مشہور درد بھرے گیتوں کے لیے پہچانے جانے والے گلوکار محمد رفیع نے گایا تھا۔ گیت کا مکھڑا تھا

میں زندگی میں ہر دم روتا ہی رہا ہوں
روتا ہی رہا ہوں میں تڑپتا ہی رہا ہوں

یہ گیت راج کپور کو اس قدر پسند آیا کہ اپنی فلم برسات کے آٹھ گیت انھوں نے حسرت سے لکھوائے۔ اس طرح حسرت کا پہلا قدم ہی 'فلم نگری' میں کامیاب ثابت ہوا۔ اور اس کے بعد حسرت نے کبھی پلٹ کر نہیں دیکھا۔

ہم اپنے مضمون میں حسرت جے پوری کی غیر فلمی غزل گوئی پر اظہار خیال کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن اس سے پہلے حسرت کا مختصر تعارف ضروری ہے۔

حسرت جے پوری کی پیدائش راجستھان کے گلابی شہر جے پور میں 15/اپریل 1922 کو ہوئی۔ خود حسرت بتاتے ہیں "میرا نام اقبال حسین اور تخلص حسرت ہے۔ جے پور راجستھان کی پیدائش ہے اس لیے جے پوری لکھتا ہوں۔ 15/اپریل 1922 کو میں نے اس دنیائے فانی میں آنکھیں کھولیں۔ مسلم اسکول جے پور میں اردو، فارسی اور انگریزی کی تعلیم حاصل کی۔

(شعری مجموعہ: آبشار غزل، صفحہ نمبر 9)

حسرت جے پوری کو پہلی شعری رفاقت اپنے نانا جان فدا حسین فدا سے میسر آئی۔ نانا کی وجہ سے گھر آنگن میں شعر و ادب کے چراغ روشن تھے۔ جن کی روشنی سے حسرت کے معصوم ذہن اور تتلیوں کے پیچھے دوڑنے والے بچپن کو اجالا ملا۔ حسرت خود اعتراف کرتے ہیں۔

"ہوش سنبھالا تو مرحوم نانا جان فدا حسین فدا کی شعر و شاعری کے ماحول میں پروان چڑھنے لگا۔ وہ جے پور کے مانے ہوئے شعرا میں سے تھے اور بے حد خوددار، ان کی محفل شعر و سخن میں صرف چنندہ، منتخب احباب اور شعرا کے لیے جگہ تھی۔" (شعری مجموعہ: آبشار غزل، ص9)

حسرت کے نانا روایتی غزل کے کامیاب شاعر تھے۔ انھوں نے حسرت کو نصیحت فرمائی تھی کہ میر، مومن اور داغ کے نقش قدم پر چل کر ہی وہ کامیاب غزل کہہ سکتے ہیں۔ اس لیے حسرت نے عام فہم الفاظ میں اظہار خیال کو اپنایا اور مشکل الفاظ سے بچ کر اس بات کی کوشش کی کہ آسان سے آسان زبان میں اپنی بات عوام تک پہنچائی جائے۔ حسرت نے 18 سال کی عمر میں جو پہلا شعر کہا تھا، وہ مندرجہ ذیل تھا۔

حسرت ہمارے دم سے ہے یہ سرخی شفق
یہ چرخ خون روئے گا گر ہم نہیں رہے

اس کے بعد جو پہلی غزل حسرت جے پوری کی غزلیہ کائنات کا سنگِ بنیاد ثابت ہوئی وہ ملاحظہ کریں۔

کس ادا سے وہ جان لیتے ہیں
مرنے والے بھی مان لیتے ہیں

فلموں میں قدم رکھنے سے پہلے حسرت جے پوری مشاعروں میں شرکت کرتے تھے۔ لکھنؤ کے ایک مشاعرے میں مولانا حسرت موہانی نے حسرت جے پوری کا کلام سن کر دعاؤں سے نوازتے ہوئے کہا تھا۔

"انشاءاللہ تم بہت مشہور ہوگے
محنت کیے جاؤ، منزل خود بہ خود تمھارے سامنے ہوگی"

(آبشار غزل ص13)

بے شمار راجستھانی باشندوں کی طرح 1940 میں حسرت جے پوری نے بھی مہاراشٹر کے تجارتی شہر ممبئی کے لیے رختِ سفر باندھ لیا۔ ملاحظہ ہو، ایک تحریر۔

ظلمت شب میں بھٹکتے ہوئے راہی کے لیے
عزم محکم ہو تو راہیں بھی نکل آتی ہیں
اپنی منزل پہ وہ انسان پہنچ جاتا ہے
بجلیاں خود اسے قندیل سی دکھلاتی ہیں

(حسرت جے پوری)

اور اسی عزم محکم کے کرشمے کا اثر تھا کہ ان کی جدوجہد رنگ لاتی رہی۔ ان کے نغمے گونجتے رہے۔ سننے والوں، دوستوں اور چاہنے والوں کا حلقہ بڑھتا رہا۔ وہ گزر بسر کے لیے ادھر اُدھر ملازمت بھی کرتے رہے اور بزمِ سخن بھی سجاتے رہے اور کنڈکٹر کی حیثیت سے ملازمت کرتے ہوئے انھوں نے حسن اور زندگی کے بے شمار رنگ دیکھے، دلکش، دلنواز، پُرکیف اور روکھے پھیکے بھی۔

(آبشار غزل، ص12)

ممبئی کے قیام کے دوران حسرت جے پوری نے مشاعروں میں بھی حصہ لیا۔ ایک ایسے ہی مشاعرے میں

فلم اداکار پرتھوی راج کپور مہمان تھے۔ حسرت جے پوری نے اس مشاعرے میں اپنی نظم 'مزدور کی لاش' سنائی تو سامعین بے حد متاثر ہوئے۔ پرتھوی راج کو بھی حسرت کی نظم نے بہت متاثر کیا۔ یہی وجہ تھی کہ پرتھوی راج نے حسرت کو اپنے بڑے بیٹے راج کپور سے ملوایا، وہ ان دنوں اپنی فلم برسات کی تیاری کر رہے تھے۔ راج کپور نے فلم برسات کے گیتوں کی چابی حسرت جے پوری کو تھما دی اور اس طرح فلمی دنیا کے دروازے ان کے لیے کھلتے چلے گئے جس کے نتیجے میں خوبصورت گیتوں کے جواہر پاروں سے فلمی دنیا کے در و بام سجتے چلے گئے۔

فلمی گیتوں کی تجارتی منڈی سے وابستگی کے باجود حسرت جے پوری کی غزل گوئی کا مزاج قائم رہا اور وہ فرصت کے اوقات میں اپنے نانا جان کی ہدایت کے مطابق غزل کہتے رہے۔ ان کے یہاں وہی تغزل ملتا ہے جس کی روایت، میر، مومن اور داغ نے قائم کی تھی۔

حسرت جے پوری کی غزلوں کا مجموعہ 'آبشارِ غزل' کے عنوان سے نومبر 1989 میں شائع ہوا۔ جس میں 128 غزلیں شامل ہیں۔ ایک ہی صفحہ پر اردو اور ناگری لپی میں غزلیں شامل ہیں۔ پیش لفظ فیاض رفعت کے زور قلم کا نتیجہ ہے۔ حسرت کی غزل پر گفتگو کرتے ہوئے فیاض رفعت اپنی رائے کا برملا اظہار کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''حسرت کی لفظیات پرانی ہے۔ مگر انھوں نے ان پرانے لفظوں کو نیا رنگ و روپ دیا ہے۔ نئی طرح سے برتا ہے ....خوشبو، آنسو، جادو، چاند، پتھر، شبنم، آنچل، پائل، دھنک، نیند، تنہائی، سناٹے، مفلسی، مجبوری، درد والم، بے کسی، فراق، تاثر، بیلا، گلاب، چمپا، چمیلی، جیسے الفاظ استعاروں کی صورت میں غیر شعوری طور پر حسرت کی شاعری میں جگہ پاتے گئے۔ ان لفظوں میں حسرت کی شاعری کی دنیا آباد ہے۔'' (ایضاً،ص 7)

حسرت جے پوری کی غزل کے اجالے اسی کائنات سے پھوٹے ہیں جو کائنات میر، مومن، داغ اور جگر نے آباد کی تھی۔ وہی رنگ، وہی آہنگ، وہی نغمگی، وہی کلاسکیت، وہی جام و سرور کی باتیں، وہی نگاہ و ناز کے اشارے کنائے، وہی پردہ، وہی چلمن، وہی چلمن کی اوٹ سے جھلملاتے حسن کے جلوے، وہی دل تھام کر بیٹھے ناکام عاشق کی آہوں اور کراہوں کا سوز و گداز، جو غزل کو غزل بناتے ہیں، دیارِ یار میں غزل کا وقار بلند کرتے ہیں۔ زندگی کی رونق بڑھاتے ہیں۔ دل کی تہوں میں سوئے ہوئے درد کو دھیرے دھیرے بیدار کرتے ہیں، اسی کیفیت کی حامل غزل کی تصویر وہ غزل ہی کے فریم میں یوں پیش کرتے ہیں۔

ہے سہانا غزل کا سفر/ختم ہوگا نہ یہ عمر بھر
میر و غالب بھی شیدائی تھے/ اسی حسینہ پہ دونوں بشر
چلتی آئی ہے صدیوں سے یا لکھتے آئے ہیں داغ وظفر
ابتدا کر گئے ہیں ولی/ انتہا کر گئے ہیں جگر
ہر زباں پر ہے چھائی ہوئی/ دشمنوں کی لگے نہ نظر
اس کے حسرت بھی شیدائی ہیں/ بات اتنی سی ہے مختصر

حسرت خود ایسی ہی روایتی غزل کے شیدائی ہونے کا اعتراف کرتے ہیں۔ پھر کیوں انھیں جدید اور مابعد جدید غزل کے حوالے سے تلاش کیا جائے۔ سیدھے سادے دل کی کیفیت وہ سیدھے سادے الفاظ کے حوالے سے اس طرح بیان کرتے ہیں کہ بات دل میں اتر جاتی ہے۔ مثلاً۔ ایک غزل کے یہ اشعار۔

زندگی گزرتی ہے آپ کے خیالوں میں
کھوئے کھوئے رہتے ہیں حسن کے اجالوں میں
ایک ہیں وہ لاکھوں میں ان کی بات کیا کہیے
پھول کھلتے رہتے ہیں ان کے سرخ بالوں میں
کل پسینہ پونچھا تھا اس نے اپنے چہرے سے
آج بھی تو خوشبو ہے ریشمی رومالوں میں

غزل کا یہی رنگ 'آبشارِ غزل' کی اکثر غزلوں میں جھلکتا دکھائی دیتا ہے۔ مثلاً یہ غزل۔

رات فرقت کی ہے تاروں کے دیے جلتے ہیں
مری پلکوں پہ تو اشکوں کے دیے جلتے ہیں
حسن تو خوش ہے بہت گھر میں چراغاں کر کے
میرے سینے میں تو زخموں کے دیے جلتے ہیں
حسن سے تیرے ہر اک ذرہ بنا ہے سورج
ہر جگہ پر ترے جلوؤں کے دیے جلتے ہیں

حسرت غزل کے حوالے سے جب سوال اٹھاتے ہیں تو اس کا جواز بھی رکھتے ہیں۔ ایک غزل میں وہ کہتے ہیں۔

جب پیار نہیں ہے تو بھلا کیوں نہیں دیتے
خط کس لیے رکھے ہیں جلا کیوں نہیں دیتے
کیوں تم نے لکھا اپنی ہتھیلی پہ مرا نام
میں حرف غلط ہوں تو مٹا کیوں نہیں دیتے
کس واسطے تڑپاتے ہو معصوم مسیحا
ہاتھوں سے مجھے زہر پلا کیوں نہیں دیتے
حسرت کی محبت پہ اگر شک ہے تمھیں تو
حسرت کو نگاہوں سے گرا کیوں نہیں دیتے

حسرت کی غزل رنگا رنگ بھی ہے اور طرح دار بھی۔ یہ ٹوٹے دل کی ترجمان بھی ہے اور ضبط دل کا اظہار بھی۔ حسرت کی غزل فلسفہ طرازی سے دور ہے۔ گہرے اور بسیط تفہیمی پردوں میں یہ چھپ کر رہنا پسند نہیں کرتی۔ جو دل پر گزرتی ہے حسرت اسے بڑی سہلتا اور سجلتا کے ساتھ اپنے اشعار میں ڈھال دیتے ہیں۔ اس سلسلے میں ان کے چند اشعار ملاحظہ کریں۔

مجھ سے خود ہے چمن کی زیبائی
میں گلوں کا کوئی سفیر نہیں

مری ہر خوشی میں حسرت مرا درد جلوہ گر ہے
کوئی حسن بھی ہے شامل مری شاعری کے پیچھے

شب فراق کی بے چینیاں ارے توبہ
یہ اجلا چاند بھی میری ہنسی اڑاتا ہے

ایسی دردمندانہ اور سسکیوں بھری کیفیت کے علاوہ حسرت کی غزل نے اپنے عصری اسلوب سے آنکھیں ملانے کی جسارت بھی کی ہے۔ اگرچہ یہ جسارت کم کم ہی نظر آتی ہے لیکن اس سے اس بات کا پتا چلتا ہے کہ حسرت اگر سنجیدگی سے نئے افکار اور جدید اسلوب نگارش کے ہم سفر بن جاتے تو ان کی غزلوں کا رنگ کچھ اور ہی ہوتا۔ یہ چند اشعار میں اپنی بات کے جواز میں پیش کرتا ہوں۔

سورج ہے بادلوں میں تو کجلا رہی ہے دھوپ
آنگن میں کیسے آئے گی شرما رہی ہے دھوپ
دیکھا جو ایک شعلہ بدن سب نے یہ کہا
حسرت تمہاری سمت ہی اب آ رہی ہے دھوپ

وہ بے کسی ہے یہاں کون گھر پہ آتا ہے
ہوا کا جھونکا ہے دروازہ کھٹکھٹاتا ہے
کبھی وہ دور تھا ہر روز کوئی آتا تھا
اب ایسا دور ہے سناٹا کھائے جاتا ہے

پڑھتا ہے زمانہ تیرے ماتھے کی لکیریں
اے جانِ جہاں تو تو کتابوں کی طرح ہے

وہ دور سے دریا ہے مگر پاس سے دھوکا
اک شخص زمانے میں سرابوں کی طرح ہے

یہ سچ ہے کہ اب تک غزل کی تنقید میں حسرت جے پوری کا حوالہ نہیں آیا ہے اور آئندہ بھی اس کا امکان نظر نہیں آتا۔ تنقیدی شعور رکھنے والے کسی مبصر نے بھی کبھی حسرت کی غزل پر ایک اچٹتی سی نظر ڈالنے کی زحمت نہیں کی۔ ممکن ہے اہل نظر حضرات کی نظر سے 'آبشارِ غزل' اب تک پوشیدہ رہی ہو۔

■

Nazir Fatehpuri
sr.no 230/B/102, 'Saira Manzil'
Sanjay Park, Viman Darshan,
Lohgaon Road.
PUNE - 411032.
Mobile: 9822516338
Email : nazir_fatehpuri2000@yahoo.com

عبدالحفیظ

دورِ اول کی اردو شاعری میں حب الوطنی

ادب اپنے دور کے سیاسی، سماجی اور اقتصادی حالات کا آئینہ ہوتا ہے، شاعری جو کہ ادب کا جزو لاینفک ہے اور کسی بھی بڑے انقلاب کو لانے میں معاون و مددگار ہوتی ہے۔ تاریخ میں ایسی بے شمار مثالیں ملتی ہیں کہ شعرا نے اپنی جادو بیانی سے اپنی قوم کا کھویا ہوا مقام واپس دلوایا اور دلوں پر فتح حاصل کی۔ الطاف حسین حالی نے مقدمہ میں شعر کی سماجی اہمیت اور مقصدیت پر زور دیتے ہوئے یونانی ریاست کا واقعہ بیان کیا ہے جسے ایک پڑوسی ریاست کے ہاتھوں شکست کھانی پڑی تھی اور یہاں کے باشندوں کے حوصلے پست ہوگئے تھے۔ انھوں نے جنگ نہ کرنے کا عہد کرلیا تھا لیکن سولن نے اپنی شاعری سے اپنے ہم وطنوں میں شجاعت کا جذبہ بیدار کیا اور ایک دن اُن کی شکست فتح میں تبدیل ہوگئی۔ حالی نے اس کے علاوہ بائرن کی بھی مثال دی جس نے اپنے شعروں کے ذریعے فرانس، انگلستان اور روس کو غیرت دلائی کہ انھوں نے یونانی علم وحکمت سے فائدہ اٹھایا لیکن اب یونان ترکوں کا غلام ہے اور سب ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں اس کی نظموں نے یورپ میں وہ کام کیا جو آگ بارود پر کرتی ہے اور یورپ کے مشترکہ بیڑے نے یونان کو آزاد کرادیا۔[1]

چونکہ شاعر عام انسان کے مقابلے میں زیادہ حساس ہوتا ہے اس لیے وہ اپنے گرد و پیش میں رونما ہونے والے واقعات سے متاثر بھی زیادہ ہوتا ہے اور وہ تمام عوامل جن سے وہ اثر قبول کرتا ہے اس کی تخلیقات میں کبھی براہِ راست اور کبھی رمز وایما کے پیرائے میں ضرور ظاہر ہوتے ہیں۔ اردو شاعری نے ہر دور میں اہل وطن کو اپنی سرزمین سے پیار کرنے کے جذبے سے سرشار کیا۔ جب ملک غلام تھا تو اردو شعرا نے غیر ملکی حکمرانوں سے نجات دلانے کے لیے ہندوستانی عوام کے احساسِ غلامی کو ابھارا اور وہ جذبہ بیدار کیا جس نے اُن کو حصولِ آزادی کے لیے ہر طرح کے خطرات سے نبرد آزما ہونے کا حوصلہ دیا اور انھیں اتحاد و یکجہتی کا وہ سبق پڑھایا جس کے باعث غیر ملکی حکمرانوں کے ظلم وتشدد کے خلاف برسرِ پیکار ہونے کی ترغیب ملی۔ تحریک آزادی کو پروان چڑھانے کے لیے اردو شعرا نے نہ صرف قلمی طور پر اہل ملک کی رہنمائی کی بلکہ عملاً بھی اس میں شرکت کرکے ان کی رفتار کو تیز تر کیا۔ شعرا نے اس کی پروا بھی نہ کی کہ اس جرم کی پاداش میں ان کا انجام کیا ہوگا؟ چنانچہ اردو کے متعدد شعرا کو جنگِ آزادی میں قلمی اور عملی تعاون دینے کے صلے میں جامِ شہادت پینا پڑا، قید و بند اور جلا وطنی کی صعوبتیں برداشت کرنی پڑیں۔ لیکن اس کے باوجود جد وجہد آزادی کے ابتدائی دور ہی سے اردو شاعری تحریکاتِ آزادی کو مقبولِ عام بنانے اور اسے وسعت دینے کے لیے ہر ممکن کوشش کرتی رہی اور حصولِ آزادی تک مسلسل اہل وطن کی قومیت اور وطنیت کے شعور کو فروغ دینے، اُن میں ذہنی انقلاب پیدا کرنے اور سیاسی تحریکوں کو تیز و تند بنانے میں معاون و مددگار ثابت ہوتی رہی۔

برصغیر کے باشندوں میں اجتماعی روح پیدا کرنے، ان کے ملی اور وطنی شعور کو بیدار کرنے، اسے تقویت دینے اور سیاسی انتشارات کی مختلف تباہیوں اور بربادیوں کے بعد ان کے مردہ دلوں کو حرارت دینے میں اردو زبان نے جو اہم کردار ادا کیا اس کا صحیح اندازہ لگانا آسان نہیں۔ جب کہ یہ زبان برصغیر کی حیاتِ اجتماعی کا ایسا مجلّی اور مصفّی آئینہ ہے جس میں اس کی زندگی اور تہذیب کے خط وخال پوری طرح جلوہ گر ہیں۔ چونکہ ادب پورے طور پر معاشرے کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرتا ہے اس لیے اردو ادب بھی اپنے اندر سیاسی، معاشی، سماجی اور معاشرتی

زندگی کا عکس سموئے ہوئے برعظیم کے ایک طویل دور پر محیط ہے، جب سے اردو ادب کے وہ خط و خال ابھرے جس پر نگاہ پڑسکتی ہے اس کا ادب حب الوطنی اور قومی تحریک کا ایسا مظہر ہے جس نے کسی نہ کسی زاویے سے اجتماعی زندگی کو متاثر کیا۔ بقول ڈاکٹر معین الدین عقیل:

''مسلسل سیاسی انتشارات کے نتیجے میں جب قومی تحریکیں وجود میں آئیں تو اردو ادب نے نہ صرف ان تحریکوں کی جدو جہد کو بیان کیا بلکہ ان میں عملاً حصہ لیا۔''[2]

اگر اردو شاعری میں انقلاب کی لے کا اندازہ لگانا ہو تو اسے ہم مختلف شقوں میں تقسیم کرکے آسانی سے سمجھ سکتے ہیں۔ اردو شاعری کے آغاز سے ہی بعض اصناف میں طنز، تنقید اور اختلاف کرنے کی جو زیریں لہریں ملتی ہیں ان کو اردو شاعری کے آغاز سے ہی زمانی سیاق وسباق میں دیکھنے کی ضرورت ہے۔ یہ بات بڑی اہم ہے کہ بغاوت، اختلاف اور بے اطمینانی کے شاعرانہ اظہار کی مختلف صورتیں کچھ اس انداز میں اردو شاعری میں ملتی ہیں جن کو کبھی ہم حب وطن کا نام دیتے ہیں، کبھی وطن کے موسم، مقامات اور تاریخ پر افتخار کی شکل میں دیکھتے ہیں اور کبھی بغاوت کی واضح اور انحرافی لہر کو الفاظ میں محسوس کرتے ہیں۔ مگر ان تمام رویوں کو دراصل اردو شاعری میں وطن سے محبت اور غلامی کے خلاف علم بغاوت اٹھانے کے مختلف اسالیب کا نام دیا جانا چاہیے۔

اردو ادب کے باقاعدہ وجود میں آنے کے بعد برصغیر کے سیاسی انتشارات کو بیان کرنے کے لیے جو سب سے موزوں ترین صنف ہوسکتی تھی وہ شہر آشوب تھی۔ شہر آشوب اصطلاحاً ایسی نظم کو کہتے ہیں جس میں کسی شہر یا ملک کے اقتصادی اور سیاسی انتشارات کا تذکرہ ہو یا شہر کے مختلف طبقات کی مجلسی زندگی کے کسی پہلو کا نقشہ حزنیہ یا طنزیہ یا ہجویہ انداز میں کھینچا گیا ہو۔

ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد کا وقت یہاں کے بادشاہوں کے جاہ و جلال یا ان کی سخاوت کی تعریفیں کرنے کا وقت نہیں تھا۔ بلکہ جنگ و جدال میں سپاہیوں کے حوصلے بڑھانے اور انہیں فتح کا یقین دلانے کا موقع تھا۔ اس طرح رزمیہ نظموں کا آغاز ہوا، چنانچہ ان رزمیہ نظموں ہی میں ہمیں سب سے پہلے حب الوطنی کے جذبات دیکھنے کو ملتے ہیں۔

جب لڑائیوں اور حملوں کا دور ختم ہوا تو ہندوؤں اور مسلمانوں کے دلوں میں محبت کے سوتے پھوٹے اس زمانے کے میل جول کے واضح اثرات امیر خسرو (متوفی 1325) کی تخلیقات میں ملتے ہیں ان کے کلام میں ہندوستان کی

> **اردو شاعری کے آغاز سے ہی بعض اصناف میں طنز، تنقید اور اختلاف کرنے کی جو زیریں لہریں ملتی ہیں ان کو اردو شاعری کے آغاز سے ہی زمانی سیاق و سباق میں دیکھنے کی ضرورت ہے۔ یہ بات بڑی اہم ہے کہ بغاوت، اختلاف اور بے اطمینانی کے شاعرانہ اظہار کی مختلف صورتیں کچھ اس انداز میں اردو شاعری میں ملتی ہیں جن کو کبھی ہم حب وطن کا نام دیتے ہیں، کبھی وطن کے موسم، مقامات اور تاریخ پر افتخار کی شکل میں دیکھتے ہیں اور کبھی بغاوت کی واضح اور انحرافی لہر کو الفاظ میں محسوس کرتے ہیں۔ مگر ان تمام رویوں کو دراصل اردو شاعری میں وطن سے محبت اور غلامی کے خلاف علم بغاوت اٹھانے کے مختلف اسالیب کا نام دیا جانا چاہیے۔**

بولیوں، تیوہاروں، موسموں، پھولوں، پھلوں کا ذکر کثرت سے ملتا ہے یہاں کی آب وہوا، حسن اور زندگی کے مختلف پہلوؤں کی ستائش بھی خوب کی گئی ہے جو حب الوطنی کی واضح مثال ہے۔

امیر خسرو کے بعد شمالی ہند میں ایک لمبے عرصے تک کے لیے سکوت طاری ہوگیا اس زمانے میں ادبی لحاظ سے کوئی نمایاں کام تو نہیں ہوا۔ البتہ اس کے کچھ نمونے چند شخصیات کے حوالے سے تاریخ ادب اردو کا جز بنے لیکن انھیں بہت مستند، معتبر اور زیادہ اہمیت کا حامل نہیں سمجھا جاتا۔

اسی طرح دکن میں بھی اردو شاعری کا آغاز اگرچہ بہمنی عہد (1347-1490) میں ہو چکا تھا لیکن اس دور کی شاعری کے بہت کم نمونے دستیاب ہیں ان میں نظامی کی مثنوی 'کدم راؤ پدم راؤ' مثالی ہے۔ یہی صورتِ حال گجرات کی بھی ہے جہاں اردو کو گجری یا گجراتی کا نام دیا گیا۔ چنانچہ دکنی شاعری کے ابتدائی نمونوں کا جائزہ لیتے ہوئے ہماری نظر زیادہ تر ان تخلیقات پر رہتی ہے جو عادل شاہی (بیجاپور 1490 سے 1682 تک) اور قطب شاہی (گولکنڈہ 1508 سے 1687) دور میں وجود میں آئیں اور واقعی ان کا اردو ادب کے فروغ میں بڑا حصہ ہے۔

اس وقت دکن میں تقریباً سبھی اصناف سخن کی تخلیق کا سلسلہ شروع ہوگیا تھا۔ تاہم وہاں کی صورتِ حال کے مطابق مثنوی کو زیادہ فروغ حاصل ہوا۔ جس کی تخلیق کے لیے امن وامان، خوشحالی اور فارغ البالی کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ تمام چیزیں دکن میں میسر تھیں۔ دکنی شعرا کا خاص میلان واقعہ نگاری کی طرف تھا۔ بچے تاریخی رزم ناموں، اور جنگ ناموں سے ان کی دلچسپی اس امر کا واضح ثبوت ہے کہ وہ اپنے ماحول سے بہت ہی متاثر تھے اور انہیں اپنے وطن سے لگاؤ، محبت اور ہمدردی تھی۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور لکھتے ہیں:

''جب دکن پر مغلوں کے حملے شروع ہوئے تو اس 'دور انتشار' میں بے شمار شاعر دکن سے باہر نکل گئے اور کسمپرسی کے عالم میں روپوش ہوگئے لیکن شعرا کی ایک بڑی تعداد نے اپنا وطن چھوڑ کر کہیں نہ جانے کا فیصلہ کیا۔ اور اپنے شہر کی تباہی و بربادی پر آخری وقت تک نوحہ کرتے رہے۔''[3]

انھوں نے مرثیہ کو اپنے جذبات کے ظاہر کرنے کا آلۂ کار بنایا اور اپنے وطن عزیز کے غم کو حضرت حسینؓ اور شہدائے کربلا کے غم سے تشبیہ دی۔ بعض مرثیوں میں محض ایک آدھ لفظ بدل دینے سے ان شعرا کا مقصد (یعنی تباہی وطن کی مرثیہ نگاری) ظاہر ہو جاتا ہے جیسے روحی کے مرثیہ کا یہ شعر۔

آج غم ناک ہیں چمن کے گل
بلکہ دل چاک ہیں سمن کے گل
غم زدہ سینہ داغ حیراں ہیں
نرگس و لالہ یاسمن کے گل

اگر اس مرثیہ کے پہلے مصرعے میں چمن کی جگہ دکن کا لفظ لکھ دیا جائے تو پورا مرثیہ بجائے حضرت حسینؓ کے ابوالحسن تانا شاہ کا مرثیہ بن جاتا ہے۔[4]

مرثیہ کے علاوہ دکنی شعرا کی غزلوں میں بھی اس طرح کے رجحان نمایاں ہیں جس کی واضح مثال قلی قطب شاہ کی حب الوطنی شاعری ہے جس میں مقامی عنصر کی کمی نہیں۔ اس کے متعلق قطعی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ قلی قطب شاہ پہلا وہ شاعر ہے جس نے ہندوستانی زندگی کے رنگا رنگ حسن اور ماحول میں ڈوب کر شاعری کی۔

دکنی شعرا کی شاعری کے سلسلے میں مجموعی طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان کے یہاں حسن وعشق اور داستانِ محبت کے علاوہ سیاسی اور سماجی پہلو کی عکاسی، حب الوطنی کے جذبات اور آزادی کے رجحانات جیسے اہم موضوعات کی بھی کمی نہیں۔

شمالی ہند میں اردو شاعری کا باقاعدہ آغاز ولی کے دہلی پہنچنے سے ہوا۔ ویسے تو حسن وعشق، محبت اور محبوب کے سراپا کا بیان ولی کی شاعری کی اہم خصوصیات ہیں اور

وطن و ملک سے بے غرض معلوم ہوتے ہیں جس کا ثبوت خودان کا یہ شعر ہے۔

ہرگز ولی کے پاس تم باتاں وطن کی مت کہو
جونیہ کے کوچے میں ہے اس کو وطن سے کیا غرض[5]

اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ اپنے زمانے کے ماحول سے بالکل لاتعلق اور بے خبر تھے۔ ہندوستان میں انگریزوں کے تسلط سے پہلے پرتگال بھی حصول قوت کے لیے کوشاں تھے۔ اور وہ جب یہاں آئے تو اپنے ساتھ شراب بھی لائے جو اس وقت تیز نشہ کی علامت بن گئی تھی جس کا ذکر ولی نے اپنے اس شعر میں کیا ہے۔

ولی تجھ شعر کوں سنتے ہوئے ہیں مست اہل دل
اثر ہے شعر میں تیرے شراب پرتگالی کا[6]

اوراسی طرح فرنگ کا لفظ بھی ولی نے پرتگالیوں کے لیے استعمال کیا جو بعد میں انگریزوں کے لیے مستعمل ہوا۔

کفار فرنگ کو ں دیا ہے
تجھ زلف نے درس کافری کا[7]

اس کے علاوہ ولی کی غزلوں میں مقامی رنگ جا بجا نظر آتا ہے اس مقامی رنگ میں تیوہار، نہان، مقامات اور مختلف قوموں کا ذکر ہے جو ان کی وطن پرستی اور حب الوطنی کا واضح ثبوت ہے۔ لیکن اس کے بعد شمالی ہند میں شاعری کے بالکل دور ابتداء ہی میں ایہام گوئی کا چلن اتنا عام ہوا کہ عام شعرا کا شعر کہنا مشکل ہوگیا۔ کچھ دنوں بعد جب ایہام گوئی کا طلسم ٹوٹا تو شاعروں کی تعداد میں غیر معمولی اضافہ ہوا۔ اس عہد کے شعرا نے اپنے وقت کے سیاسی پس منظر کو مختلف اصناف سخن میں بیان کیا۔ غزل، شہر آشوب، مثنوی، قصیدہ وغیرہ لیکن ان تمام اصناف میں غزل درد و غم کے اظہار کی بہترین اور فطری صورت ہے اور اسی طرح کسی شہر یا ملک کی سیاسی یا اقتصادی بے چینی کو دیکھنے کے لیے 'شہر آشوب' بھی اردو شاعری میں بہت مقبول اور مستعمل صنف رہی ہے۔

ولی کے بعد دور اوّل کے شعرا میں بقول ابوالخیر کشفی ''سب سے پہلے مرزا مظہر جان جاناں نے اردو شاعری کو حقائق سے روشناس کرایا۔ ان کی غزلوں میں اس زمانے کے سیاسی حالات کی بہت مؤثر جھلک موجود ہے اس طرح وہ پہلے شاعر قرار پاتے ہیں جن کی غزلوں میں سیاسی رنگ ملتا ہے''[8] اور عین ممکن ہے کہ سیاسی خیالات اور تاثرات کے واضح ہونے کی وجہ سے اپنے اظہار کے لیے ایہام گوئی کو ترک کرنے پر مجبور ہوئے ہوں۔ اردو میں ان کا کلام بہت مختصر ہے لیکن اس کا سیاسی پہلو بہت نمایاں ہے۔ ان کے کلام سے چند اشعار پیش کیے جاتے ہیں جن کو انھوں نے حالات سے متاثر ہوکر کہا۔

یہ حسرت رہ گئی کس کس مزے سے زندگی کرتے
اگر ہوتا چمن اپنا، گل اپنا، باغباں اپنا[9]

کبھی اس دل نے آزادی نہ جانی
یہ بلبل تھا قفس کا آشیانی[10]

ہم گرفتاروں کو اب کیا کام ہے گلشن سے لیک
جی نکل جاتا ہے جب سنتے ہیں آئی ہے بہار[11]

ان اشعار سے صاف پتہ چلتا ہے کہ مرزا مظہر نے مغلیہ سلطنت کی حقیقی صورت حال کو بھانپ لیا تھا۔ جس کی وجہ سے انھوں نے اپنے عہد کو غلامی سے تعبیر کیا اور ظالم و جابر انگریزوں کے قبضے سے رہائی کی تمنا کی۔

اگر ولی کے اثرات سے شمالی ہند میں اردو شاعری کا آغاز ہوا تو مرزا مظہر نے بھی ایہام گوئی کو ختم کر کے ایک نئے دور کی بنیاد ڈالی جسے دور میر، درد و سودا کہا جاتا ہے۔ اس دور کے شعرا کی داستان حیات کا بہ نظر غائر مطالعہ کیا جائے تو ان کے حالات، درد و کرب کی علامت بن کر اپنے عہد کے جذبات و احساسات کی پوری کیفیت بیان کرتے ہیں۔ یہ شاعر جہاں گلستان، باغ، گلزار، چمن اور آشیاں کا ذکر کرتے ہیں تو یوں لگتا ہے کہ وہ اشاروں اور کنایوں میں ملک و وطن کا ذکر کر رہے ہیں۔

غزل میں اشاریت اور استعارہ سازی کے اس رویے سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اردو غزل کے آغاز سے ہی پرندے، صیاد، چمن، آشیاں، تیر و تفنگ، گل چیں، تیغ، تلوار وغیرہ کے جو موتف ملتے ہیں وہ ہر چند کہ آج کے زمانے میں شعری موتف کہلاتے ہوں اور ان کے معنی کسی حد تک متعین ہوگئے ہوں مگر ابتداء میں یہ تمام الفاظ، اشاریت اور علامت پسندی کی بہترین مثالیں تھے اور انھیں علامتوں میں اردو شاعروں نے قید و بند، آزادی، غلامی، ظلم و جور، جبر و اختیار جیسے تمام مسائل کا احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس لیے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اسی نوع کی علامتوں کے پردے میں اردو شاعروں کی محض داستان حیات ہی نہیں بیان ہوتی ہے بلکہ سیاسی اور سماجی بے اطمینانی کی روداد بھی ہے اور جد و جہد آزادی کے تہہ در تہہ جذبات بھی بیان ہوئے ہیں۔

اردو کی قدیم غزل میں ظالموں اور غارت گروں کو کبھی گل چین اور کبھی صیاد کا نام دیتے ہیں ان علامات و رموز کو پیش نظر رکھ کر مرزا مظہر، سودا، درد اور میر تقی میر کے اشعار کے جذبات و احساسات کی گہرائی تک پہنچا جاسکتا ہے۔ سودا کے چند شعر بطور مثال پیش کیے جاتے ہیں جن میں ان علامات کو استعمال کیا گیا ہے۔

اردو کی قدیم غزل میں ظالموں اور غارت گروں کو کبھی گل چین اور کبھی صیاد کا نام دیتے ہیں ان علامات و رموز کو پیش نظر رکھ کر مرزا مظہر، سودا، درد اور میر تقی میر کے اشعار کے جذبات و احساسات کی گہرائی تک پہنچا جاسکتا ہے۔ سودا کے چندشعر بطور مثال پیش کیے جاتے ہیں جن میں ان علامات کو استعمال کیا گیا ہے۔

صبا سے ہر سحر مجھ کو لہو کی باس آتی ہے
چمن میں آہ گلچیں نے یہ کس بلبل کا دل توڑا[12]

بلبل گر اس چمن میں سمجھ کر تک آشیاں
صیاد لگ رہا ہے تیری گھات بے طرح[13]

خندۂ گل بے نمک فریاد بلبل بے اثر
اس چمن سے آہ جا کر کیوں کریں گے یاد ہم[14]

(سودا)

نے گل کو ہے ثبات نہ ہم کو ہے اعتبار
کس بات پر چمن ہوسِ رنگ و بو کریں[15]

گزروں ہوں جس خرابے پہ کہتے ہیں واں کے لوگ
ہے کوئی دن کی بات یہ گھر تھا یہ باغ تھا[16]

(درد)

چمن کا نام سنا تھا و لے نہ دیکھا ہائے
جہاں میں ہم نے قفس ہی میں زندگانی کی[17]

نقش بیٹھے ہے کہاں خواہشِ آزادی کا
ننگ ہے نام رہائی تیری صیادی کا[18]

یہ عیش گہہ نہیں ہے یاں رنگ اور کچھ ہے
ہر گل ہے اس چمن میں ساغر بھرا لہو کا[19]

(میر تقی میر)

اسی زمانے میں سودا، میر، قائم اور نظیر نے کچھ ایسے شہر آشوب لکھے جس میں سیاسی اور تہذیبی حالات کو بہت ہی مؤثر اور رقت آمیز انداز میں بیان کیا گیا۔ بقول ڈاکٹر معین الدین عقیل: ''مغلوں کے آخری دور کی بے بسی و بے چارگی کا نوحہ ان کی گزری ہوئی عظمت و حشمت کا گہرا احساس، عسکری قوت کا زوال و انحطاط شاہوں اور امیروں کی نا اہلی اور خود غرضی، نظام سلطنت سے ذمے داروں کی بے گانگی، امن و امان کے فقدان خصوصاً معاشی بدحالی اور بے چینی، مختلف پیشوں اور طبقوں کی زبوں حالی بہتر طور پر دیکھنا ہو تو اس دور کے شہر آشوبوں کی طرف رجوع کرنا چاہیے''۔[20]

دہلی پر نادر شاہ کے حملے کے کچھ عرصہ بعد سکھوں،

جاٹوں، مراٹھوں اور احمد شاہ ابدالی کے متواتر حملوں سے اس کی حالت بدتر ہوتی چلی گئی۔ لیکن رہا سہا سکون اس وقت ختم ہوگیا جب 1803 میں سلطنت دہلی کے اختیارات مغل حکمرانوں سے انگریزوں نے چھین لیے۔ اس صورت میں برصغیر کے باشندوں میں جذبۂ حریت اور حب الوطنی کے جذبے کا پیدا ہونا لازمی تھا۔ جس کے اظہار کے لیے شعرانے دہلی کو علامت بنا کر اپنی حب الوطنی کو اس سے منسوب کیا۔

درد، سودا اور مصحفی نے دہلی کے زوال کو بہت ہی پر اثر انداز میں بیان کیا ہے لیکن دہلی کی نوحہ خوانی سب سے زیادہ میر تقی میر کے یہاں ہے جسے دیکھتے ہوئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ انھوں نے غزلیں نہیں کہیں بلکہ دل اور دہلی کے مرثیے لکھے۔

جب دہلی کی سلطنت آمادہ بزوال ہوئی، عیش ونشاط کی مجلسیں اجڑ گئیں، بدامنی اور بے چینی کا دور دورہ ہوگیا تو بقول احتشام حسین:

''شعرائے دہلی نے دوسرے راج درباروں کی راہ لی اور بیشتر نے زیادہ خوش حال اور قریب ہونے کی وجہ سے اودھ کا انتخاب کیا۔''[21]

دہلی سے لکھنؤ آنے والے مہاجر شعرا میں خان آرزو، سودا اور میر تقی میر دبستان دہلی کے نمائندہ شاعر تھے جرأت، انشا، رنگین کی شاعری کی ابتدا اگرچہ دہلی میں ہوئی مگر انہیں لکھنؤ میں عروج حاصل ہوا۔ ناسخ، آتش اور مصحفی نے تو یہاں ایک نئے دبستان کی بنیاد ڈالی، خان آرزو، سودا اور میر کے پیش نظر دہلی کی بربادی اور بدحالی کے تجربات تھے اس لیے ان میں داخلیت کا رجحان اور بربادی دہلی کے اسباب کی کسک زیادہ تھی۔ ان کے اس مزاج کا پختگی عمر میں بدلنا ممکن بھی نہ تھا۔ چنانچہ ابتداءً لکھنؤ میں دبستان دہلی کی روایات باقی رہیں کچھ ہی عرصہ بعد جرأت، انشا اور رنگین، لکھنؤ کی خارجی زندگی کی دلکشی سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

کیا اودھ کی یہ دلکشی ورنگینی ہمیشہ ہمیش باقی رہی اور یہاں سیاسی اور معاشرتی ہلچل پیدا نہ ہوئی ایسا نہیں تھا۔ آصف الدولہ کے دور حکومت ہی میں انگریزوں کی نظریں اودھ پر پڑ چکی تھیں۔ اور مختلف نوع کی دست درازیاں شروع ہوگئی تھیں یہاں تک کہ 1856 میں واجد علی شاہ کو معزول کر کے مٹیا برج (کلکتہ) بھیج دیا گیا۔ الحاق اودھ کے بعد انتشار و بدحالی کا دور دورہ ہوگیا۔ یہاں کی تہذیب وثقافت ڈھے گئی اور ایک ہی سال بعد 1857 کی جنگ آزادی لڑی گئی۔ جس میں لکھنؤ نے بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اس کی ناکامی کے بعد تقریباً پورا ہندوستان انگریزوں کے قبضے میں چلا گیا۔ 1857 سے پہلے ہی انگریزوں کی بڑھتی ہوئی قوت کا احساس جرأت، مصحفی، ناسخ اور آتش کو ہو چکا تھا۔

1. جرأت نے حقیقی صورت حال کو سمجھ لیا تھا کہ اب ملک پر غیر ملکی انگریزوں کا تسلط قائم ہوگیا ہے۔ لہٰذا اس شعر کی روشنی میں ظالم وجابر حکمرانوں سے رہائی کے متمنی نظر آتے ہیں:

بہار آئی ہزار اے ہم صفیرو! باغ میں لیکن
نصیبوں میں کہاں ہم سے اسیروں کے رہائی ہے[22]

بہار آئی پہ صیاد نے رہا نہ کیا
اگرچہ ہم نے قفس میں ہزار پر مارے[23]

2. تجارت کی غرض سے آئے ہوئے انگریز کس طرح ہندوستان کی دولت کو لوٹ رہے ہیں اس کا احساس مصحفی کو انگریزوں کے خلاف علم بغاوت بلند ہونے سے بہت پہلے ہی ہو چکا تھا انھوں نے اس احساس کو شعری جامہ پہنا کر اپنے ہم وطنوں تک پہنچایا اور بتایا کہ ہمارے اصل دشمن انگریز ہیں جو لوٹ گھسوٹ کا بازار گرم کر کے ملک کو معاشی بدحالی کا شکار بنا رہے ہیں۔

ہندوستان کی دولت وحشمت جو کچھ کہ تھی
ظالم فرنگیوں نے بہ تدبیر کھینچ لی[24]

3. ناسخ بھی انگریزوں کے سیاسی استحکام سے نالاں تھے فرنگیوں کے تسلط سے رہائی حاصل کرنے کی خواہش اور ان سے نفرت کا اظہار یوں کرتے ہیں۔

دل ملک انگریزی میں جینے سے تنگ ہے
رہنا بدن میں روح کو قید فرنگ ہے[25]

ان اشعار سے یہ بات تو واضح ہو جاتی ہے کہ اردو شاعری میں حب الوطنی کے جذبات تو ابتدا ہی سے تھے لیکن انگریزوں کی دست درازیوں کے سبب ان سے نفرت کا اظہار بھی کیا جانے لگا یہ الگ بات ہے کہ اس میں وہ شدت نہیں جو بعد کے شعرا کے کلام میں ہے لیکن اس کی اہمیت اس وجہ سے ہے کہ یہ اس دور میں کہے گئے جب انگریزوں کا رعب ودبدبہ اپنے شباب پر تھا اس زمانے میں ان کے خلاف لکھنا تو درکنار ان کی مرضی کے خلاف نہیں لکھا جاسکتا تھا۔

اردو شاعری میں حب الوطنی کے جذبات تو ابتدا ہی سے تھے لیکن انگریزوں کی دست درازیوں کے سبب ان سے نفرت کا اظہار بھی کیا جانے لگا یہ الگ بات ہے کہ اس میں وہ شدت نہیں جو بعد کے شعرا کے کلام میں ہے لیکن اس کی اہمیت اس وجہ سے ہے کہ یہ اس دور میں کہے گئے جب انگریزوں کا رعب و دبدبہ اپنے شباب پر تھا اس زمانے میں ان کے خلاف لکھنا تو درکنار ان کی مرضی کے خلاف نہیں لکھا جاسکتا تھا۔

حوالہ جات

1. مقدمہ شعر وشاعری، خواجہ الطاف حسین حالی، اتر پردیش، اردو اکادمی لکھنؤ، 1998، چوتھا ایڈیشن، ص 3-9
2. تحریک آزادی میں اردو کا حصہ، ڈاکٹر معین الدین عقیل، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، 1976، ص 111
3. داستان ادب حیدرآباد، ڈاکٹر محی الدین قادری زور، ادارہ ادبیات حیدرآباد دکن، 1951، ص 43
4. ایضاً، ص 44
5. کلیات ولی، مرتبہ ڈاکٹر سید نورالحسن ہاشمی، نظامی پریس لکھنؤ، 1982، ص 164
6. ایضاً، ص 86
7. ایضاً، ص 84
8. اردو شاعری کا سیاسی اور تاریخی پس منظر (1707 سے 1857) ابوالخیر کشفی، ادبی پبلشرز، کراچی، 1975، ص 133
9. مرزا مظہر جان جاناں (ان کا عہد اور اردو شاعری) ڈاکٹر سید تبارک علی نقش بندی، ثمر آفسیٹ پرنٹرز، دہلی، 1988، ص 185
10. ایضاً، ص 195
11. ایضاً، ص 190
12. کلیات سودا (مرزا محمد رفیع سودا) سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، 1987، ص 16
13. ایضاً، ص 52
14. ایضاً، ص 98
15. دیوان درد (خواجہ میر درد دہلوی) مکتبہ جامعہ لمٹیڈ، نئی دہلی، 1971، ص 52
16. ایضاً، ص 33
17. کلیات میر تقی میر (مرتبہ ظل عباس عباسی) علمی مجلس دلی، 1968، غزل نمبر 390، ص 262
18. ایضاً، غزل نمبر 131، ص 157
19. ایضاً، غزل نمبر 92، ص 141
20. تحریک آزدی میں اردو کا حصہ، ڈاکٹر معین الدین عقیل، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، 1976، ص 167
21. اردو ادب کی تنقیدی تاریخ، سید احتشام حسین، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، 2001، چوتھا ایڈیشن، ص 60
22. کلیات جرأت، مرتبہ ڈاکٹر نورالحسن نقوی، لیتھوکلر پرنٹرس، علی گڑھ، 1971، ص 606
23. ایضاً، ص 605
24. دیوان مصحفی، مرتبہ سید فضل الدین حسرت موہانی، احسن المطابع، علی گڑھ، 1905، ص 97
25. دیوان ناسخ، حصہ دوم، ناسخ، مطبع نول کشور لکھنؤ، 1923، ص 222

■

Dr. Abdul Hafiz School of Humanities
Indira Gandhi National Open University
Maidan Garhi, New Delhi-110068
Mobile No: 9450115426

رئیسہ پروین

ن م راشد اور اقبال

ن م راشد کا شمار ان چند نظم نگاروں میں ہوتا ہے جنھوں نے آزاد نظم کو عروج کمال تک پہنچادیا۔ یوں تو انھوں نے پابند نظموں میں بھی طبع آزمائی کی لیکن انھیں شہرت آزاد نظم سے حاصل ہوئی۔ اور وہ آزاد نظم کے بانی ٹھہرے۔ ان کی ذہنی تربیت میں اقبال کو بڑا دخل حاصل ہے۔ راشد کے بچپن کا زمانہ اقبال کی شاعری کے عروج کا زمانہ تھا ہر خاص وعام اقبال کے شاعرانہ جوہر کا قائل تھا ایسے میں راشد جیسے حساس شاعر کا اس طرف متوجہ ہونا فطری عمل تھا۔ اقبال سے ذہنی ہم آہنگی کے تحت راشد نے اپنی شاعری کی اساس انھیں عناصر پر قائم کی جن کو اقبال نے جلا بخشی تھی۔ اور انھوں نے اقبال کے خیالات وتصورات کو وسیع پیمانے پر اپنی شاعری میں برتا۔ اسی کے زیر اثر ان کے کلام میں قدیم فنی روایات سے انحراف کا رجحان ملتا ہے۔ یہ انحراف مواد، ہیئت دونوں اعتبار سے پایا جاتا ہے۔ راشد نے اقبال کے فکروفن اور فلسفے سے استفادہ کے ساتھ اپنی انفرادی فکر کو بھی قائم رکھا اور اردو شاعری پر گہرے اثرات مرتب کیے اس طرح شاعری کی ساخت کو یورپی شاعری کے دوش بدوش لا کھڑا کیا۔

راشد کے ابتدائی شعری مجموعہ 'ماورا' میں آزاد اور پابند دونوں قسم کی نظمیں پائی جاتی ہیں۔ ابتدائی نظموں میں عشق ورومان چھایا ہوا ہے شاعر اپنی تمام آرزوؤں کو چھپا کر رکھنا چاہتا ہے۔ ان نظموں میں جنسی جذبات کی فراوانی ہے لیکن یہ بیمار ذہن کی اپج نہیں بلکہ اس کا رشتہ انسان کے بنیادی جذبات اور سرگزشت سے گہرا ہے۔ ان کی شاعری میں داخلیت کے ساتھ اجتماعی اور سماجی زاویۂ نظر اور انفرادی نفسیات، اجتماعی نفسیات کے اہم پہلوؤں کی عکاسی ملتی ہے۔ دونوں شعرا کے یہاں انسان خاص طور پر مزدور اور دبے کچلے طبقے کی حالت زار کا درد نمایاں ہے اور سماج میں صالح اقدار کے مٹنے کی کسک احتجاج لے بن کر ابھرتی ہے۔ راشد اپنی نظم درماندہ میں مشرق کی زبوں حالی کا بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ مغرب نے ایشیا والوں کو اپنے آگے بھکاریوں کا سا درجہ دے رکھا ہے یورپی اپنے علم وحکمت اور سائنسی ترقی کے بل بوتے پر ایشیا کو اپنا غلام بنا کر رکھنا چاہتے ہیں اور ان کی محنت کا صلہ انھیں بھیک کی طرح ادا کرتے ہیں اس ذلت کی زندگی پر دونوں شعرا خون کے آنسو بہاتے ہیں اور ایشیا کو اس ذلت بھری زندگی سے نجات دلانا چاہتے ہیں۔ البتہ وہ ایشیا کی بدحالی سے دکھی ضرور ہیں لیکن ناامید نہیں ہیں انھیں یقین ہے کہ وہ سنہرا دور ضرور آئے گا جس کی انھوں نے تمنا کی ہے۔ لیکن اس کے لیے معاشرے سے برائیوں کا خاتمہ کرنا ہوگا راشد کے لہجے کی رجائیت اور خود اعتمادی ملاحظہ کیجیے۔

رہی ہے حضرتِ یزداں سے دوستی میری
رہا ہے زہد سے یارانہ استوار مرا
گزر گئی ہے تقدس میں زندگی میری
دل اہرمن سے رہا ہے ستیزہ کار مرا
کسی پہ روح نمایاں نہ ہوسکی میری
رہا ہے اپنی اُمنگوں پہ اختیار میرا

اقبال کے اسلوب وآہنگ اور طرز بیان کی چھاپ راشد کے کلام میں جابہ جا نظر آتی ہے نظم 'شاعر درماندہ' میں کہتے ہیں۔

زندگی تیرے لیے بستر سنجاب وسمور
اور میرے لیے افرنگ کی دریوزہ گری
فتنۂ فکرِ معاش
پارۂ نان جویں کے لیے محتاج ہیں ہم

اقبال نے اپنے عہد کی سامراجی طاقتوں کے جوروستبد اد اور اس کی تباہ کاریوں کو ہدف ملامت بنایا۔ اور ان نامساعد حالات سے نبرد آزما ہونے کا نسخہ ہائے کیمیا سے قوم کو آگاہ کیا ہے وہیں راشد نے ایران کی خستہ حالی کو موضوع سخن بنایا۔ دونوں شعرا کے یہاں غلامی سے آزادی حاصل کرنے کی جدوجہد کی تلقین ملتی ہے۔ اقبال نے اپنے کلام میں فلسطین اور شمالی افریقہ کی تباہ حالی پر نظمیں لکھیں ان کی نظم 'فلسطین عرب سے' اور ن م راشد کی نظم 'تیل کے سوداگر' اس سلسلے کی اہم کڑی ہے۔

اقبال اور راشد کے کلام میں مغربی تہذیب سے نفرت بدرجہ اتم موجود ہے۔ چونکہ دونوں شعرا کو کم وبیش ایک ہی طرح کے سیاسی، سماجی ومعاشی مسائل تھے اس کے زیر اثر انھیں سماج میں انسان کی تباہی اور طبقاتی ناہمواری کا شدت سے احساس تھا وہ اس نظام زندگی کو بدل دینا چاہتے تھے جس کے لیے وہ لوگوں میں صالح اقدار پیدا کرنے کے متمنی تھے۔ تاکہ ان کی خودی بیدار ہوسکے اور ان میں عظمت کا احساس پیدا ہو اسی عظمت کے تحت انسان کو اشرف المخلوقات کے لقب سے نوازا گیا تھا۔ اس مقصد کے حصول کے لیے دونوں شعرا انگریزی سامراج کی سیاسی غلامی سے آزادی حاصل کرنے کو ضروری سمجھتے

ہیں۔ راشد کے مجموعہ کلام 'ماورا' اور 'ایران میں اجنبی' کی بیشتر نظموں میں ہندوستان اور باہر کے ممالک میں انگریزی حکومت کی سیاسی چالبازیوں سے پیدا شدہ تباہی اور انسان کے ذہنی اور جسمانی استحصال کو بے نقاب کیا گیا ہے۔ دونوں اس بات پر متفق ہیں کہ مشرق میں روح کی آسودگی کی اشد ضرورت ہے مشرق کی نجات کا دار و مدار عملی جدوجہد اور اتحاد میں مضمر ہے۔ اسی جذبے کی تسکین کے لیے دونوں کے یہاں اسلاف کے شاندار ماضی کا ادراک ہوتا ہے۔ اور انسانی زندگی کی ترقی اور رفعت کو پانے کے لیے اسلاف کی زندگیوں کا مشاہدہ کرنے کی تلقین ملتی ہے۔ جن کی زندگیاں کامیابی اور کامرانی سے ہمکنار ہوئیں۔ راشد کی نظم 'حسن کوزہ گر' میں کہتے ہیں۔

تو چاہے تو بن جاؤں میں پھر
وہی کوزہ گر جس کے کوزے
تھے ہر کاخ و کو اور ہر شہر و قریہ کی نازش
تھے جن سے امیر و گدا ساکن درخشاں
تو چاہے تو میں پھر پلٹ جاؤں ان کوزوں کی جانب
معیشت کے اظہار فن کے سہاروں کی جانب
کہ میں اس گل ولا سے اس رنگ و روغن
سے پھر وہ شرارے نکالوں کہ جن سے
دلوں کے خرابے ہوں روشن

اقبال کے کلام میں اسلاف کے روشن میناروں سے اپنے چراغ روشن کرنے کی سعی کامل کا پختہ احساس ملتا ہے ان کی نظر میں اسلاف کے تجربات کی روشنی میں انسان ان غلطیوں سے گریز کرسکتا ہے جن پر چل کر اسلاف کو زوال سے دوچار ہونا پڑا۔ اس لیے وہ اسلاف کے ان صالح اقدار اور شاندار ماضی کو اپنانے کی ترغیب دیتے ہیں جس پر چل کر ان کی زندگیاں رفعت و عظمت سے ہمکنار ہوئیں اقبال اسی صبح و شام کو پھر دیکھنے کے متلاشی ہیں کہتے ہیں۔

ہاں دکھادے اے تصور پھر وہ صبح و شام تو
دوڑ پیچھے کی طرف اے گردش ایام تو

پچھلے زمانے کی طرف لوٹ جانے کی آرزو اقبال کے اس ذہنی کرب کو ظاہر کرتی ہے جس کے تحت وہ موجودہ دور کے زوال کا ازالہ کرنا چاہتے ہیں انھیں اس بات کا کامل یقین تھا کہ قومیں مرکر دوبارہ زندہ ہوسکتیں ہیں اس کے لیے صرف سعی پیہم اور جدوجہد درکار ہے لیکن راشد کا معاملہ اس کے برعکس ہے ان کے یہاں بظاہر ماضی کی اقدار اور اسلاف سے چھٹکارا پانے کا رجحان ملتا ہے۔ یہ غالباً اس لیے ہے کہ ان کے کلام میں مذہب، جنس اور روایات سے بغاوت کا گہرا شعور کارفرما ہے لیکن اس ظاہری گریز کے باوجود راشد اپنے اشعار میں قدم قدم پر اسلاف

> **راشد اور اقبال کے کلام میں انسان کی فلاح اور بہبود کو اولیت حاصل ہے۔ سماج میں انسان کی محرومیوں اور نارسائیوں کے ساتھ طبقاتی کشمکش کو ختم کرنے کا شدید جذبہ کارفرما ہے۔ اقبال کا تمام کلام ان عناصر کی تفسیر ہے۔**

کے تہذیبی عناصر اور روایات سے خوشہ چینی کرتے نظر آتے ہیں۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری اس ضمن میں رقمطراز ہیں۔

"ماضی کی نفی کرنے والا یہ شاعر اپنے تہذیبی حوالوں کے بغیر بمشکل ہی چل سکتا ہے۔ اپنے حال کے مسائل کے اظہار کے لیے وہ قدم قدم پر اپنے تہذیبی پس منظر کی طرف رخ کرتا ہے۔ اقبال کے بعد کوئی ایسا شاعر مشکل سے ہی مل سکے گا جو راشد سے زیادہ اپنے تہذیبی حوالے سے مستفیض ہوا ہو۔"

(حوالہ'لا= راشد' ص 22، لاہور 1994)

راشد اور اقبال کے کلام میں انسان کی فلاح اور بہبود کو اولیت حاصل ہے۔ سماج میں انسان کی محرومیوں اور نارسائیوں کے ساتھ طبقاتی کشمکش کو ختم کرنے کا شدید جذبہ کارفرما ہے۔ اقبال کا تمام کلام ان عناصر کی تفسیر ہے۔ اسی طرح راشد کے مجموعہ کلام 'ماورا'، 'ایران میں اجنبی' اور 'لا انسان' میں بھی یہ تصورات اپنے ارتقائی سفر طے کرتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ دونوں شعرا زندگی کے ہر پہلو میں مساوات کے قائل ہیں کیونکہ یہی ایک طریقہ ہے جس کے ذریعے ایک صالح سماج کی تعمیر ممکن ہے انسان مکمل آزادی کی فضا میں سانس لے سکتا ہے۔ اور راشد کے کلام میں کائناتی وژن مفکرانہ اسلوب، فکر کا وسیع و بسیط تناظر، مابعد الطبیعاتی مسائل و موضوعات اقبال سے ہی اخذ کیے گئے ہیں۔ اقبال کا خودی کا تصور ان کے یہاں کشف ذات کے روپ میں ابھرتا ہے راشد بھی انسان کو خود آگاہ اور بے باک دیکھنا پسند کرتے ہیں اسی لیے وہ اردو شعر و ادب میں ایک باغی شاعر کے روپ میں ابھرتے ہیں ایک زمانے میں راشد خاکسار تحریک ملتان سے منسلک رہے لیکن بعد میں ان کے خیالات میں تبدیلی رونما ہوئی اور وہ انسان دوستی کے سیکولر تصور کو فوقیت دینے لگے۔ اقبال کی طرح وہ بھی عمل جدوجہد اور حرکت کے علمبردار تھے لیکن سماجی اور دینی روایت سے رشتہ توڑ چکے تھے۔ جس کے تحت ان کے کلام میں شرعی اصولوں سے انحراف پایا جاتا ہے البتہ اقبال کے یہاں الحاد اور تشکیک کی یہ صورت پیدا نہیں ہوتی بلکہ یہ ردعمل بے زاری، شکوہ شکایت، شوخی اور طنز کا سا انداز لیے ہوئے ہے۔ اقبال

نے نطشے سے مرد کامل کا تصور مستعار لیا وہ زندگی کے کسی بھی پہلو کو مذہب اور روحانیت سے الگ کرکے دیکھنے کے قائل نہیں تھے کیونکہ مذہب اور روحانیت جیسے صالح عناصر میں ہی انسانی زندگی کی ترقی اور بقا کا راز پوشیدہ ہے۔ لیکن راشد نے نطشے سے جو تصور اخذ کیا تھا اس کے پیش نظر وہ خدا کے منکر نظر آتے ہیں۔

یورپ کی عملی اور جدوجہد سے بھری زندگی کے مقابلے میں ایشیا کے لوگ بے عملی اور جمود کا شکار تھے۔ یہ بے عملی تصوف کے ان کی ہماری زندگیوں میں گھر کرگئی تھی جس نے انسان سے اس کی خودی چھین لی اور اسے کاہل اور جمود کا شکار بنادیا اس لیے دونوں شعرا کے کلام میں خانقاہی زندگی کی نفی ملتی ہے۔ کیونکہ تصوف کی تعلیم انسان کو مجبور محض تصور کرتی ہے جس کے نتیجے میں انجماد و ذہنی کے گہرے غار میں گرتا چلا گیا۔ راشد کہتے ہیں۔

ہم تصوف کے نہاں خانوں میں بسنے والے
اپنی پامالی کے افسانوں پہ ہنسنے والے
ہم سمجھتے ہیں نشان سر منزل پایا

(راشد: نظم تصوف)

یہ ذکر نیم شبی یہ مراقبے یہ سرور
تری خودی کے نگہباں نہیں تو کچھ بھی نہیں

(اقبال: نظم تصوف)

اقبال اور راشد دانش گاہوں سے بھی مطمئن نہیں کیونکہ وہاں بھی بے عمل اور بے علم معلموں کا غلبہ ہے۔ جو انسانوں کی ذہنی اور سماجی تربیت کے اہل نہیں۔ اقبال کا کہنا ہے۔

شیخ مکتب کے طریقوں سے کشادہ دل کہاں
کس طرح کبریت سے روشن ہو بجلی کا چراغ
مرے کدو کو غنیمت سمجھ کہ بادۂ ناب
نہ مدرسے میں ہے باقی نہ خانقاہ میں ہے

راشد نظم اے وطن اے جان، میں یوں گویا ہیں۔

خاک چھانی میں نے دانش گاہ کی
اور دانش گاہ میں بے دست و پا درویش حسن و فہم کے جو یا ملے
جن کو میری طرح ہر دستگیری کی طلب
لیکن اپنے علم و دانش کا ثمر اس کے سوا کچھ بھی نہ تھا
سر تہی نقلی خدا تھے خیر و قوت کے نشان
اور انسان اہل دل انسان شریر و ناتواں

موت کے بعد ایک نئی زندگی کا ظہور عمل میں آتا ہے دونوں کے کلام میں موت سے ہراساں ہونے کے بجائے اس اٹل حقیقت کو تسلیم کرنے کا رجحان ملتا ہے ان کی نظر میں موت صرف ایک وقفہ کا نام ہے کیونکہ کسی زندگی کے مٹ جانے کے باوجود بھی زندگی اپنی گوناگوں مظاہر کے ساتھ رواں دواں رہتی ہے۔

موت تجدیدِ مذاقِ زندگی کا نام ہے
خواب کے پردے میں بیداری کا اک پیغام ہے
(اقبال: نظم، والدہ مرحومہ کی یاد میں)

راشد کا کہنا ہے۔

یہ بجا ہے کہ ہست ہزار رنگ کے جلوہ گر
مگر اک حقیقت آخر میں
یہی آستانۂ مرگ ہے
تو اے زائرو
کبھی ناوجد کی چوٹیوں سے اتر کر تم
اسی اک نگاہ میں کود جاؤ
نئی زندگی کا شباب پاؤ

دونوں شعرا فطرت کی آغوش میں سکون حاصل کرتے ہیں راشد کی نظمیں 'فطرت' اور 'عہد نو کا انسان' میں وہ انسان اور فطرت کے مکالموں کے ذریعے اپنا نظریۂ حیات وکائنات کو پیش کرتے ہیں یہ اندازِ تکلم انھوں نے اقبال سے سیکھا ہے۔

راشد کے عہد کا مطالعہ کریں تو ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے دور میں مشرق کا سیاسی وسماجی ڈھانچہ اقبال کے عہد سے مختلف تھا۔ اس لیے راشد جب مشرق کا ذکر کرتے ہیں تو اقبال کی طرح ان پر جذباتیت طاری نہیں ہوتی۔ وہ مغرب کو صرف اس لیے رد نہیں کرتے کہ اس کی بنیاد خالص مادی اصولوں پر استوار ہے۔ اس مختلف ردعمل کا بڑا سبب یہ ہے کہ اقبال سیاست کے ساتھ ہمیشہ اپنی تہذیبی جڑوں کی تلاش میں سرگرداں رہے ہیں ان کی نظر میں مشرقی تہذیب کے مقابلے میں مغربی تہذیب بے روح اور بے جان ہے لیکن راشد صرف سیاسی پس منظر کے تحت ہی مغرب کو ہدفِ ملامت کرتے ہیں۔ راشد نے اقبال سے اثر ضرور قبول کیا لیکن وہ اقبال کی دینی اساس کو نہیں اپنا سکے۔ البتہ انھوں نے روایت پرستی سے

راشدنے موضوعات کے ساتھ اقبال کی لفظیات سے بھی بھرپور استفادہ کیا ھے کہ ان کے اسلوب پر اقبال کا گھرا اثرنمایاں ھے۔ غالب اور اقبال کی طرح راشد کا اسلوب بھی فارسی آمیز ھے اسلوب کی یہ ظاھری شکل ان کے کلام کو اقبال کے اسلوب سے قریب کرتی ھے۔ راشد نے شاعری میں فنی جدت نگاری سے کام لیتے ھوئے آزاد نظم کو منفرد اسلوب عطا کیاھے۔

پرہیز کیا اور زندگی میں نئے میلانات کو ترجیح دی۔ اقبال نے اپنے کلام میں مشرق ومغرب کا موازنہ پیش کرکے اس تصادم کو ظاہر کیا ہے جو دونوں تہذیبوں کے ٹکراؤ سے پیدا ہوا تھا۔ اس لیے بعض اوقات اقبال ماضی پرست نظر آتے ہیں راشد کے کلام میں بھی اس کرب کی پرچھائیاں مل جاتی ہیں۔ لیکن راشد پوری طرح ماضی پرست نہیں ہیں۔ اقبال مغرب کی خالص مادی زندگی سے اس لیے بیزار ہیں کہ اس سے انسان کی مکمل ترقی ممکن نہیں۔ وہ مادیت کے ساتھ روحانیت کی آمیزش کو ضروری سمجھتے تھے کم وبیش راشد کا نظریہ حیات بھی اسی خمیر سے اٹھا ہے لیکن ان کے یہاں روحانیت کی پرچھائیاں مدھم ہیں۔ اقبال مغرب کی برکتوں سے فیض حاصل کرنے کو برا نہیں سمجھتے لیکن ان کی تہذیب سے دور رہنے کی تلقین ان کے کلام میں جابہ جا نظر آتی ہے۔

اقبال وراشد کا فن بتدریج ارتقائی منازل طے کرتا ہوا اپنی انتہا کو پہنچتا ہے۔ ان کا یہ شعری سفر کسی مرحلے پر بھی جمود کا شکار نہیں ہوتا۔ راشد کے مجموعہ کلام 'ماورا' کی نظموں میں پابند نظم کا آہنگ باقی ہے لیکن 'ایران میں اجنبی' تک آتے آتے ان کے یہاں فنی پختگی، ایمائیت اور علامات کی تہہ داری نمایاں ہے اس میں راشد کا انفرادی رنگ بھی جھلکتا ہے۔ وہ آہستہ آہستہ اقبال کے اثر سے نکلتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں 'لا انسان' تک آتے آتے ان کا فن ایک نئی منزل کی طرف گامزن نظر آتا ہے۔ وہ مشرق کی حدود کو پار کرکے آفاقیت کی طرف سفر کرتے ہیں۔ ان نظموں میں فکر کا نیا تصور ملتا ہے۔

راشد نے موضوعات کے ساتھ اقبال کی لفظیات سے بھی بھرپور استفادہ کیا ہے کہ ان کے اسلوب پر اقبال کا گہرا اثر نمایاں ہے۔ غالب اور اقبال کی طرح راشد کا اسلوب بھی فارسی آمیز ہے اسلوب کی یہ ظاہری شکل ان کے کلام کو اقبال کے اسلوب سے قریب کرتی ہے۔ راشد نے شاعری میں فنی جدت نگاری سے کام لیتے ہوئے آزاد نظم کو منفرد اسلوب عطا کیا ہے۔ اس کے ساتھ زبان وبیان، تشبیہات واستعارات میں بھی ندرت پیدا کی۔ انھوں نے اقبال کی مانند پرانے الفاظ کو نئے معنی ومفہوم عطا کیے لہٰذا فنی میلان میں بھی وہ اقبال کے مقلد ٹھہرے۔ لیکن اس بات سے انکار ممکن نہیں کہ راشد کی وضع کی ہوئی تراکیب اور بندشیں اکثر اوقات اجنبی سی لگنے لگتی ہیں جبکہ اقبال کے اسلوب میں ابہام کی یہ کیفیت پیدا نہیں ہوتی۔ البتہ اس بات کا اعتراف ممکن ہے کہ غالب اور اقبال نے ہماری سوچ میں ایک ایسا تموج پیدا کردیا تھا۔ جس نے ہمیں جدید فکر کے منبع پر لا کھڑا کیا۔ ان کے بعد راشد نے اس فکر کو آگے بڑھایا۔ لہٰذا وہ نئی نظم کے معمار ہی نہیں بلکہ غزل کے مدمقابل نظم کا ذوق پیدا کرنے میں وہ اقبال کے پس رو ہیں۔

■

Dr. Raisa Parveen
Satyawati College Ashok Vihar
Delhi - 110052

جن کتابوں نے متاثر کیا

ماہنامہ 'اردو دنیا' کا
نیا سلسلہ

ہزاروں کتابوں میں چند ہی کتابیں ایسی ہوتی ہیں جو آپ کے ذہن و دل کی دنیا بدل دیتی ہیں۔ ایسی کتابوں کی قوت، اہمیت ومعنویت کو قارئین سے شیئر کرنے کے لیے 'اردو دنیا' میں ایک نیا سلسلہ شروع کیا جارہا ہے جس میں مختلف اصناف پر مشتمل نئی اور پرانی کتابوں کے بارے میں صاحبانِ علم وہنر یہ بتائیں گے کہ کن کتابوں نے انھیں متاثر کیا ہے۔
صاحبانِ ذوق کتاب کے اسلوب، موضوع اور دیگر تلازمات کے علاوہ یہ بھی بتائیں گے کہ یہ کتابیں کیوں پڑھنی چاہئیں۔ آپ نے ابھی تک جتنی کتابیں پڑھی ہیں ان میں سے چند کا انتخاب کیجیے اور اپنے مطالعاتی سفر میں ان افراد کو بھی شامل کیجیے جن تک شاید ان کتابوں کی رسائی نہیں ہو پاتی ہے۔ منتخب کتابوں کے تعلق سے اپنے منطقی ومعروضی خیالات اور تاثرات ہمیں لکھ بھیجیے۔

عطیہ حسین
اور زوال پذیر جاگیردارانہ نظام

محبوب حسن

عطیہ حسین انگریزی فکشن کا بے حد معروف اور اہم نام ہے۔ ان کی پیدائش اودھ کے معروف جاگیردار گھرانے میں 1913 کو ہوئی۔ ان کے والد شاہد حسین لکھنؤ کے مشہور تعلقہ دار تھے۔ عطیہ حسین کا خاندان سماجی، سیاسی، تعلیمی اعتبار سے نہایت روشن خیال اور ترقی پسند تھا۔ ان کی تعلیم وتربیت مشرقی اور مغربی دونوں انداز میں ہوئی۔ اردو، عربی اور فارسی کے علاوہ انھیں انگریزی زبان و ادب سے بھی گہرا شغف رہا ہے۔ عطیہ حسین نے 1933 میں لکھنؤ یونیورسٹی سے بی اے کی تعلیم مکمل کی۔ انھیں جاگیردار طبقے کی پہلی گریجویٹ خاتون ہونے کا شرف حاصل ہے۔ انھوں نے اپنی زندگی کے تجربات ومشاہدات کو تخلیقی بصیرت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ان کی تخلیقات سے مشترکہ تہذیبی وثقافتی قدروں کی تاریخ مرتب کی جاسکتی ہے۔

"Sun Light on a Broken Column" ان کا مشہورترین ناول ہے۔ یہ ناول 1961 میں زیور طبع سے آراستہ ہوا۔ اس ناول میں زوال پذیر جاگیردارانہ اقدار وروایات کو تاریخی بصیرت کے ساتھ موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ اس ناول کے علاوہ عطیہ حسین نے "Phonenix Fled" کے عنوان سے ایک افسانوی مجموعہ بھی یادگار چھوڑا ہے۔ تقسیم ہند ہندوستانی تاریخ کا ایک نہایت المناک باب رہا ہے۔ اس حادثے نے ملک کی مختلف زبانوں کے ادب پر اپنے داخلی اور خارجی اثرات مرتب کیے۔ غور طلب ہے کہ انگریزی فکشن میں زوال پذیر جاگیردارانہ نظام کے تخلیقی اظہار کی کوئی قابل ذکر روایت نہیں ملتی۔ عطیہ حسین انگریزی کی ایک ایسی ممتاز خاتون ناول نگار ہیں، جنھوں نے انگریزی فکشن کو بیش بہا مشترکہ روایات سے روشناس کرایا۔ انہوں نے تقسیم ہند کے جلو میں شکست خوردہ جاگیردارانہ نظام اور زوال پذیر تہذیب وثقافت کی اچھوتی ترجمانی کی ہے۔ زیر مطالعہ ناول "Sun Light on a Broken Column" میں مذکورہ مسائل کی حقیقت پسندانہ عکاسی نظر آتی ہے پیش نظر ناول ''سن لائٹ آن اے بروکن کالم'' اپنے موضوع اور انداز پیش کش کے لحاظ سے انگریزی ناول نگاری کی دنیا میں اپنی مثال آپ ہے۔ معروف ادیب ملک راج آنند اور انگریزی کے دوسرے ناقدین نے عطیہ حسین کی تخلیقی عظمت کا دل کھول کر اعتراف کیا ہے۔ ملک راج آنند نے عطیہ حسین کے ناول ''سن لائٹ آن اے بروکن کالم'' کو آزادی کے بعد شائع ہونے والا انگریزی کا عمدہ اور غیر معمولی ناول قرار دیا ہے۔

"Sun Light on a Broken Column" میں بیشتر مسائل ناول کی ہیروئن لیلیٰ کی نظر سے پیش کیے گئے ہیں۔ وہ ناول کے پلاٹ کی ترنگوں پر ہر جگہ اٹکھیلیاں کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ اردو کی معروف فکشن نگار خدیجہ مستور کے مشہور ناول 'آنگن' میں عطیہ حسین کے افکار ونظریات کی پرچھائیاں موجود ہیں۔ ناول "Sun Light on a Broken Column" کی مانند 'آنگن' میں لکھنؤ کے جاگیردارانہ نظام اور مشترکہ خاندان کے

زوال کی داستان بیان کی گئی ہے۔مصنفہ نے 1930 سے لے کر تقسیم کے بعد تک کے سماجی، تہذیبی اور سیاسی صورت حال کو پس منظر کے طور پر استعمال کیا ہے۔اردو ناول 'آنگن' میں بھی ایک وسیع تر پس منظر ملتا ہے۔عطیہ حسین نے قومی تحریک، کانگریس و مسلم لیگ کی سیاسی کشمکش اور تقسیم وطن کے زیر اثر مشترکہ خاندان اور جاگیردارانہ نظام کی تباہی کو تاریخی صداقت کے ساتھ پیش کیا ہے۔انھوں نے اس ناول کے پلاٹ کی بنیاد جاگیردار مسلم خاندان پر رکھی ہے۔نشان خاطر رہے کہ یہ ناول اس عہد میں مشترکہ خاندان پر لگنے والے گہن اور سیاسی و تہذیبی تاریکی کو حقیقت پسندانہ انداز میں بے نقاب کرتا ہے۔

عطیہ حسین کا یہ ناول لکھنؤ کے ایک ایسے جاگیردار خاندان کے زوال کا نقشہ پیش کرتا ہے، جس کی لیلیٰ چشم دیدگواہ ہے۔لیلیٰ اس ناول کی راوی اور ہیروئن ہے۔اس کی یادداشتوں کے سہارے ہی ناول کا پلاٹ آگے بڑھتا ہے۔ اردو ناول 'آنگن' کی ہیروئن عالیہ بھی 'سن لائٹ آن اے بروکن کالم' کی لیلیٰ کی طرح حالات واقعات کو تبدیل کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ مصنفہ نے اس خاندان کے سرپرست باباجان کی جاگیردارانہ روایات کی پستی و زبوں حالی کی مختلف جہتوں کی نقشہ کشی کی ہے۔ ناول نگار نے نہایت معروضی اور تاریخی صداقت کے ساتھ ان اسباب ومحرکات کی نشاندہی کی ہے۔

"Sun Light on a Broken Column" چار ابواب پر مشتمل ہے۔پہلا باب باباجان کے جاگیردار خاندان اور مشترکہ قدروں کو متعارف کراتا ہے۔ اس خاندان کے مختلف افراد اسلامی طرز زندگی کے پابند ہیں۔خاندان میں نماز، روزہ، تلاوت قرآن اور پردے کا سخت ماحول ہے۔ سید محمد حسن خاندان کے سرپرست ہیں۔ناول کی ہیروئن لیلیٰ انھیں باباجان کہہ کر پکارتی ہے۔عطیہ حسین نے سید محمد حسن یعنی باباجان کو "Traditional Feudalism" کی علامت کے روپ میں پیش کیا ہے۔ان کی وفات کے بعد یہ خاندان سیاسی، تہذیبی، مذہبی اور اقتصادی بحران کا شکار ہو جاتا ہے۔ بعض ناقدین کا خیال ہے کہ "Sun Light on a Broken Column" سوانحی طرز کا ناول ہے۔در اصل ہیروئن لیلیٰ کے کردار میں عطیہ حسین کی زندگی کا عکس واضح طور پر نظر آتا ہے۔اس ناول میں مصنفہ کی زندگی کے وسیع تر تجربات ومشاہدات اور اس کے عہد کی سماجی، سیاسی اور تہذیبی صورت حال کے گہرے نقوش موجود ہیں۔ظاہر ہے کہ گہرے تجربات ومشاہدات کے بغیر کسی بھی فن پارے کو شاہکار کا درجہ حاصل نہیں ہو سکتا۔ناول 'سن لائٹ آن اے بروکن کالم' کے حوالے سے چند داخلی اور خارجی شواہد بھی موجود ہیں۔انگریزی نقاد جین جسپر نے ناول کی ہیروئن لیلیٰ اور عطیہ حسین کی زندگی میں یکسانیت کا دلچسپ پہلو تلاش کیا ہے۔اس سلسلے میں انھوں نے مصنفہ کے جاگیردارانہ اقدار وروایات اور بیسویں صدی کی سیاسی، سماجی اور تہذیبی صورت حال کی روشنی میں اپنے مفروضات پیش کیے ہیں۔

عطیہ حسین کا یہ ناول لکھنؤ کے ایک ایسے جاگیردار خاندان کے زوال کا نقشہ پیش کرتا ہے، جس کی لیلیٰ چشم دیدگواہ ہے۔لیلیٰ اس ناول کی راوی اور ہیروئن ہے۔اس کی یادداشتوں کے سہارے ہی ناول کا پلاٹ آگے بڑھتا ہے۔ اردو ناول 'آنگن' کی ہیروئن عالیہ بھی 'سن لائٹ آن اے بروکن کالم' کی لیلیٰ کی طرح حالات واقعات کو تبدیل کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ مصنفہ نے اس خاندان کے سرپرست بابا جان کی جاگیردارانہ روایات کی پستی و زبوں حالی کی مختلف جہتوں کی نقشہ کشی کی ہے۔ ناول نگار نے نہایت معروضی اور تاریخی صداقت کے ساتھ ان اسباب و محرکات کی نشاندھی کی ہے۔

حامد، احمد، ماجدہ، عابدہ، کمال، سلیم، اسد، زاہد، زہرہ اور شاعرہ وغیرہ ناول کے دوسرے اہم کردار ہیں۔ حامد اور احمد سید محمد حسن کے صاحبزادے ہیں۔اپنے والد سید محمد حسن کی مرضی کے خلاف حامد اپنی بیوی شاعرہ اور بیٹے کمال وسلیم کے ساتھ یوروپ چلے جاتے ہیں۔ناول کی ہیروئن لیلیٰ احمد کی بیٹی ہے۔اپنے والد کے انتقال کے بعد لیلیٰ باباجان کے پاس رہتی ہے۔اس کی پرورش و پرداخت کی ذمے داری گھر کی نوکرانی حکیمن بوا سنبھالتی ہیں۔ ماجدہ اور عابدہ باباجان سید محمد حسن کی صاحبزادیاں ہیں۔بیوہ ماجدہ اپنی بیٹی زہرہ کے ساتھ اپنے میکے میں رہتی ہیں۔باباجان کی چھوٹی صاحبزادی عابدہ ابھی غیرشادی شدہ ہیں۔ اسد اور زاہد باباجان کے دور کے رشتے دار ہیں۔ناول کے پہلے باب میں تمام تر کردار ہمارے سامنے آتے ہیں۔عطیہ حسین نے کرداروں کی پیش کش میں ڈرامائی اور تشریحی دونوں انداز اختیار کیا ہے۔ناول کا آغاز لیلیٰ کی یادوں کے توسط سے ہوتا ہے۔ باباجان کا بستر مرگ پر پڑے رہنا دراصل جاگیردارانہ زوال کی جانب اشارہ کرتا ہے۔لیلیٰ کی زبان سے ادا ہونے والا یہ جملہ "Baba Jan had not much longer to live" قاری کو غم کی کیفیت سے دوچار کرتا ہے۔

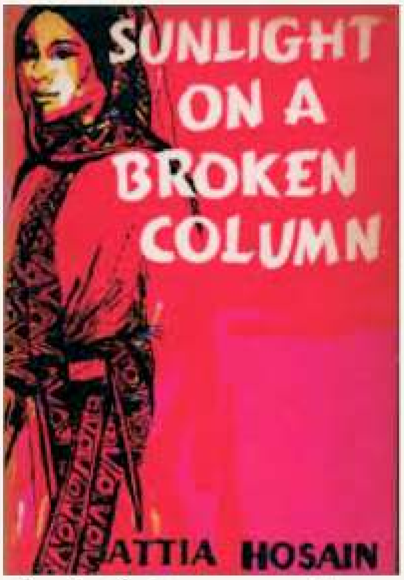

ناول کا دوسرا باب باباجان کے جاگیردار خاندان کی قابل رحم صورت حال کو آشکار کرتا ہے۔ باباجان کی وفات کے بعد ان کا مشترکہ خاندان شدید طور پر شکست وریخت کا شکار ہو جاتا ہے۔لیکن چچا حامد کی واپسی خاندان کو ایک نئی زندگی اور ایک نئی روشنی بخشتی ہے۔وہ خاندان کی بکھری ہوئی مختلف کڑیوں کو دوبارہ جوڑنے کی ہر ممکن کوشش کرتے ہیں۔چچا حامد مشرقی ومغربی روایات اور مشترکہ تہذیبی قدروں کے پروردہ ہیں۔وہ لیلیٰ کی تعلیم کے لیے راہیں ہموار کرتے ہیں۔وہ لیلیٰ کے حقوق اور اس کے ارمانوں کا خاص خیال رکھتے ہیں۔خاندانی زمین وجائداد میں لیلیٰ کی حصے داری کو بھی یقینی بناتے ہیں۔لیلیٰ اپنے رشتے دار اور تاریخ کے لیکچرر عامر حسین سے دل لگاتی ہے اور جلد ہی دونوں کی شادی بھی ہو جاتی ہے۔شادی کے تھوڑے دنوں بعد عامر اس دارفانی سے رخصت ہو جاتا ہے۔اسد محرم کے جلوس کے دوران ہونے والے فساد میں بری طرح زخمی ہو جاتا ہے۔یہ حادثہ فرقہ وارانہ تشدد اور مذہبی منافرت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔زاہد اور اسد اعلیٰ تعلیم کے حصول کی غرض سے خاندان سے دور چلے جاتے ہیں۔واضح رہے کہ باب دوم سے ہی خاندان کے زوال کی داستان شروع ہو جاتی ہے۔

تاریخ شاہد ہے کہ مسلم لیگ اور کانگریس کی سیاسی کشمکش ہزاروں خاندانوں کو متاثر کرتی ہے۔ایک ہی چھت کے نیچے زندگی بسر کرنے والے لوگ سیاسی کشمکش اور نظریاتی اختلاف کی بنا پر ایک دوسرے سے الگ ہو جاتے ہیں۔سیاسی چپقلش اور نظریاتی شدت پسندی ان کے درمیان دیواریں کھڑی کر دیتی ہے۔ تقسیم ہند پر مشتمل ناولوں کا مطالعہ ہمیں باور کراتا ہے کہ قیام پاکستان سے قبل ہی خاندانوں کے بکھرنے کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔عطیہ حسین کے فن پاروں میں تقسیم ہند کے نتیجے میں ہونے والے

بھیانک فرقہ وارانہ فسادات اور قتل وخون کی راست ترجمانی نہیں ملتی۔اس المیے کے خارجی اثرات سے قطع نظر انھوں نے بیش بہا تہذیبی اور ثقافتی قدروں کے زوال کی داستان بیان کی ہے۔ان کا ناول "Sun Light on a Broken Column"اس کی عمدہ مثال ہے۔اردو ناول ''آنگن''اور''دوگز زمین''میں بھی اس صورت حال کونمایاں انداز میں پیش کیا گیا ہے۔زیر مطالعہ ناول کا تیسرا باب باباجان کے خاندان پر پڑنے والے سیاسی اثرات کو حقیقت پسندانہ طریقے سے سامنے لاتا ہے۔سیاسی موضوعات پر ہونے والی گفتگو خاندان کے مختلف افراد کے درمیان دراڑیں ڈال دیتی ہے۔خاندان کاامن وسکون اوراتحاد سیاسی انتشار کی نذر ہو جاتا ہے۔ باباجان کے آنگن میں پنپنے والی سیاسی فضا خاندان کے انتشار کا اصل وجہ قرار پاتی ہے۔

عطیہ حسین نے برصغیر کے تبدیل شدہ سیاسی حالات، قومی تحریکات اور مسلم لیگ کے قیام جیسے واقعات کے تناظر میں زوال آمادہ جاگیردارانہ کلچر کو تخلیقی گویائی عطا کی ہے۔مصنفہ نے چچاحامد اوران کے بیٹے سلیم کے کردار کے پس پردہ اس عہد کی سیاسی ابتری کی عمدہ ترجمانی کی ہے۔عطیہ حسین نے اپنے ناول 'سن لائٹ آن بروکن کالم' میں اس عہد کی سیاسی ونظریاتی کشمکش کو جس تخلیقی توانائی اور تاریخی بصیرت کے ساتھ پیش کیا ہے،اس کی مثال انگریزی ناول کی روایت میں کہیں اورنظرنہیں آتی۔

سلیم کے والد حامد مذہبی رواداری اور ہندومسلم اتحاد میں یقین رکھتے ہیں۔وہ مسلم لیگ جیسی سیاسی جماعت کو شک کی نظر سے دیکھتے ہیں اوراسے فرقہ پرست جماعت قرار دیتے ہیں۔جبکہ ان کا بیٹا سلیم کانگریس سے سخت نفرت کرتا ہے۔وہ مسلم لیگ کے سیاسی نظریے کا حمایتی ہے۔سلیم مسلم لیگ کو اپنا اصل غم خوار اور ہمدرد سمجھتا ہے۔ وہ لیگ کے ہر قدم وہر فیصلے میں ایک بہتر اور روشن مستقبل کا خواب دیکھتا ہے۔وہ کانگریس کو مسلمانوں کا دشمن تصور کرتا ہے۔عطیہ حسین کی یہ سیاسی بصیرت ہمیں اردو ناول 'آنگن' اور'دوگز زمین' کے کرداروں کی یاد دلاتی ہے۔ عطیہ حسین، خدیجہ مستور اور عبدالصمد کے یہاں فکری وتخلیقی سطح پر حد درجہ یکسانیت نظر آتی ہے۔ناول 'سن لائٹ آن بروکن کالم' میں باپ اور بیٹے کے درمیان پیدا ہونے والی سیاسی ونظریاتی کشمکش کی مثال پیش خدمت ہے۔سلیم مسلمانوں کی بے بسی ولاچاری کی نمائندگی کرتا ہے۔وہ اپنے والد حامد کے سمجھانے کے باوجود مملکت خدا داد کا خیر مقدم کرتا ہے۔سلیم کے علاوہ پاکستان ہجرت کرنے والے دوسرے کرداروں میں زہرہ اورزاہد وغیرہ اہم ہیں۔ناول کے یہ کردار اس مخصوص عہد کے سیاسی انتشار کو آشکار کرتے ہیں۔ان کرداروں کے باطنی کرب واضطراب اورلاچاری ومجبوری سے اس عہد کی سیاسی اور سماجی پستی کا اندازہ لگانا چنداں مشکل نہیں۔

ناول "Sun Light on a Broken Column" کا آخری یعنی چوتھا باب تقسیم ملک کے زیراثر مشترکہ خاندان اور جاگیردارانہ نظام کی شکست وریخت کی حقیقی تصویریں پیش کرتا ہے۔تاریخ شاہد ہے کہ تقسیم وطن کے اعلان کے ساتھ ہی ملک کے طول وعرض میں فرقہ واریت کا زہر پھیل جاتا ہے۔قیام پاکستان کے بعد باباجان کا مشترکہ خاندان شدید طور پر متاثر ہوتا ہے۔سلیم اپنے روشن مستقبل کی تلاش میں پاکستان ہجرت کر جاتا ہے جبکہ اس کا بھائی کمال اپنی جاگیردارانہ قدروں کو سینے سے لگائے رکھتا ہے۔وہ کسی بھی صورت اپنی زمین اور مٹی سے الگ ہونا گوارانہیں کرتا۔سلیم اور کمال کے علاوہ ناول کے دوسرے اہم کردار اسداور زاہد بھی سیاسی انتشار کے سبب پر ایک دوسرے سے دور ہو جاتے ہیں۔اسد بابائے قوم گاندھی جی کے نقش قدم چلتا ہے جبکہ اس کا بھائی زاہد پاکستان کے سفر کے دوران کسی ٹرین حادثے کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس کی دردناک موت دراصل باباجان کی جاگیردارانہ قدروں کا المیہ ہے۔انگریزی فکشن نگار عطیہ حسین نے اپنے اس ناول کے توسط سے جاگیردارانہ روایتوں اور مشترکہ قدروں کی تباہی وبربادی کی بے حد عمدہ تصویرکشی کی ہے۔

عطیہ حسین کا ناول 'سن لائٹ آن اے بروکن کالم' زوال پذیر مشترکہ خاندان اور جاگیردارانہ کلچر کی مختلف جہتوں کو ایک نئے ڈسکورس کے ساتھ پیش کرتا ہے۔مصنفہ نے ناول کی ہیروئن لیلیٰ کی یادوں کے سہارے اپنا تخلیقی سفر طے کیا ہے۔زیر مطالعہ ناول میں 'آشیانہ' نامی حویلی کا ذکر موجود ہے۔'آشیانہ' لکھنؤ کی ایک ایسی شاندار حویلی ہے، جس میں جاگیردارانہ زندگی پورے آب وتاب کے ساتھ جلوہ افروز ہے۔دراصل عطیہ حسین نے 'آشیانہ' کو تہذیبی ثقافتی گہوارے کی شکل میں پیش کیا ہے۔ وہاں جاگیردارانہ زندگی کی تمام تر آسائشیں فراہم ہیں۔لیکن تقسیم ہند اور قیام پاکستان کے بعد باباجان کی قدیم جاگیردارانہ وراثت محفوظ نہیں رہتی۔'آشیانہ' نامی حویلی سیاسی تاریکی میں غرق ہو جاتی ہے۔ تقسیم کے المیے کے بعد 'آشیانہ' کے چند افراد ہندوستان سے ہجرت کر جاتے ہیں لیکن ملک سے دور رہ کر بھی ان کے دلوں میں 'آشیانہ' کی یادیں تاعمر تازہ رہتی ہیں۔ یہاں گزارے

عطیہ حسین نے برصغیر کے تبدیل شدہ سیاسی حالات، قومی تحریکات اور مسلم لیگ کے قیام جیسے واقعات کے تناظر میں زوال آمادہ جاگیردارانہ کلچر کو تخلیقی گویائی عطا کی ہے۔مصنفہ نے چچاحامد اور ان کے بیٹے سلیم کے کردار کے پس پردہ اس عہد کی سیاسی ابتری کی عمدہ ترجمانی کی ہے۔عطیہ حسین نے اپنے ناول 'سن لائٹ آن بروکن کالم' میں اس عہد کی سیاسی و نظریاتی کشمکش کو جس تخلیقی توانائی اور تاریخی بصیرت کے ساتھ پیش کیا ہے،اس کی مثال انگریزی ناول کی روایت میں کہیں اور نظر نہیں آتی۔

ہوئے شب وروزاور کسک آمیز حسین لمحات انھیں بے چین رکھتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ایک طویل عرصے کے بعد لیلیٰ،سلیم اور نادرہ 'آشیانہ' آنے پر مجبور ہوتے ہیں۔چودہ برسوں کی طویل مدت کے بعد لیلیٰ جب اپنی حویلی 'آشیانہ' میں قدم رکھتی ہے تو اسے اپنی جاگیردارانہ قدریں شدت سے یاد آتی ہیں۔اپنے حسرت ناک ماضی کو یاد کرکے اس کا دل تڑپ اٹھتا ہے۔ہیروئن لیلیٰ کی داخلی کیفیت کو عطیہ حسین نے نہایت پرسوز انداز میں پیش کیا ہے۔دراصل ناول 'سن لائٹ آن اے بروکن کالم' شاندار جاگیردارانہ روایات اور مستحکم ثقافتی قدروں کے ٹوٹنے بکھرنے کی ایک کسک آمیز داستان ہے۔

عطیہ حسین نے اپنی حسرت ناک زندگی کے گہرے تجربات ومشاہدات کو تخلیقی گویائی عطا کی ہے۔یہ ناول درحقیقت یادوں کا ایک ایسا کولاژ ہے، جس میں کڑی دھوپ اور بکھرے ہوئے خواب ہیں۔زیر مطالعہ ناول 'سن لائٹ آن بروکن کالم' کے فکری سروکار کی بنا پرانگریزی کے ناقد نودی کپاڑیا نے اسے "A work of nostalgia" سے تعبیر کیا ہے۔عطیہ حسین نے اپنے اس منفرد ناول میں تقسیم ہند کی تباہی وبربادی کو مسلم زاویہ نگاہ سے پیش کرنے کی عمدہ کوشش کی ہے۔مختصر یہ کہ باباجان کا شکستہ حال جاگیردار خاندان ایک ایسا صاف وشفاف آئینہ ہے، جس میں تقسیم کی زد میں آنے والے ہزاروں مسلم جاگیردار خاندان کی بربادی کی تصویریں واضح طور پر نظر آتی ہیں۔

■

Dr Mahboob Hasan
Asst. Professor
Department of Urdu
Deen Dayal Upadhyay Gorakhpur University
Gorakhpur- 273009 (UP)
Mobile: 8527818385

زیرِ لب

صفیہ اختر کی ایک سرگوشی جو گونج اٹھی

محبوب ثاقب

خط بے ریا تحریر اور منضبط دستاویزی حوالے کا نام ہے۔ یہ ایک اضطراری تحریر ہے جو اہتمام سے بے نیاز ہوتی ہے۔ خط مرسل کے دلی جذبات کا نمائندہ اور اس کی شخصیت و سیرت کا آئینہ ہوتا ہے۔ خطوط ہمارے شب و روز کے حادثات و واقعات، کلیات و جزئیات اور شمائل و خصائل کے عکاس ہوتے ہیں۔ خط کی سادگی، بے تکلفی اور بے آمیزی نے اسے ادبی صنف کا درجہ عطا کیا ہے۔ آج فنِ مکتوب نگاری غیر افسانوی ادب کی غیر معمولی صنف بن گئی ہے۔ یہ دو افراد کے مابین وہ تحریری گفتگو ہے جو نہ صرف ترسیل خیال کا بہترین وسیلہ ہے' بلکہ یہ ایک ایسا آئینہ بھی ہے جس میں صاحبِ تحریر کی شخصیت غیر محسوس طریقے سے اُجاگر ہوتی ہے۔

خط نویسی جب دو اہل زبان اور ذہین و طباع افراد کے درمیان ہو تو زبان و ادب کا سرمایہ بن جاتی ہے۔ اس کی اہمیت و افادیت میں چار چاند لگ جاتے ہیں۔ کیونکہ ان کے مطالعے سے ان کے فن اور شخصیت کی گتھیاں سلجھتی ہیں جو قاری کے لیے مسرت اور بصیرت کا موجب بنتا ہے۔ خط کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ اس میں خط نگار کے باطنی افکار و خیالات، مسائل و حالات، عادات و اطوار، نظریے و آرا، ہنر و فن، ان کی زندگی کی جذباتی و جمالیاتی کیفیات اور تلخ و شیریں لمحات بھی محفوظ ہوتے ہیں۔ دورانِ مطالعہ فن کاروں کے حقیقی مزاج و منہاج اور باہمی رشتے بھی مترشح ہوتے ہیں۔

کچھ خطوط تو ان فن کاروں کی نجی زندگی کے بعض ایسے گوشوں سے پردہ ہٹاتے ہیں جن کا کسی اور تخلیق یا کسی اور ذریعے سے ظاہر ہونا ممکن نہیں ہوتا ہے۔ اس لیے سید سلیمان ندوی نے خط کو دلی خیالات و جذبات کا روزنامچہ اور اسرارِ حیات کا صحیفہ قرار دیا ہے۔ مکتوباتی ادب کے معروف ناقد خورشید الاسلام تو اچھے خط کو ادبی کارنامہ قرار دیتے ہیں:

''اچھے خط ادبی کارنامے ہوتے ہیں... خط چھوٹی چھوٹی باتوں سے بُنے جاتے ہیں اور چھوٹی چھوٹی باتوں میں دنیا کا لطف ہے۔''

(تنقیدیں، خورشید الاسلام، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ص 9)

اچھا خط افسانہ یا غزل کے فن کی طرح اختصار میں جامعیت کا حسن رکھتا ہے اور جذبہ و احساس، سادگی و بے تکلفی اور سچائی و خلوص کی آئینہ داری کرتا ہے۔ جس طرح ہم افسانہ، ناول یا ڈراما، دلچسپی سے پڑھتے ہیں اسی طرح مکتوب کا مطالعہ بھی توجہ اور انہماک سے کرتے ہیں کیونکہ ان میں ناول کی انہماکی، افسانے کی یکسوئی اور ڈرامے کی لطف اندوزی پائی جاتی ہے۔ اس سلسلے میں اردو کے حوالے سے 'خطوطِ غالب، غبارِ خاطر، لیلیٰ کے خطوط، مجنوں کی ڈائری، حرفِ آشنا اور زیرِ لب بطورِ مثال پیش کیے جا سکتے ہیں۔

'زیرِ لب' صفیہ اختر کے خطوط کا وہ مجموعہ ہے' جسے جاں نثار اختر نے صفیہ اختر کی وفات کے بعد ترتیب دیا۔ 321 صفحات پر مشتمل اس کتاب میں فراق، رضیہ سجاد ظہیر اور کرشن چندر کی آرا کے ساتھ ساتھ جاں نثار اختر کی دو نظمیں 'خاکِ دل' اور 'خاموش آواز' شامل ہیں۔ اول الذکر نظم 1953 میں صفیہ اختر کی موت پر لکھنؤ سے جاتے ہوئے لکھی گئی تھی جبکہ موخر الذکر پہلی برسی پر 1954 میں جنوری کی ایک چاندنی رات میں صفیہ اختر کی مزار پر لکھی گئی ہے۔ کتاب (222) خطوط پر محیط ہے۔ یہ خطوط 22 دسمبر 1949 سے 29 دسمبر 1953 کے دوران صفیہ اختر نے جاں نثار اختر کے نام لکھے تھے۔ جاں نثار اختر نے صفیہ اختر کی وفات کے دو سال بعد 1955 میں ان خطوط کو یکجا کر کے شائع کیا۔

'زیرِ لب' میں شامل صفیہ اختر کے خطوط میں ان کی شخصیت اور فن دونوں اُبھر کر سامنے آتے ہیں۔ ان کی مکتوب نگاری حدیثِ دیگراں سے گزر کر حدیثِ زندگی کی عقدہ کشا بن گئی ہے۔ ان خطوط میں صفیہ اختر کی سلیقہ شعاری' شگفتگی، بلند نظری، اعلیٰ ظرفی' بلند حوصلگی' ادب فہمی اور تنقیدی شعور صاف طور پر دیکھے جا سکتے ہیں۔ یہی نہیں ان میں زندگی اپنی تمام تر جولانیوں اور رعنائیوں کے ساتھ رواں دواں نظر آتی ہے۔ صفیہ اختر کا اسلوب سادہ سلیس اور دلکش ہے۔ ظاہری تصنع اور تکلف کو برطرف رکھ کر انھوں نے نثر میں اپنا ایک علیحدہ رنگ پیدا کیا ہے' جو حسین، دلنشین اور نرالا ہے۔

صفیہ اختر اور جاں نثار اختر علی گڑھ میں زیرِ تعلیم تھے اسی دوران جاں نثار اختر کی ایک دوست اور غم گسار

فاطمہ زبیر نے صفیہ کو جاں نثار اختر سے متعارف کروایا تھا۔صفیہ پہلی ہی نظر میں جاں نثار اختر کے عشق میں ایسی گرفتار ہوئیں کہ زندگی بھر اس کے حصار سے باہر نہ نکل سکیں۔جاں نثار نے نہ صرف صفیہ کو پسند کیا بلکہ ان کے والدین کے پاس نکاح کا پیغام بھی بھیجا۔صفیہ کا تعلق متمول اور ادبی گھرانے سے تھا۔وہ اسرار الحق مجاز کی بہن تھیں۔مجاز کو یہ رشتہ پسند نہیں تھا لیکن بہن کی ضد کے آگے انہوں نے سر تسلیم خم کیا۔

25دسمبر 1943 کو صفیہ اور جاں نثار اختر رشتۂ ازدواج میں بندھ گئے۔یہ وہ زمانہ تھا جب ترقی پسند تحریک نے ادبی دنیا میں ہل چل مچادی تھی۔جاں نثار اختر بھی اس تحریک سے متاثر تھے اور شاعری میں اپنی شناخت بنا چکے تھے۔شادی کے بعد جاں نثار چار برس تک گوالیار میں اور صفیہ اختر علی گڑھ میں ملازمت کرتے رہے۔دونوں کو اپنی نو سالہ ازدواجی زندگی ایک ساتھ بسر کرنے کے بہت کم مواقع ملے۔ 1947 میں گوالیار کے حالات خراب ہوئے تو وہ دونوں بھوپال چلے آئے۔حمیدیہ کالج، بھوپال میں دونوں کو ملازمت ملی۔ان کی شادی کے بعد کا یہی ایک عرصہ تھا 'جس میں ان دونوں کو دو سال تک ایک دوسرے کی قربت حاصل رہی اور ازدواجی زندگی خوشگوار گزری۔ 1945 میں جاوید اختر اور 1946 میں اویس اختر جیسے دو پھول' ان کے 'گھر آنگن' میں کھلے۔زندگی آرام و آسائش سے گزرنے لگی تھی' کہ اسی دور میں حکومت کی جانب سے ترقی پسندوں پر کڑی نظر رکھی جا رہی تھی اور ان کی گرفتاریاں عمل میں آ رہی تھیں۔جاں نثار اختر ان حالات سے پریشان ہو گئے تھے۔ساتھ ہی اپنی ملازمت سے بھی مطمئن نہیں تھے۔اس وقت بمبئی میں ترقی پسندوں کا بڑا گروہ آباد تھا اور یہ شہر اشتراکی نظریہ رکھنے والوں کی آماجگاہ بن گیا تھا۔اس لیے جاں نثار اختر کو بمبئی میں کشش نظر آئی۔لیکن یہ وہ شہر ہے جہاں 'چلی تو چاند تک ورنہ شام تک' کے مصداق مستقبل بنتا ہے یا پھر بگڑتا ہے۔اپنے مستقبل کو بنانے کے لیے انھوں نے فلمی دنیا میں قدم رکھا۔اسے پورا کرنے کے لیے 1949 میں وہ ملازمت سے استعفیٰ دے کر اکیلے بمبئی آ گئے۔غمِ روزگار سے پریشان جاں نثار اختر صفیہ اختر کو تنہائی کے سمندر میں چھوڑ کر تلاشِ معاش میں بمبئی تو آ گئے لیکن' ابتدائی برسوں میں مایوسی اور ناکامی سے دوچار رہے۔اُدھر صفیہ اختر' جاں نثار اختر کے ہجر میں تڑپتی رہیں۔وہ جاں نثار اختر کو دل کی گہرائیوں سے چاہتی تھیں۔ان کے پاس جاں نثار اختر سے ہم کلامی کا موثر ذریعہ تھا' مکتوب نگاری۔اس لیے انھوں نے مکتوب نگاری کو اپنا وسیلہ' اظہار بنایا اور خطوط کے وسیلے سے اپنے دل کے غبار کو سپردِ قلم کرتی گئیں۔ اتنے خطوط لکھے کہ جب انھیں یکجا کیا گیا تو دو کتابیں بن گئی۔جو 'حرف آشنا' اور 'زیرِ لب' کے عناوین سے منصۂ شہود پر آئیں۔

صفیہ اختر ہر دو تین روز بعد ایک خط جاں نثار اختر کو لکھا کرتیں اور ان کے جوابی خط کا بڑی بے قراری سے انتظار کرتی تھیں۔ادھر جاں نثار اختر اپنے خواب کو حقیقت میں بدلنے میں اتنے مصروف ہو گئے تھے کہ کبھی صفیہ اختر کے کسی خط کا جواب دے دیا کرتے اور کبھی کبھی کئی کئی دنوں تک کوئی جواب نہیں لکھتے تھے۔صفیہ اختر تڑپ کر رہ جاتی تھیں لیکن وہ نہایت شاکر و صابر اور متین و امین بیوی ثابت ہوئیں۔خط کا جواب ملا تو شکر ادا کیا ورنہ صبر۔گویا ایک طرف شدت تھی دوسری جانب بے نیازی۔صفیہ اختر' اپنے شریکِ حیات کی پل پل کی خبر لینا چاہتی تھیں۔ زندگی کی ہر چھوٹی بڑی خوشیوں میں جاں نثار کو شریک کرنا چاہتی تھیں۔ایک خط میں نئے سال کا جشن منانا چاہتی ہیں تو شوہر کو لکھتی ہیں:

''یہاں ایک اداسی اور افسردگی کا دورہ ہے۔۔آج تو میں نے تمہاری یاد کو نئے سال کی آمد سے سنوارنا چاہا۔آخر یہ سوگواری کاہے کی؟میں نے سوچا''وہ آئیں نہ آئیں پر بجتی' گھر ہم کو آج سجانا ہے''مگر سچ جانو یہ دل تو بڑا ہی سرکش ہے کب قابو میں آنے والا ہے۔''

(زیرلب،صفیہ اکادمی،حیدرآباد 1955،ص 91)

مندرجہ بالا اقتباس کے اس جملے''مگر سچ جانو یہ دل تو بڑا ہی سرکش ہے کب قابو میں آنے والا ہے۔'' میں صفیہ اختر کی تنہائی، شدید بے چینی اور بے چارگی کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔اس میں ایک خاموش پیغام ہے۔بلا کا درد و کرب ہے۔صفیہ اختر زندگی کے ہر چھوٹے بڑے معاملے میں شوہر سے اجازت طلب کرتی ہیں۔گویا اس بات کا پورا پورا خیال رکھتی کہ جاں نثار اختر پر ان کی کوئی بات گراں نہ گزرے اور ان کی ازدواجی زندگی میں تلخیاں جگہ نہ بنالیں۔ایک خط میں گرمی کی تعطیلات میں جاں نثار اختر سے لکھنو آنے کی ضد کرتی ہیں لیکن وہ مصروفیت کے باعث منع کر دیتے ہیں تو کسی طرح ان کی جدائی کے درد کو کم کرنے اور اپنے بچوں کی خواہشات کو پورا کرنے کے لیے وہ جاں نثار اختر کی ایک رشتہ دار کے ساتھ نینی تال جانے کی اجازت طلب کرتی ہیں:

''جون میں حمیدہ وغیرہ نینی تال کا پروگرام بنا رہے ہیں تم اجازت اور خرچ دے سکو گے تو میں انھیں لوگوں کے ساتھ چلی جاؤں گی۔''

(زیرلب،صفیہ اکادمی،حیدرآباد، 1955،ص 40)

عورت کی یہ فطرت ہے کہ اسے اپنے شوہر کی کمائی سے خرچ کرنے میں ایک طرح کا اطمینان ہوتا ہے۔ حالانکہ مذکورہ مقام کی سیر کے لیے صفیہ اختر کی پاس خود کی کمائی کے پیسے ہونگے کیوں وہ خود ملازمت کیا کرتی تھیں' لیکن شاید شوہر کی کمائی سے خرچ کرنا ایک الگ طرح کی خوشی اور شان مہیا کرتا ہے۔اس خط کے جواب میں جب جاں نثار اختر نے ناراضگی کا اظہار کیا تو اسی سلسلے میں اگلے خط میں لکھتی ہیں:

''تم کتنی آسانی سے اپنا جی کڑھا لیتے ہو دوست! میرا پروگرام وہی ہو سکتا ہے جو تم بناؤ گے نہ کہ میرا اپنا بنایا ہوا۔''''اگر تم نینی تال آنے پر راضی ہوئے' تو جاؤں گی ورنہ ہرگز نہیں جاؤں گی لکھنو میں رہوں گی تاکہ تم میرے پاس آکر کچھ دن اور گزار سکو۔''

(زیرلب،صفیہ اکادمی،حیدرآباد، 1955،ص 40)

صفیہ اختر ایک ہندوستانی عورت کے ایثار و قربانی کی عمدہ مثال تھیں۔فلمی دنیا میں جب جاں نثار اختر ابتدائی دنوں میں ناکام رہے تھے، ایسے وقت میں صفیہ اختر انھیں حوصلہ عطا کرتی رہتی تھیں۔ان کی بلند حوصلگی اور اعلیٰ ظرفی کی ایک مثال زیرِ لب کے ایک خط سے یہاں پیش کی جاتی ہے:

''میں تم سے علاحدگی کے دن پوری ہمت اور پورے استقلال سے گزار لوں گی۔کالج کی دنیا اور گھر کی دنیا بھی کچھ تو میرے لیے اجڑ گیا، مگر اختر بہت سے لوگ تو ہم سے بھی زیادہ پریشانیاں اٹھا رہے ہیں۔ہمیں تو ان کی طرف دیکھنا ہوگا۔اپنے غم کو میں طول نہیں دوں گی۔''

(زیرلب،صفیہ اکادمی،حیدرآباد، 1955،ص 61)

صفیہ اختر کے خطوط کی ایک خوبی یہ ہے کہ ان میں جذبات نگاری کی عمدہ مثالیں ملتی ہیں۔خط لکھنے کا انداز بھی نرالا ہے۔حد درجہ بے تکلفی اور سادگی میں ہنرمندی ان خطوط کا خاصہ ہے۔جذبات نگاری حقیقی ہو تو اس میں دل کشی اور دل نشینی آ ہی جاتی ہے۔صفیہ اختر کے خطوط میں یہ کہیں بھی بے حیائی نہیں بنتی۔انھوں نے اس طرح کی تحریر لکھی ہے کہ قاری کو ان سے ہمدردی ہو جاتی ہے۔جاں نثار اختر سے ان کی بے پناہ محبت ان کے ان خطوط میں کئی جگہ قاری کو غمگین بنا دیتی ہے اور وہ یہ کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ کاش۔۔۔ان کی یہ دوری ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جاتی! ان کی جذبات نگاری کو ان دو مثالوں سے محسوس کیا جا سکتا ہے۔

''آؤ تمھاری پیشانی پر ایسا پیار کرلوں جس میں ماں کی شفقت، بہن کا فخر، بیوی کا ایثار اور دوست کی ملائمت سبھی شامل ہو۔ میری جان! اف''

(زیرلب، صفیہ اکادمی، حیدرآباد، 1955، ص 13)

دوسری مثال بھی دیکھیے:

''تمھیں پاکر پھر مجھے زندگی میں کسی کی بھی ضرورت باقی نہ رہی، کتنی بھٹکی ہوئی زندگی، کتنے متلاشی جذبات کو پناہ مل گئی۔ اختر!''

(زیرلب، صفیہ اکادمی، حیدرآباد، 1955، ص 66)

صفیہ اختر کا ادبی شعور نکھرا ہوا تھا جس کی جھلک ان کے خطوط میں دیکھی جاسکتی ہے۔ ترقی پسندوں کی ادبی محفل میں ایک مرتبہ کرشن چندر اور مہدی نے جاں نثار اختر کی نظم 'ستاروں کی صدا' پر اپنے تاثرات میں توہم پرستی کا الزام لگایا تو صفیہ اختر سے رہا نہ گیا انھوں نے نہ صرف جاں نثار کی اس نظم کی حمایت کی بلکہ کرشن چندر کے افسانے کا حوالہ دیتے ہوئے اس میں توہم پرستی کو ہوا دینے والی کیفیت کی نشاندہی بھی کی۔ ملاحظہ فرمائیں ان کے ادبی شعور کی یہ مثال:

''تمھاری نظم پر کرشن اور مہدی کا اعتراض جو تم نے لکھا ہے میری سمجھ میں نہیں آیا۔ بعض وقت انجمن میں عجیب الٹی سیدھی بحثیں ہوتی ہیں۔ کرشن اور مہدی کا اعتراض تمھاری نظم پر کسی طرح صادق نہیں آتا... تم نے اوہام پرستی کو بنیاد ضرور بنایا ہے لیکن اس کا غلط استعمال نہیں کیا بلکہ اوہام کو یہ توڑتی ہے۔ کرشن کو میں بڑا افسانہ نگار مانتی ہوں لیکن اس کی سخن فہمی کی میں قائل نہیں اور اختر تم کرشن سے ضرور پوچھنا کہ ان کے افسانے 'بت جاگ گئے ہیں' سے توہم پرستی پھیلتی ہے یا نہیں''

(زیرلب، صفیہ اکادمی، حیدرآباد، 1955، ص 99,100)

جاں نثار اختر نے جب ان خطوط کو شائع کیا تو تاثرات و اعتراضات کے لیے دروازے کھل گئے۔ جاں نثار اختر نے اپنے ہم عصروں کی آرا کو بھی خطوط کے اس مجموعے میں شائع کیا ہے۔ جن فنکاروں کی آرا اس مجموعے میں شامل ہیں وہ جاں نثار اختر کے قریبی احباب ہیں۔ ان میں خصوصی طور پر یہاں، رضیہ سجاد ظہیر، کرشن چندر، اور فراق گورکھ پوری کی آرا اہمیت کی حامل ہیں۔ فراق نے صفیہ اختر کے اسلوب بیان، ظرافت، ان کی نیک مزاجی اور صداقت و خلوص' کو قدر اول کی چیزیں قرار دیا ہے:

''ذاتی تعلقات اور گھریلو زندگی سے متعلق شوہر کے نام بیوی کے خطوط میں انسانیت کی اتنی قدریں' مانوسیت و ہم آہنگی کی اتنی پاکیزہ مثالیں' اسلوب بیان کی بے تکلفی' خلوص و صداقت' نیک مزاجی اور بلند کرداری کی اتنی جھلکیاں' ظرافت کا نمک' صحیح معنوں میں جیون ساتھی کا لب و لہجہ' جس طرح یہ قدر اول کی چیزیں اس کتاب میں موجود ہیں شاید ہی اردو یا کسی بھی زبان میں شوہر کے نام بیوی کے خطوط کے کسی دوسرے مجموعے میں نظر آسکیں'' (زیرلب، صفیہ اکادمی، حیدرآباد، 1955، ص 4)

رضیہ سجاد ظہیر نے صفیہ اختر کو شہید کا درجہ دیا ہے۔ ازدواجی زندگی کی چار دیواری میں رہ کر یہ فن کار و جس طرح حیات و ممات کی کشمکش کا شکار ہو کر اپنی جان کھو بیٹھیں' وہ دعوت فکر دیتا ہے۔ زیرلب میں شامل ان کا یہ تاثر ملاحظہ فرمائیں:

''مجھے معلوم ہے صفیہ ان حالات کا شکار ہوئی جن میں ابھی زندگی کی رگیں کھنچ رہی ہیں۔ سانس پھول رہی ہے جسم پسینہ پسینہ ہے لیکن زندہ جاوید ہیں وہ لوگ جنھوں نے موت اور حیات کی اس کشمکش میں حیات کو زندہ رکھنے کی جدوجہد کے واسطے اپنا خون دیا۔ صفیہ بھی ان گمنام ان گنت شہیدوں میں سے ایک ہے۔''

(زیرلب، صفیہ اکادمی، حیدرآباد، 1955، ص 7)

کرشن چندر اپنے تاثرات میں لکھتے ہیں کہ اگر آج صفیہ اختر زندہ ہوتی تو عصمت اور ہاجرہ کی طرح ہمارے ادب کے ماتھے کا دلنواز جھومر ہوتی۔ ان کہنا ہے کہ انھوں نے ان خطوط کے مطالعے کے بعد محسوس کیا کہ صفیہ اختر میں ایک سچا فن کار تھا جو اپنے جذبات کی عکاسی میں مہارت رکھتا ہے۔ وہ اس سلسلے میں رقم طراز ہیں:

''ان خطوط میں ایک ہندوستانی گھرانے کی تصویر ملتی ہے۔ یہاں بچوں کا ذکر ہے اور نوکروں کا' گاؤتکیوں اور فرش پر بچھی ہوئی چاندنیوں کا' تخت پوشوں کا' سرخ بلاؤزوں کا اور سفید ساڑھیوں کا۔ ان خطوط میں جاوید اور اولیس کی معصوم شرارتیں ہیں اور ایک مجبور شوہر پرست بیوی کے متلاطم جذبات ہلکورے لیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔'' (زیرلب، صفیہ اکادمی، حیدرآباد، 1955، ص 11)

اسی خط میں کرشن چندر نے جاں نثار اختر کی حالت پر افسوس کرتے ہوئے آگے لکھا ہے:

''صفیہ کے خطوط کو پڑھ کر پہلا احساس یہ ہوا' کہ کس قدر خوش نصیب ہو تم اور پھر یہ جان کر کہ صفیہ اب اس جہاں میں نہیں ہے' فوراً یہ احساس ہوا کہ کس قدر غم نصیب ہو تم کہ صفیہ ایسی جاں نثار بیوی تم سے جدا ہوئی۔''

(زیرلب، صفیہ اکادمی، حیدرآباد، 1955، ص 10)

صفیہ اختر کے ان خطوط کی اشاعت پر مختلف اعتراضات بھی کیے گئے ہیں کہ ان میں نجی اور ذاتی زندگی کی باتیں ہیں ان راز و نیاز کی باتوں کو شائع کر کے اس طرح اجاگر نہیں کرنا چاہیے تھا۔ چند برس قبل صفیہ اختر کی برسی کے موقعے پر انتظار حسین صاحب کا ایک مضمون نظر نواز ہوا جس میں انھوں نے صفیہ اختر کی سہیلیوں کے تاثرات مقتبس کیے ہیں۔ اس میں صفیہ اختر کی قریبی سہیلی سلما شان الحق لکھتی ہیں:

''یوں محسوس ہوتا ہے وہ کسی انسان سے نہیں دیوار سے مخاطب ہے۔ وہ غیور لڑکی اپنے دل کے داغ کسی کو کیوں دکھاتی۔ یہ تو یوں کہیے کہ ایک خود کلامی کی کیفیت ہے جسے عالم خیال میں وہ سپرد قلم کرتی گئی ہے۔''

(مضمون 'صفیہ اختر کی سہیلی کیا کہتی ہے' انتظار حسین، نیوز ایکس پریس، مورخہ 23 مئی 2014)

اسی مضمون میں انتظار حسین نے صفیہ اختر کی ایک اور سہیلی سعیدہ قدوائی کے قول کو مقتبس کیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں یہ اقتباس:

'' اتنے دن سے اس کے مزار ہی کی تو تیاری ہو رہی تھی۔ سو وہ پوری ہو گئی۔ مزید کسی تکلف کی ضرورت نہیں۔ جائیے جائیے۔۔ اٹھا لے جائیے۔' یہ کتاب میں ہرگز نہیں خریدوں گی' ہرگز نہیں پڑھوں گی۔''

(مضمون 'صفیہ اختر کی سہیلی کیا کہتی ہے' انتظار حسین، نیوز ایکس پریس، مورخہ ۲۳ مئی 2014)

یہ اس طرح کے اعتراضات ہیں جنھیں ہم غصے اور غم کی حالت میں زبان سے نکلے ہوئے جذبات سے تعبیر کرسکتے ہیں۔ قصہ مختصر یہ کہ 'زیرلب' کے مطالعے کے بعد جو نتیجے اخذ کیے جاسکتے ہیں وہ دلچسپی سے خالی نہیں ہیں۔ ان خطوط میں ہندوستان کے 'گھر آنگن' کی ایک وفاشعار عورت اپنی سچی لگن اور حقیقی تڑپ کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ ان میں گھریلو زندگی کا سکھ دکھ، باہمی رفاقت، شکوے شکایتیں، روٹھنا منانا، روز مرہ کی مصروفیتیں، بچوں کی شرارتیں، ان کی خوبیاں، مستقبل کے تعلق سے اندیشے، گھر کے نوکروں کی شکایتیں، صفیہ اختر کے کالج کے پروگرامس، ان کی بیماری، علاج، محبت کا فطری انداز، ہجر کی تڑپ، ازدواجی زندگی کے متنوع رنگ، اعجاز و انکسار سب کچھ موجود ہیں۔ علاوہ ازیں ان خطوط میں صفیہ اختر کا ادبی شعور اور ان کی شخصیت کے مختلف پہلو سامنے آتے ہیں اور خطوط نگاری میں ان کی فنی مہارت بھی جلوہ گر ہوتی ہے۔

■

Dr.Shaikh Maheboob (Maheboob Saqib)
H.No.5494, Khair Nagar
Udgir-413517 (MS)
maheboobskn@rediffmail.com

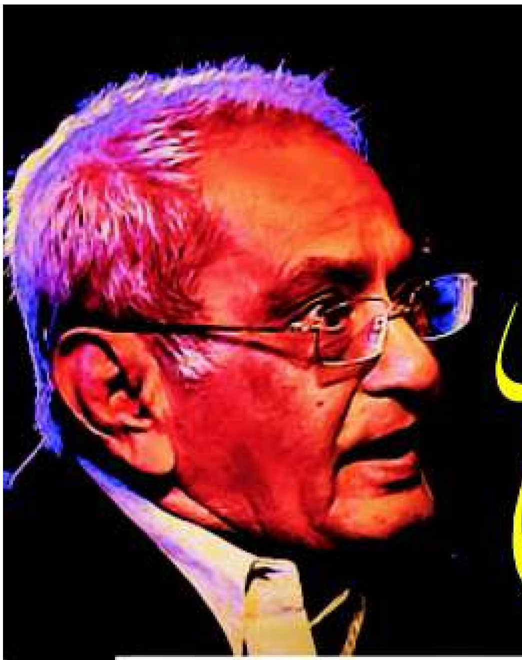

قمر جہاں نصیر

گمشدہ معصومیت کا متلاشی محمد علوی

چھوڑو پرانے قصوں میں کچھ بھی دھرا نہیں
آؤ تمھیں بتائیں کہ علوی نے کیا کیا

محمد علوی کا یہ شعر ہی ان کے شعری رویے کی طرف اشارہ کرنے کے لیے کافی ہے۔ انھوں نے اس عہد میں ہوش سنبھالا جب ادبی منظرنامے پر ترقی پسندوں کا طوطی بول رہا تھا۔ کوئی تعجب خیز امر نہ ہوتا اگر وہ اس عہد کے مروجہ ادبی طریق کار پر چلتے ہوئے اشتراکیت اور رومانیت کے سنگم پر کھڑے نظر آتے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اسی عہد میں 'میں گوتم نہیں ہوں' اور 'سوداگر' جیسی نظموں میں نئے آدمی کا ذہنی انتشار، اس کی جلاوطنی اور گھریلو زندگی میں بن باس جیسی کیفیات کو 'گوتم' اور 'سوداگر' کی علامتوں کے ذریعے پیش کرنے والے شاعر خلیل الرحمٰن اعظمی کے پہلے مجموعۂ کلام کاغذی پیرہن میں بھی ہمیں 'تذکرہ دہلی مرحوم کا'، 'لہو کی زنجیر' اور 'شام اودھ' جیسی سیاسی نوعیت کی نظمیں ملتی ہیں۔ (خلیل الرحمٰن اعظمی کی مثال دینے کا جواز یہاں پر زمانی یکسانیت ہے کیونکہ خلیل الرحمٰن اعظمی اور محمد علوی دونوں کا سنہ پیدائش 1927 ہے) یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اس قسم کی شاعری میں سیاسی و سماجی شعور کے ساتھ ترقی پسندی اور رومانی عناصر ہوتے ہیں۔ اس شاعری کی تاریخی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن ہوتا یہ ہے کہ ایسی شاعری جو ہنگامی مسائل کی پیداوار ہوتی ہے ان مسائل کے ختم ہونے کے ساتھ ہی اپنی چمک دمک بہت جلد ہی کھو دیتی ہے۔ یہ شاعری خیالات کے خارجی ٹکراؤ سے وجود میں آتی ہے جب کہ جدید نظم میں شاعر کے مشاہدات و تجربات، غور و فکر کے ایک نئے زاویے کے ساتھ سامنے آتے ہیں اور شاعر مروجہ نظام سے بے اطمینانی کی صورت میں اپنی ہی ذات میں جب ڈوبتا ہے تو احمد ندیم قاسمی کی 'شام' اور فیض کی 'تنہائی' جیسی لازوال نظمیں وجود میں آتی ہیں۔

محمد علوی داخلی لہجے کے شاعر ہیں۔ ان کی شعری کائنات ان کی اپنی ہے جس میں اشیا اور مظاہر یوں ترتیب پاتے ہیں کہ کسی جہان دگر کا حصہ معلوم پڑتے ہیں۔ محمد علوی معاشرتی حقیقتوں کو جدید شاعر کی زیرک آنکھ سے دیکھتے ہیں۔ چنانچہ وہ ایک معلوم حقیقت کی نقاب کشائی کچھ اس انداز سے کرتے ہیں کہ زندگی کی کسی دوسری مماثل حقیقت کی غمازی ہونے لگتی ہے۔ معرب و مفرس زبان سے کوسوں دور عام بول چال کے لہجے اور تراکیب میں بالکل سامنے کی بات اتنے انوکھے انداز میں اور اتنی سہولت سے کہہ جاتے ہیں کہ قاری سر دھنتا رہ جائے۔ لیکن مانوس الفاظ یا مانوس تشبیہات و استعارات کی بنیاد پر اس نتیجے پر پہنچنا کہ محمد علوی کی شعری کائنات میں آباد دنیا انتہائی سادہ اور مانوس ہے، انتہائی غلط اور بدمذاقی ہے کیونکہ شاعر لفظ کا موجد نہیں بلکہ زبان کا خالق ہوتا ہے اور تخلیقی عمل جینوئن فنکار سے، برتی ہوئی باتوں اور لفظوں کو ایک نئی سطح پر برتنے کا تقاضا کرتا ہے۔ برتی ہوئی باتوں اور لفظوں کو ایک نئے انداز میں برتنے کا یہ عمل محمد علوی کے یہاں بکثرت نظر آتا ہے۔ محمد علوی کے یہاں برتے ہوئے الفاظ اور تشبیہات کو نئی سطح پر برتنے کی ایک مثال 'ہوا' ہے۔ کلاسیکی شاعری میں 'ہوا' کا استعمال بکثرت ہوا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ ہوا کے مختلف اشکال و مدارج ہوتے ہیں جن کی بنا پر یہ کبھی صرصر ہے تو کبھی صبا، کبھی نسیم ہے تو کبھی سموم یعنی ہوا کے مختلف روپ ہیں وہ کہیں تعمیر کی علامت ہے تو کبھی تخریب کی لیکن یہی ہوا جب محمد علوی کی شعری کائنات میں داخل ہوتی ہے تو ایک الگ ہی روپ میں نظر آتی ہے۔ ان کی نظم 'ہواؤں کے گھر' ملاحظہ ہو:

ہوا یوں تو ہر دم بھٹکتی ہے لیکن/ ہوا کا بھی گھر ہے/ بھٹکتی ہوا/ جانے کتنی دفعہ/ شہد کی مکھیوں کی طرح/ گھر میں جاتی ہے اپنے/ اگر یہ ہوا/ گھر نہ جائے تو سمجھو/ کہ اس کے لیے گھر کا دروازہ وا/ پھر نہ ہوگا کبھی / اور اسے اور ہی گھر بنانا پڑے گا/ یہ ہم اور تم / اور کچھ بھی نہیں ہیں/ ہواؤں کے گھر ہیں/ ہواؤں کے گھر- ہواؤں کے گھر۔[1]

ہوا کی مختلف خصوصیتوں کو اردو کے قدیم اور جدید شعرا نے بڑی خوبی سے اجاگر کیا ہے۔ قدیم شعرا نے جہاں استعارہ تشبیہ اور محاورے کے طور پر اس کی خارجی صفات کو قید کرنے کی کوششیں کیں وہیں جدید شعرا نے ہوا کو ایک فعال علامت کے طور پر استعمال کیا اور اس کے داخلی صفات کو توجہ کا مرکز سمجھا۔ نتیجتاً فطرت کے خارج اور انسان کے داخل کے درمیان بہت سے نئے رشتے استوار ہو گئے۔ جدید شعرا میں سے ضیا جالندھری کے یہاں 'سرخ ہوا' (سرخ ہوا) ظلم جبر اور استحصالی طاقتوں کا مجسم روپ دھار لیتی ہے جب کہ منیر نیازی کے یہاں (نظم صدا بصحرا) ہوا اسرار، خوف اور موت کی علامت ہے لیکن محمد علوی نے اس نظم میں 'ہوا' کو سانس کی علامت بنایا ہے۔ گرچہ محمد علوی مادی زندگی سے بلند نہیں ہو سکے تاہم انھوں نے ہوا کو ایک بالکل مختلف معنی میں پیش کیا ہے جس کا اعتراف ضروری ہے۔ ایک اور نظم 'ہوا' میں ہوا کو ایک نامہ بر کا روپ عطا کیا گیا ہے لیکن یہ نامہ بر کلاسیکی شعرا کے نامہ بر سے مختلف ہے کلاسیکی شاعری میں نامہ بر بیش تر اوقات مونس و غمخوار، ہمدم و ہمراز ہوتا ہے تو کبھی محبوب کے حسن کرشمہ ساز کا اسیر ہو کر رقیب کا روپ بھی اختیار کر لیتا ہے لیکن محمد علوی کے یہاں یہ قاصد ہمدم و ہم ساز نہیں بلکہ ہرجائی کا روپ دھار لیتا ہے۔

جانے تجھ تک پہنچی ظالم، تجھ تک چٹھی لائی
یا پھر اور ہی دوارے جا کر دے آئی ہرجائی
(ہوا)

محمد علوی کا اسلوب بہت سادہ نظر آتا ہے۔ ان کی سیدھی سادی منطق میں کوئی الجھاؤ یا پیچیدگی نظر نہیں آتی، ساتھ

ہی ان کے شعری اظہار میں شاعر اور قاری کے مابین دوئی مٹ جاتی ہے۔ ان کی نظموں میں کسی تہہ داری اور معنوی دبازت کی تلاش کرنا درست نہیں کیونکہ محمد علوی کی نظمیں بیش تر ابہام کی منطق سے گریز کرتی ہیں۔ ان کے یہاں مشاہدے اور احساس کی فراوانی ہے۔ محمد علوی کی بیش تر نظمیں متحرک فلم کی مانند ہماری نگاہوں کے سامنے سے گزرتی ہیں وہ نظموں میں اپنے احساسات کو پیش کرتے ہوئے غیر مرئی احساسات و کیفیات اور بے جان اشیاء کی تجسیم یوں کرتے ہیں کہ قاری خود کو ایک نئی انوکھی دنیا کی سیر کرتے ہوئے پاتا ہے۔ نظم 'پربت' ملاحظہ ہو۔

اجلی اجلی جھیل کو پہلو میں رکھ کر
اپنا چہرہ دیکھ رہا ہے اک پربت
اپنے آپ میں گم صم کھویا کھویا سا
جانے کب سے بیٹھا ہے آئینہ لیے
جانے کب سے جھیل بنی ہے آئینہ
جانے کتنے موسم آئے اور گئے
جھیل نہ جانے کب کب ابھری اور چھلکی
کب کب سمٹی، سکڑی، تہہ میں بیٹھ گئی
کتنے پودے نکلے، جھومے، سوکھ گئے
کتنے پھول کھلے مرجھائے ٹوٹ گئے
کتنے پنچھی آئے ٹھہرے لوٹ گئے
پربت سب سے بے پروا کھویا کھویا
اجلی اجلی جھیل کو پہلو میں رکھ کر
اپنا چہرہ دیکھ رہا ہے کیوں اب تک

(پربت)[2]

کائنات میں نئے معانی کی تلاش علوی کا شعری رویہ ہے۔ ان کا یہی رویہ ہمارے مشاہدے اور تجربے میں ایک عام اور ناقابل التفات سی شے کی طرح بے جان پربت میں نئی روح پھونک دیتا ہے۔ محمد علوی بظاہر روزمرہ کی باتوں میں کوئی ایسی بات نکال لیتے ہیں کہ قاری حیرت زدہ رہ جاتا ہے اور اس وقت احساس ہوتا ہے کہ ان کے تجربے نہ تو عام انسان کے ہیں اور نہ کسی عام شاعر کے۔ اس نظم میں بھی ان کا یہی طریق کار ہے ہم نے دیکھا کہ پھول کھلنا، مرجھانا اور ٹوٹ جانا، پودوں کا نکلنا اور سوکھ جانا، پنچھیوں کا آنا اور لوٹ جانا یہ سب بظاہر عام سے مشاہدات و تجربات ہیں لیکن اجلی جھیل کو پہلو میں رکھ کر اپنا چہرہ دیکھنا اور آخری مصرعے کے 'اپنا چہرہ دیکھ رہا ہے کیوں اب تک' کے انشائیہ لہجے نے نظم کو معنوی دبازت سے ہمکنار کیا ہے۔ اس سوال میں ایسی معصومیت اور تحیر در آیا ہے جو ان کا ہی خاصہ ہے۔ محمود ہاشمی کے خیال میں:

رلکے (Rilke) کی طرح محمد علوی کا مقصود معصومیت کا تحفظ ہے جو آج کے آہنی اور ایٹمی عہد میں ریاکاری، عیاری، قوت، سیاست اور مہیب و وحشت ناک ہوش مندی کی زد میں ہے... زندگی کی سفاک قوتوں کی دھوپ اور اپنے معصوم خوابوں کی تتلیوں کے درمیان ایک جدلیاتی رابطہ پیدا کرنا، اپنے خارج کی زندگی اور داخلی احساس کے درمیان ایک رابطہ کو بحال کرنا، رلکے کے بعد محمد علوی کا کارنامہ ہے۔ 'دھوپ اور تتلیوں' کی یہ علامت محمد علوی کی تیسری کتاب میں غالباً سب سے زیادہ نمایاں اور تحرک خیز علامت ہے۔ یہ علامتیں کئی نظموں اور غزلوں کے اشعار میں بار بار نمودار ہوتی ہیں۔[3]

محمد علوی کے یہاں استعارات وتشبیہات کی کارفرمائی زیادہ نظر آتی ہے تاہم ان کی کچھ نظموں میں علامتوں کا بہت کامیاب استعمال کیا گیا ہے۔ ان کی نظموں میں علامتوں کا دائرہ مختلف ہے۔ علوی رومان، جنس اور نفسیاتی پیچیدگیوں کے اظہار کے لیے جو شعری انداز اختیار کرتے ہیں اس میں فلسفہ وفکر کی گہرائیاں اور ماورائیت کے عناصر کم ہیں اور موجودہ زندگی کے عام معمولات اور واقعات کے رخ پر ان کی معصوم مگر بیباک نظر زیادہ ٹھہری ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ شاید اسی وجہ سے علامات و استعارات کی نئی سمتیں ان کی نظموں میں دور دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔ علوی کے یہاں زندگی کا خوف 'ڈریکولا' کی علامت میں ظاہر ہوتا ہے اور 'خوشبو' اور 'تتلی' کی علامتوں میں حسن اور جنس کی لطافتوں کا اظہار ملتا ہے۔ صحرائی تمدن کی وحشیانہ حرکات اور رومانی، جبلی اور نفسیاتی کیفیات کی جانب ان کا ذہن زیادہ فعال ہے۔ یہ وہ ذہن ہے جو انسان کے وضع کردہ تمام ضابطوں کا منکر ہی نہیں بلکہ ان میں گھٹن محسوس کرتا اور اپنی نئی آزاد دنیا کا طالب ہے جہاں فطرت کی حسین اور سادہ آغوش میں مصنوعی اصولوں کو توڑ کر وہ دلی اور روحانی احساسات کا جواز پا سکے۔ روشنی، جزیرہ، جھیل، پہاڑ، پیڑ کی چھاؤں، بکری کا بچہ، معصوم لڑکی کا میمنے کو گود میں لے کر چومنا، حبشی کا سیاہ بھالا، ریت، سراب، سرد ہوا، راستے کا چراغ،... علامتوں میں علوی نے رومان، جنس اور زندگی و معاشرے کی سنگینی اور اس کے کھوکھلے پن کو واضح کیا ہے۔ محمد علوی کی نظموں کو پڑھ کر یہ احساس ہوتا ہے گویا شاعر نے کوشش اور زور کے بغیر بہت سہج اور آسان انداز میں شعر کہہ دیا ہو۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ ایسی شاعری کرنے کے لیے خاص مشق اور تفکر درکار ہوتا ہے۔ ایک نظم ملاحظہ ہو۔

ایک آنکھ تھی/ آدھے لب تھے/ اور اک چوٹی لمبی سی/ ایک کان میں چمک رہی تھی/ چاندی بالی پڑی ہوئی/ ایک حنائی ہاتھ تھا جس میں/ لال کانچ کی چوڑی تھی/ ایک گلی میں دروازے سے/ جھانک رہی تھی اک لڑکی/ جانے کون گلی تھی اب میں/ چھان رہا ہوں گلی گلی۔ تلاش۔[4]

بلراج کومل کو اس پیکر حسیں میں امید کا چہرہ یا کوئی خواب گم گشتہ نظر آتا ہے۔ لکھتے ہیں:

یہ پیکر حسیں، یہ شبیہہ، یہ بچھڑا ہوا چہرہ کھوئی ہوئی امید کا چہرہ ہے یا خواب ہے۔ بار بار علامتوں کا روپ اختیار کرتا ہے کبھی کسی ننھے منے معصوم بچے کا، کبھی کاگا کا کبھی نیم وا دریچے کا، کسی روزن کا اور کبھی اندیشے کا یعنی کالی بلی کا۔ یہ گڑیوں کا گھر جانے کب منہدم ہو جائے۔ کالی بلی رات گئے جانے کس سے ملنے آ جائے۔ محمد علوی کی اکثر نظموں میں انہدام حسن و معصومیت کا خوف لرزاں ہے اور ان کا دل حسن و معصومیت کی عمر جاوداں کے لیے دعائیں کرتا ہے۔ بچہ ان کے ہاں مستقل امید کی علامت ہے۔

آج مگر اک نووارد/ بچے کا رونا سن کر/ چونک پڑے دیوار و در/ جاگ اٹھا ہے گھر میرا

آخری دن کی تلاش اور تیسری کتاب یقیناً گھر آنگن کی بکھری ہوئی تفصیلات کا سفر نہیں۔ اس میں تجسس پر تفکر کا سایہ پڑنے لگا ہے تاہم اس نظم میں موجود پیکر کو امید کا چہرہ کہنا یا امید کی علامت کہنا شاید اتنا برمحل نہ ہوگا۔ نظم میں واضح طور پر کسی گوشت پوست کے پیکر کے لیے ایک ناسٹلجیائی کیفیت ملتی ہے۔ علوی نے 'ہوا' اور 'خوشبو' کی علامتوں میں جنسی جذبات اور رومانیت کے تیز بہاؤ کو گرفت میں لیا ہے اور 'سورج' 'رات' اور موسموں کے تغیرات میں جنگلی زندگی کے وحشی آداب اور شہری مصروفیات وغیرہ کو علامتوں کے وسیلے سے محسوس کرایا ہے۔ علوی مظاہر فطرت اور اشیا کو ذی روح بنا دیتے ہیں۔ فطرت کے مناظر میں اپنے جذبات کا عکس تلاش کر کے آہیں بھرنا رومانی شعرا کی بہت پرانی عادت ہے لیکن فطرت کو اور خارجی اشیا کو الگ اور منفرد وجود کی حیثیت سے، جیتے جاگتے، سوچتے اور محسوس کرتے ہوئے دیکھنے اور دکھانے کا عمل علوی سے پہلے بہت زیادہ نہیں ہوا ہے۔ ساتھ ہی روزمرہ کی زندگی میں عمل دخل رکھنے والے حیوان ان کی علامتی کائنات میں میں موجود ہیں۔ ان علامتوں میں ارضیت اور زمانے کی موجودہ واقعیت کے پیچیدہ اور ٹیڑھے ترچھے خیالات کا شعری اظہار نمایاں ہے۔ ایک اور نظم 'اب جدھر بھی جاتے ہیں' ملاحظہ ہوں۔

گائے بھینس کا ریوڑ/ اب ادھر نہیں آتا/ اونٹ ٹیڑھا میڑھا سا/ اب نظر نہیں آتا/ اب نہ گھوڑے ہاتھی ہیں/ اور نہ وہ براتی ہیں/ اب گلی میں کتوں کا/ بھونکنا نہیں ہوتا/ رات چھت پہ سوتے ہیں/ بھوت دیکھ کر کوئی/ چونکنا نہیں ہوتا/ اب جدھر بھی جاتے ہیں/ آدمی کو پاتے ہیں۔

اب جدھر بھی جاتے ہیں-6

بظاہر یوں لگتا ہے کہ یہ آدم بیزاری ہے لیکن درحقیقت یہ آدم بیزاری نہیں بلکہ زندگی سے معصومیت اور سچائی کے ختم ہوجانے کا نوحہ ہے۔ گائے بھینس، اونٹ، گھوڑے، ہاتھی، کتے بھوت ان تمام اشیا کے ساتھ وابستہ کشش اور تحیر صرف ایام طفلی سے ہی مخصوص نہیں بلکہ گاؤں کی سادہ اور معصوم زندگی کا تصور بھی ابھرتا ہے۔ یہ نظم محض بچپن کی معصومیت کے چھن جانے کا نوحہ نہیں بلکہ تمام بنی نوع انسان کی معصومیت کے مسخ ہوجانے کا ماتم ہے۔ نظم کا ڈھانچہ اتنا پیچیدہ نہیں لیکن اس نظم میں پیش کردہ تجربہ اس سے زیادہ پیچیدہ ہے کیوں کہ معصومیت اور خدائی تقدس سے محرومی جو علوی کی نظم کا مضمون ہے، اس کا اظہار کرنے کے لیے بچوں کے روزمرہ کے تجربے استعمال کیے گئے ہیں۔ اس کے باوجود مجموعی تاثر صرف ایک بچے یا محمد علوی یا صرف قاری کی معصومیت کا زوال نہیں بلکہ ہم سب کی معصومیت اور پھر تمام ابن آدم کی معصومیت کے زوال کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ یہی اس نظم کی خوبی ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی لکھتے ہیں: ''یہ نظم جو بظاہر محمد علوی کے اس مانوس اسلوب میں معلوم ہوتی ہے جس کے بارے میں محمود ایاز نے کہا تھا کہ محمد علوی بچوں کی طرح شاعری کرتے ہیں، بہ باطن پیچیدہ اور کئی حیثیتوں کی مالک ہے۔ ان چیزوں کا انتخاب قابل غور ہے جن کا نہ ہونا معصومیت اور تحیر انگیز مسرت کے زوال کی علامت ٹھیرایا گیا ہے۔''7 محمد علوی کی اس قسم کی نظموں میں 'چابی کا بھالو'، 'کاٹھ کا گھوڑا'، 'گھوڑے پر ایک لاش'، 'کون؟'، 'یہ تتلی میری ہے' اور 'تتلی' وغیرہ بھی ایسی نظمیں ہیں جن کا علامتی لہجہ ان میں مفاہیم کی تہہ داری کا حامل ہے۔

محمد علوی کے یہاں جانوروں کو علامتی سطح پر برتنے کا شعور ملتا ہے۔ ان کے یہاں 'چابی کا بھالو'، 'کاٹھ کا گھوڑا'، 'مچھلی کی بو'، 'چیل کا سایا'، 'بند گھر اور چڑیا گھر'، 'گھوڑے پر ایک لاش' اور 'جانوروں سے معذرت کے ساتھ' (دس نظمیں) وغیرہ نظر آتی ہیں بلکہ صبح، شام اور رات بھی ان کو جانوروں کی شکل میں ہی نظر آتے ہیں۔ صبح ان کے یہاں ایسی کالی بلی ہے جو منھ میں اجلا کبوتر دبائے ہوئے ہے، دوپہر سوئیوں جیسے بالوں والی سورنی ہے جب کہ رات سانپ یا سانپ کی پھنکار جیسی ہے۔ ان کے معاصرین میں یہ رجحان ساقی فاروقی کے یہاں بھی نظر آتا ہے۔ ساقی کے یہاں بھی 'ایک کتا نظم'، 'خرگوش کی سرگزشت' اور 'خالی بورے میں زخمی بلا' جیسی اہم نظمیں ہیں جو بہائم کو علامتی سطح پر برتنے کا تسلسل ہیں۔ بہائم اور حیوان ہماری داستانوں اور اساطیر کا اٹوٹ حصہ ہیں۔ جدید نظم میں یہ بہائم اور داستانوی عناصر دراصل ذات کے وہ بھولے بسرے عناصر ہیں جن کا اب تک انسان انکار کرتا یا ان سے نظریں چراتا ہوا نظر آتا تھا۔ یہ ہمارے ادب کے ڈسکورس میں اہم مقام پاتے ہوئے نظر آتے ہیں تو ان کا مقصود یہ محسوس ہوتا ہے کہ آدمی کے آدمی سے ڈر یعنی خود سے ڈر کو مٹایا جائے، آدمی کو اپنی تقدیر کو قبول کرنے پر مادہ کیا جائے، آدمی کو اپنی فانی حیثیت سے، اپنے داخل میں مضمر سب نور و ظلمت، سب ملکوتی و ابلیسی عناصر کا سامنا کرنے کی جرأت دلائی جائے۔ ساقی فاروقی کی نظم 'مردہ خانہ' میں ذات کا یہ فراموش کردہ حصہ لاش کی شکل میں سامنے آتا ہے جب کہ محمد علوی کے یہاں 'ولف مین' کی شکل میں۔ ساقی کے یہاں لاش اگر آدمی کے بھولے بسرے حصے کی علامت ہے محمد علوی کی اس نظم میں بھیڑیا، ذات کے ناپسندیدہ حصے کی علامت ہے۔

آدھی رات ہوئی/ اور پورا چاند نکل آیا/ سوتے میں/ ہونٹ چیر کے/ اس کے دانت بڑھے/ اور ناخن نکلے/ تیز، نکیلے، بڑے بڑے!/ پھر سارے بدن پر/ بال ہی بال اگ آئے!/ گاؤں سے باہر جنگل میں/ بھیڑیے مل کے چلائے!

وہ اپنے بستر سے اٹھ کر/ کھڑکی کود گیا!/ پاس کے گھر میں/ سوتے میں کوئی بچہ چونک اٹھا!/ دور گلی کے نکڑ پر/ اک کتا بھونک اٹھا!

پھر دور/ بہت ہی دور کہیں/ اک چیخ سنائی دی!/ پھر اس کے خالی بستر میں/ اک لاش دکھائی دی/ پھر بادل گھر آئے/ اور سارا منظر ڈوب گیا!

سورج نے آکر دیکھا تو/ خالی بستر چمک رہا تھا/ گہری نیند میں/ وہ اپنے بستر سے نیچے لڑھک گیا تھا!-

ولف مین-8

بہ ظاہر نظم میں کایا کلپ کا تھیم محسوس ہوتا ہے جسے کافکا نے پیش کیا ہے یا اردو میں انتظار حسین نے، تاہم حقیقت میں یہ کایا کلپ نہیں، خواب ہے جو لاشعور میں پوشیدہ بہائم کی نمائندگی کرتا ہے۔ بلاشبہ اسے جدید اردو نظم کی چند اچھی مثالوں میں شمار کیا جاسکتا ہے۔ علوی نے ڈرامائی مناظر کی تکنیک میں آدمی کے اندر سے بھیڑیے کے برآمد ہونے اور پھر اندر ہی چھپ جانے کا موضوع پیش کیا ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ نظم کے آخر میں پہلے تین مناظر کو ایک فنتاسی قرار دیا گیا ہے۔ نظم کے متن سے ظاہر ہے کہ آدھی رات کو گہری نیند میں، جب آدمی کے شعور کا دروازہ بند ہوجاتا ہے تو اس کے اندر کا بھیڑیا جاگتا ہے اور ان جارحانہ خواہشوں کی تسکین کرتا ہے، جنھیں وہ بیداری کی حالت میں دبائے رکھتا ہے۔ یہ نظم آدمی کے یہاں ایک ناپسندیدہ حصے یا انا کی موجودگی کی کہانی سناتی ہے، یعنی یہ بتاتی ہے کہ آدمی تضادات سے عبارت زندگی بسر کرتا ہے۔ اس کی رات اس کے دن سے قطعی مختلف ہے نیز یہ بھی بتاتی ہے کہ بھیڑیا خود آدمی کے وجود میں ہی مضمر ہے۔ اور اس کے ہی جبڑے چیر کر برآمد ہوتا ہے۔ علوی کی نظم میں آدمی بھیڑیے کو نظرانداز کرتا ہے جس کی وجہ سے منقسم زندگی بسر کرتا ہے۔ آدمی اپنے اندر جن بھیڑیوں اور بہائم کو محسوس کرتا ہے، ان سب سے آدمی کا تعلق ہے کہ انھیں آدمی نے خود یا اس کے ہم نفسوں نے پیدا کیا ہے۔ جن بہائم کو دوسرے لوگ یعنی سماج و سیاست پیدا کرتے ہیں، وہ دوسرے آدمیوں کا ہی خون پیتے ہیں باہر کی دنیا یا دوسروں کے پیدا کردہ ان بہائم سے آدمی تصادم کے ذریعے ہی نجات پاسکتا ہے، لیکن جن بہائم کا تعلق لاشعور سے ہے انھیں قبول کرنے، ان کا سامنا کرنے سے آزادی و نجات ملتی ہے اور محمد علوی اس نظم میں ان بہائم کا سامنا کرنا سکھاتے ہیں۔

معصومیت اور تحفظ کا متلاشی و محافظ یہ شاعر جو لاشعور سے آنکھیں چار کرنے کا ہنر سکھاتا رہا اور معصومیت و تحیر کی تلاش و حفاظت میں تاعمر سرگرداں رہا بالآخر جنوری 2018 میں راتوں کو اٹھ اٹھ کر خود کو تلاش کرنے کے کار گراں سے نجات پا گیا اور اس بھری پری کائنات کو تنہا چھوڑ کر اپنے آپ کے ہمراہ دائمی سفر پر روانہ ہوگیا۔

چلا جاؤں گا جیسے خود کو تنہا چھوڑ کر علوی
میں اپنے آپ کو راتوں میں اٹھ کے دیکھ لیتا ہوں

حواشی

1 محمد علوی، خالی مکان، بنگلور: مکتبہ سوغات، 1963، ص 68
2 ایضاً، ص 22
3 محمود ہاشمی، 'تتلیوں کا محافظ محمد علوی ایک مطالعہ (مرتبہ کمار پاشی)، نئی دہلی: سطور پرکاشن، اساڑھ شک سمبت 1900، ص 24)
4 محمد علوی، خالی مکان، ص 17
5 بلراج کومل، 'معصومیت کا نقش نامہ' محمد علوی ایک مطالعہ، مرتبہ کمار پاشی، ص 62
6 محمد علوی، تیسری کتاب، نئی دہلی: شعور پبلی کیشنز، 1978، ص 215
7 شمس الرحمٰن فاروقی، 'محمد علوی: دوسرا ورق اور تیسری کتاب'، معرفت شعر نو، حیدرآباد: الانصار پبلی کیشنز، 2010، ص 179
8 محمد علوی، تیسری کتاب، ص 153

■

Dr. qamar Jahan
122, Block, Yamuna Hostel, JNU
New Delhi - 110067
Mob.:9910360096

پیغام آفاقی کی فکشن نگاری

محمد شارب

صوبہ بہار کی زرخیز زمین نے کئی ایسے نامور سپوتوں کو جنم دیا، جنھوں نے اپنی تخلیقی کاوشوں اور اعلیٰ کارناموں سے بین الاقوامی شہرت حاصل کی اور اس ریاست اور ملک کا نام روشن کیا۔ میرا خصوصی اشارہ اس ریاست کے ضلع 'سیوان' کی جانب ہے جہاں سے پہلے صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر راجندر پرشاد، معروف مجاہد آزادی لوک نائک جے پرکاش نارائن، ہردلعزیز شاعر سید کاظم علی جمیل مظہری، معروف خاکہ نگار احمد جمال پاشا، عالمی شہرت یافتہ ظریفانہ نظم نگار رضا نقوی واہی، مشہور فکشن نگار، سریل ہدایت کار اور دہلی کے محکمۂ پولیس میں اہم عہدے پر فائز پیغام آفاقی (10 جنوری، 1956، 20 اگست 2016) جیسی شخصیات کی جانب ہے۔ ان تمام سپوتوں نے اپنے اپنے عہد میں اپنے مقام و مرتبے پر قائم رہ کر ایسے ایسے کارہائے نمایاں انجام دیے جنھیں کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

بیسویں صدی کے نصف آخر میں جن چند قلم کاروں اور کہانی نویسوں نے اپنی مخصوص کہانیوں سے اردو فکشن کی دنیا میں اپنی شناخت قائم کی ان میں پیغام آفاقی کا نام بلا تامل لیا جائے گا۔ ان کا شمار ان فکشن نگاروں میں ہوتا ہے جنھوں نے اوروں کی تقلید سے انحراف کرتے ہوئے فکشن نگاری کی دنیا میں اپنی راہ الگ بنائی۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ آج افسانے اور ناول پر ہونے والی تقریباً ہر گفتگو اور تحریر میں انھیں حوالے کے طور پر ضرور شامل کیا جاتا ہے۔ یعنی آفاقی اردو فکشن کی تاریخ کا ایک ناگزیر حصہ بن چکے ہیں۔ ان کو گزرے آج چار برس ہو چکے ہیں لیکن جب اردو ادب اور اس کے صاحب طرز ادیبوں پر گفتگو ہوگی، ناول اور افسانے پر مذاکرہ ہوگا اور اس میدان میں ان کی آمد اور ان کے مخصوص لب و لہجے اور ان کے مزاج پر مباحثہ ہوگا تو احتجاج کی صدا گونج پیدا کرے گی، ہم آفاقی کو یاد کرتے رہیں گے۔ وہ ہر دل عزیز فکشن نگار تھے جو ہم سب کو جلد چھوڑ کر مالک حقیقی سے جا ملے۔ ایک اچھے فکشن نگار کے ساتھ ساتھ وہ ایک آئی پی ایس افسر بھی تھے مگر غرور، گھمنڈ اور تکبر ان میں نہیں تھا۔ علی گڑھ جیسی ادبی فضا میں غضنفر، طارق چھتاری جیسے دوست ملے تو ان کے اندر کا فنکار بھی جاگا جس کے تناظر میں کہانیاں لکھیں، نظمیں کہیں، اور پہلے ناول 'مکان' سے ہی اہل علم کے درمیان موضوع گفتگو بن گئے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ بعض فکشن نگاروں نے کم لکھا اور زیادہ مشہور ہوئے ٹھیک یہی صورت حال آفاقی کی تخلیقی زندگی پر بھی صادق آتی ہے کہ انھوں نے اپنے کم و بیش پچیس سالہ تخلیقی سفر میں محض دو ناولوں ('مکان' اور 'پلیتہ')، ایک افسانوی مجموعہ (مافیا) کے بوتے فکشن کی دنیا میں اپنا مقام بنایا۔ آفاقی کا تیسرا ناول 'دوست' ان کی رحلت کے دو سال بعد ان کی شریکۂ حیات رضیہ سلطانہ کے توسط سے شائع ہو کر منظر عام پر آچکا ہے۔ آفاقی بنیادی طور پر ناول نگار ہیں اور ناول نگاری کے فن میں پوری مہارت رکھتے ہیں۔ ناول نگار کی حیثیت سے ان کی انفرادیت و اہمیت مسلم ہے کیونکہ 'مکان' اور 'پلیتہ' دونوں ناول موضوع اور اسلوب کے اعتبار سے اردو فکشن کی دنیا میں ایک اہم اضافہ ثابت ہوئے ہیں۔ ناول 'مکان' کا موضوع استحکام (Establishment)، صنعتی کلچر (Trade culture) کی بے ضمیری اور محکمہ پولیس کا ناروا سلوک ہے۔ اس موضوع کو بیان کرکے مصنف نے پورے پولیس نظام کو Expose کیا ہے۔ آفاقی نے اپنے ناولوں میں زندگی کے حقائق کی غیر مشروط جستجو اور شناخت پر توجہ مرکوز کی ہے۔ انھوں نے نئی نسل کی ذاتی سوچ اور نجی مجبوری کو سیاسی اور سماجی نظام سے ہم آہنگ کرکے اسے ایک تخلیقی جہت عطا کی اور عصر حاضر میں زندگی کے تیزی سے تبدیل ہوتے نظام کو سمجھنے اور اس کو فنی شعور کے ساتھ قاری تک پہنچانے کا اہتمام کیا ہے۔ یہ بات کسی حد تک ان کے پہلے ناول 'مکان' سے مطابقت رکھتی ہے جو 1989 میں شائع ہوا جس کی مقبولیت کے پیش نظر ان کو 'اردو اکیڈمی یوپی فرسٹ ایوارڈ فار بک' اور 'اردو اکیڈمی آف دہلی: ایوارڈ فار کونٹری بیوشن ٹو فکشن' 1997 میں اعزازات سے نوازا گیا۔ اس کی اشاعت دوم 2004 میں ہوئی جس میں ڈاکٹر مولا بخش نے ساٹھ صفحات پر مشتمل

تفصیلی گفتگو کی ہے۔ ڈاکٹر احمد صغیر اس ناول کی ورق گردانی کرنے کے بعد کچھ یوں بیان کرتے ہیں:

"پیغام آفاقی کا ناول 'مکان' دراصل اسٹیبلشمنٹ سے جوجھنے کی کہانی ہے۔ نیرا میڈیکل کالج کی طالبہ ہے۔ وہ اپنی ماں کے ساتھ اپنے مکان میں رہتی ہے۔ مکان کا ایک حصہ اس نے کرایے پر دے رکھا ہے۔ کرایہ دار مکان چھین لینا چاہتا ہے۔ اس کے لیے وہ ہر ہتھکنڈے استعمال کرتا ہے جو قانونی اور غیر قانونی دونوں ہیں۔ وہ پولس کو اپنے سرمایے اور اثر و رسوخ سے اپنے حق میں کر لیتا ہے۔"

(بہار میں اردو فکشن، ص 45، ڈاکٹر صغیر احمد، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی، 2014)

ڈاکٹر احمد صغیر کے اس خیال سے میں متفق ہوں کہ 'مکان' کا مطالعہ اس بات کو صحیح ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ 'مکان' واقعی استحکام سے جوجھنے کی ہی کہانی ہے۔

ناول کی ہیروئن نیرا نے اپنے مکان میں ایک کرایہ دار کمار کو رکھا ہے جو اسے تنہا اور بے سہارا سمجھ کر مکان کو ہڑپنا چاہتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی کرایہ دار کا رویہ اس قدر ظالمانہ ہے کہ وہ جلد بازی میں کچھ نہیں کرتا بلکہ وہ نیرا کو دھیرے دھیرے کمزور کرنا چاہتا ہے تاکہ وہ اس مسئلے کو وبالِ جان سمجھنے لگے اور مکان چھوڑ کر بھاگ جائے۔ پولس بھی کرایہ دار سے مل جاتی ہے اور رشوت لے کر نیرا کے خلاف سازش میں شامل ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے کہانی میں دو سمتی ہولناکی پیدا ہو جاتی ہے اور نیرا قاری کی نظر میں زیادہ مظلوم نظر آنے لگتی ہے۔ نیرا کے ساتھ جو زیادتیاں اور ناانصافیاں ہوتی ہیں اس میں کرایہ دار اور پولیس دونوں برابر کے شریک ہیں۔

دوسرا ناول 'پلیتہ' (2011) بھی نئی زندگی اور نئی Sensibility کا ناول ہے جس میں مصنف نے تاریخی، جنسی، نفسیاتی، معاشرتی پیچیدگیوں اور جذباتی کیفیتوں کی ایسی تصویر کشی کی ہے کہ قاری کو اس کی اپنی کہانی معلوم ہوتی ہے۔ آفاقی کی تخلیقات کا کینوس وسیع اور متنوع ہے۔ وہ اپنے عصر کا گہرا شعور رکھتے ہیں اور بڑی معروضیت کے ساتھ اپنے مشاہدات کو اپنی تخلیقات میں پیش کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔ آفاقی نے نہ صرف اسلوب پر محنت کی ہے بلکہ ماضی اور حال کے تصادم سے ایک نئی بستی یا ایک نئی دنیا آباد کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔ اور اس دنیا میں ہر وہ مسئلہ ناول کا حصہ بنتا ہے جو ہمارے آج کے عہد سے وابستہ ہے۔ یہ ناول اپنے طرز و اسلوب کا منفرد ناول ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا آفاقی اپنی پہلی ہی جست میں جس مقام تک پہنچے تھے، اسے برقرار رکھ سکے ہیں یا ان کی شناخت مجروح ہوئی ہے؟ تانیثیت، مارکیٹ اکانامی، گلوبلائیزیشن، کرپشن، انسانی ولسانی حقوق، کارپوریٹ کلچر، ولڈ وار یا ولڈ وار کی طرف بڑھتے قدم، پولرائیزیشن، اور ان کے مابین حیاتِ انسانی کے فلسفوں کی تلاش نہ صرف اس ناول کے مطالعے کے لیے مجبور کرتی ہے بلکہ بنیادی مغالطوں سے بھی باہر کا راستہ دکھاتی ہے کہ اردو ناول میں بڑے موضوعات شامل نہیں کیے جا رہے ہیں۔ آفاقی نے آج کے عہد کی بدنظمی، لاقانونیت، بدامنی اور دیوالیہ پن کی جو تصویر ہمارے سامنے رکھی ہے وہیں سے ایک نئے معاشرتی و سیاسی نظام کا چہرہ بھی ابھر کر سامنے آتا ہے۔ اور شاید اس لیے کہ سچا ادیب امید و یقین کے سورج پر نگاہیں مرکوز رکھتا ہے اور وہ اپنی تحریروں سے اس تاریکی کو بدلنے کا ہنر جانتا ہے۔ ان کی خوبی یہ ہے کہ وہ اپنے عہد، ماحول اور عہد کے تضادات و تصادمات کو ایسے تناظر میں پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں جس میں افسانوی انفرادیت کے ساتھ ساتھ فکشن کی نئی جمالیات بھی شامل ہیں۔ اس طرح ان کا فن ان کے معاصر لکھنے والوں میں خاص طور پر ممتاز اور مختلف نظر آتا ہے۔

آفاقی نے اپنے ہم عصر ہندوستان کی تہذیب، ثقافت، سیاست اور آزادی سے قبل کی مختلف حقیقتوں کو جس بے باکی اور ہنرمندی سے پیش کیا ہے قابلِ نظیر ہے۔ اس عہد کی زندگی اور معاشرت کا کوئی بھی گوشہ ان کی نگاہوں سے پوشیدہ نہ رہ سکا۔ ایک سچے فنکار کی طرح صداقت پسندی اور بیباکی کو اپنا شعار تصور کر کے انھوں نے اس تہذیب و معاشرت کے قبیح و صبیح دونوں پہلوؤں کو بڑی سفاکی اور معروضیت کے ساتھ آشکارا کیا ہے۔ یہی سبب ہے کہ 'پلیتہ' اس عہد کی تہذیب کا مکمل مرقع بن گیا

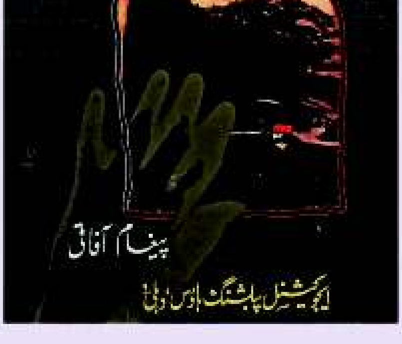

ہے جس میں سیاسی، سماجی، معاشی، ثقافتی اور اخلاقی، غرض زندگی کا ہر پہلو اور ہر رنگ سمٹ آیا ہے۔

اس ناول کی ہیئت کے متعلق ڈاکٹر سید نجمی ظفر رقمطراز ہیں کہ:

"یہاں صورتِ حال یہ ہے کہ مرکزی کردار خاموش ہے، ساکت ہے اور غائب بیانیہ اپنے مکالموں سے قاری کو روشناس کرا رہا ہے اور یہ 'ناول نویسی' کو داستان گوئی کی طرح 'ناول گوئی' بنا دینے جیسی ایک بات ہے جو ایک مرتبہ پھر یہ سوال سامنے لا دیتی ہے کہ "پلیتہ" کو ناول کہا جائے یا داستانچہ سمجھا جائے یا نیم ناول یا نیم داستان، جیسی کوئی قبا اس قامتِ فن کے لیے تجویز کر لے اس کے دوش پر نئے تجربہ کا کوئی چیستانی نقش و نگار والا رومال ڈال کر اطمینان و مسرت کی سانس لی جائے اور اسے عصری بصیرت کے انوکھے یا انجانے فیضان سے منسوب کر دیا جائے۔"

(ڈاکٹر سید نجمی ظفر، رسالہ 'آج کل' ص 6، شمارہ، دہلی، اپریل 2017)

جب ہم 'پلیتہ' کا تفصیلی جائزہ لیتے ہیں تو یہ ناول 'نیم داستان' معلوم پڑتا ہے۔ اس کا ہیرو خالد سہیل ہے جسے زمانے کی ٹھوکروں اور معاشرے کی بے حسی نے اس کے Career کو مسمار کر دیا ہے۔ اب وہ اپنے اجداد کی وراثت کو حاصل کرنے اور ان پر چلے مقدمے کی تہہ تک جانا چاہتا ہے اور جاننا چاہتا ہے کہ آخر کس جرم میں اس کے پردادا کو حوالات میں قید کر کے پھانسی دی گئی لیکن ان سبھی واقعات کا پتہ قاری کو اس کے مرنے کے بعد اس کے کمرے میں ملی ڈائری اور اس کی قبر کے مجاور کی زبانی ہی ہو پاتا ہے۔ اس میں مصنف نے حسین بیانیہ پیرائے اظہار اور تاریخی واقعات سے حسین امتزاج پیدا کرنے کی کوشش کی ہے لیکن یہ بھی سچ ہے کہ جتنی شہرت آفاقی کو ان کے پہلے ناول 'مکان' کو حاصل ہوئی اتنی اسے حاصل نہ ہو سکی پھر بھی اس ناول میں قاری کو ایک منفرد کردار نگاری کا طرز، رنگ اور اسلوب دیکھنے کو ملتا ہے جسے ہم ناول نگار کے معراجِ فن سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ مرکزی کردار بالکل بے عمل اور ساکت ہے۔ جگہ جگہ غیر ضروری طوالت نے بھی قاری کو تھکایا ہے پھر بھی مصنف کی فنی مہارت کا کئی جگہ ہمیں کمال دیکھنے کو ملتا ہے کیوں کہ ناول بنیادی طور پر بیانیہ صنف ہے اور اس میں جزویات کے ذریعے مفصل طور پر مسائل و معاملات کی عکاسی ہوتی ہے۔ لہٰذا ناول ہی واحد صنف ہے جس میں زندگی کے مسائل و وسائل کا تفصیلی بیان تمام تر پہلوؤں کے ساتھ اجاگر ہو سکتا ہے، انھی خیالات کے پیشِ نظر میں نے اس مقالے میں آفاقی کے فکشن کی فنکارانہ عظمت کا احاطہ کیا ہے۔

آفاقی کے دونوں ناول 'مکان' اور 'پلیتہ' ،فکشن گوئی سے متعلق ادبی سرمایہ ہیں جن کی قرأت سے فکشن کا قاری کبھی دست بردار نہیں ہو سکتا۔ دونوں ناولوں میں کرداروں کے ذریعے جا بہ جا 'خود کلامی' کا استعمال بڑے ہی سلیقے سے کیا ہے ساتھ ہی 'علامت نگاری' سے بھی کام لیا ہے جو ان کا خاصہ ہے۔ ان کے ناولوں کا مطالعہ کرنے کے بعد قاری کو اس بات کا اندازہ کرنے میں دیر نہیں لگتی کہ ناول نگاری کی پرواز تخیل اور فکری بصیرت بدرجہ اتم ہے۔

''جب مجھے خطرہ محسوس ہوتا ہے، میری روشنیوں کے دائرے میں کوئی جانور گزر جاتا ہے تو میں چیختی ہوں لیکن جیسے ہی وہ چلا جاتا ہے میں اس کو مطمئن کر لیتی ہوں۔ میں عموماً یوں ہی اپنے الاؤ کی روشنی میں قید رہتی ہوں۔ میری تنگی، میرا چھوٹا پن ہی میرے ذہن کی زنجیر بن گئے ہیں۔ میں واقعات کو بغور تجزیہ کرنے اور تجزیے کے ذریعہ دور دور تک دیکھنے کے شعور سے محروم ہو گئی ہوں... اور اب میں اپنے چاروں طرف کے ماحول کو صاف صاف اس لیے دیکھ رہی ہوں کہ میں نے نگاہیں اٹھا کر دیکھنا شروع کر دیا ہے یوں کہ جو کچھ دکھائی دیتا ہے اسے بلا روک ٹوک دیکھتی ہوں۔ اور روشنی میرے اندر سے یوں پھوٹ رہی ہے جیسے۔۔ ٹیوب ویل سے پانی نکلتا ہے۔ کیا چیزوں کو جاننے اور پہچاننے پہچاننے میں فرق ہے؟ کیا علم کے کئی روپ ہیں؟ اور علم کا سب سے پختہ روپ براہ راست زندگی خود ہے؟۔''

(ناول 'مکان'، ص 75، اضافہ شدہ ایڈیشن، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، 2004)

آگے بڑھنے سے قبل میں 'خود کلامی' کی تفہیم ضروری سمجھتا ہوں، یہ خود کلامی ادب کا ایسا طرز تحریر ہے جس میں راوی کا بیان خود اپنے آپ سے گفتگو کرنے سے مشابہ ہوتا ہے اسی انداز کو 'خود کلامی' (Soliloquy اور Monologue) کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ خود کلامی کے دوران تخلیق کار کے لیے کچھ ضروری نہیں کہ اس کا سامع موجود ہو۔ وہ تنہا کردار کے ذریعے تخلیقی حسیت کے حصے کے طور پر خود کلامی کو کہانی پن میں اس طرح پیوست کرتا ہے کہ تخلیقی خود کلامی کا وصف کہانی، پلاٹ، کردار اور زمان و مکاں سے آزاد نہیں ہوتا بلکہ بیانیہ کی کیفیت کا کام انجام دیتا ہے۔ اس عمل کے لیے اردو میں خود کلامی کی اصطلاح مروج ہے۔

ناول 'مکان' کا جائزہ لیتے ہوئے میں نے یہ دکھایا ہے کہ مصنف کو اس ناول نے کس طرح فکشن کی دنیا میں آفاقی شہرت عطا کی اور ایک کامیاب فکشن نگار کی فہرست میں لا کھڑا کیا ساتھ ہی یہ بھی جائزہ لیا ہے کہ اس ناول میں وہ کون سے محرکات و نظریات ہیں جن کے بوتے ناول نگار نے اپنا کامیاب سفر طے کیا۔ اس ناول کی اسلوب نگاری، کردار نگاری و منظر نگاری کا اگر تجزیہ کرتا ہوں تو پاتا ہوں کہ اس میں جدت و ندرت دونوں بیک وقت موجود ہیں جن سے آفاقی کو حیات جاویدانی نصیب ہوئی۔ میں یہ کہنا موزوں سمجھتا ہوں کہ اس ناول نے دیگر فنکاروں کو جہاں ایک نیا ذہن عطا کیا ہے وہیں تخلیقی شعور و بصیرت بھی عطا کی ہے۔ اس کا کلیدی (مرکزی) کردار ایک کمزور و مجبور لڑکی نیرا نیچا ہے جو دہلی شہر کے کسی فرینڈس کالونی میں اپنی بیوہ بوڑھی ماں کے ساتھ رہ کر میڈیکل کی تیاری میں لگی ہوئی ہے لیکن اس کا کرایہ دار کماری بد نظر اس کے اس مکان پر ہے اور وہ اسے ہتھیانا چاہتا ہے کیونکہ۔ ''نیرا کا یہ مکان بیچ شہر میں تھا اور اس شہر کے پھیلاؤ اور ترقی کے ساتھ ساتھ اس کے مکان کی قیمت دن دونی رات چوگنی بڑھتی جا رہی تھی۔'' (مکان، ص 65) اور اس عمل میں اس کا ساتھ چند پولیس اہلکار بھی دیتے ہیں کیونکہ کمار نے انہیں رشوت دے کر ان کے ضمیر کا سودا کر لیا ہے مگر اپنے حق کو ہر حال حاصل کرنے کے لیے نیرا خود اعتمادی اور حوصلہ مندی سے مقابلہ کرتی اور آہنی ارادوں سے لیس آگے بڑھتی اور امید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتی ہے۔ جس کے پس منظر میں وہ قاری کے سامنے ایک مثالی (Ideal) کردار بن کر نمودار ہوتی ہے اور اس کی ہمدردی بھی حاصل کرتی ہے۔ اس طرح اس ناول کو اگر تانیثیت (Feminism) سے تعبیر کیا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ یہاں پر غور کرنے والی بات یہ ہے کہ آفاقی نے اس کا مرکزی کردار ایک لڑکی کو بنایا ساتھ ہی اسے کمزور اور مجبور طبقے کی نمائندگی کرنے والے کے طور پر پیش کیا مزید یہ کہ اسے عصری تعلیم سائنس اور میڈیکل کی طالبہ بھی بنایا تا کہ استحصال زدہ سماج اور معاشرہ اپنی پسماندگی کو دور کرنے کے لیے عصری تعلیم سے آراستہ و پیراستہ ہو جائے اور اس کی روشنی میں اپنے تمام مسائل کو حل کرنے کے لیے کمربستہ ہو جائے۔

ناول 'مکان' کو بعض اہل قلم علامتی (Symbolic) بھی مانتے ہیں اور کچھ 'پلیتہ' میں بھی اس کے گوشے نظر آتے ہیں، اسی تسلسل سے میں یہ کہوں گا کہ دنیا کے سارے فنون لطیفہ علامت کے بغیر ادھورے ہیں۔ علامت انسان کے اظہار کا ایک ایسا مددگار ذریعہ ہے جو اظہار کے خارجی پہلو تک ہی محدود نہیں بلکہ اس کی ذات کے اندر کے معنی کو بھی باہر نکال لاتا ہے۔ یہ صرف اظہار کا وسیلہ ہی نہیں بلکہ ادراک کی ایک کامیاب صورت بھی ہے۔ ہمارے ادب میں علامت، ایمائیت، اشاریت، رمزیت ایک دوسرے کے مترادف (Synonymous) کے طور پر استعمال ہوتے ہیں انیسویں صدی میں یوروپی ادبیات میں علامت پسندی (Symbolism) کو فن پاروں میں برتنے کی روایت کا آغاز ہوا۔ ژاں موریس نامی مشہور مفکر نے انیسویں صدی کے اواخر میں علامت پسندی اشاریت کی تحریک کا آغاز کیا۔ ژاں موریس نے ایک منشور کے ذریعے توجہ مبذول کی کہ ادبیات میں رومانیت اور واقعیت کی تحریکیں ختم ہوئیں، اس کے بجائے فنی اظہار میں علامت پسندی یا اشاریت کا آغاز ہوتا ہے۔ ''آخری لمحے میں اس کو یقین ہو گیا تھا کہ آج کی مافیائی قوتیں معاشرے پر اس قدر حاوی ہیں کہ لوگوں کی رائیں اپنے مشاہدے سے نہیں بلکہ ترسیل و ابلاغ کے ذرائع سے بنتی بگڑتی ہیں اور دنیا اب سامنے سے لڑائی نہیں کرتی بلکہ خاموشی سے مختلف بہانوں سے اور مختلف شکلوں میں سازشوں کے ذریعے امن کے پاسبانوں اور مجاہدوں پر حملہ کرتی ہے تا کہ جس پر حملہ ہو رہا ہے اس کے ہمدرد بھی گمراہ ہو کر اس سے متنفر ہو جائیں۔'' (پلیتہ، ص 24)۔ ہمارے ادب میں طویل عرصے تک حسن و عشق کے اظہار پر توجہ دی جاتی رہی جس کے تحت ماورائی عشق، زمینی عشق کے علاوہ مجازی اور حقیقی عشق کی نمائندگی پر زور دیا جاتا رہا ہے۔ مرد اور عورت کے مثالی عشق کے علاوہ جنس زدگی اور جنس سے انحراف کو بھی رومانیت کے اظہار میں شامل کیا گیا۔

مذکورہ بالا تحریروں سے یہ بات واضح ہو کر سامنے آتی ہے کہ پیغام آفاقی کو فکشن نگاری کے ہنر سے بلا کی واقفیت تھی جس کی وجہ سے وہ اپنے معاصرین میں نمایاں نظر آتے ہیں۔ ان تاویلوں کی بنیاد پر کہا جا سکتا ہے کہ وہ ایک کامیاب فکشن نگار، مضمون نگار، مفکر، فلسفی، سیریل ہدایت کار اور سب سے بڑھ کر ایک حساس ذہن کے مالک تھے۔ ان کی ذات اور شخصیت کے متعدد پہلو ہیں۔ انھوں نے ہر راہ میں اپنے نمایاں نقوش چھوڑے ہیں۔ ان کے کارنامے ناقابل فراموش ہیں۔ ان کی علمی و ادبی صلاحیت کا ایک زمانہ معترف رہا ہے۔ ان کے قدردانوں میں اپنے وقت کے جید سے جید ناقدین و دانشوران ہیں۔ قاضی عبدالستار اور پروفیسر وہاب اشرفی جیسی عظیم شخصیات نے بھی ان کی تخلیقی صلاحیت کو سراہا اور قدر کی نگاہوں سے دیکھا ہے۔

■

Dr. Md Sharib
Upgrade High School
Tendowa, Harihar
Palamun - 822131 (Jharkhand)

جناب زاہد جعفری جلال پوری سے گفتگو

ساجد جلال پوری

بزرگ شاعر وادیب،افسانہ نگار،ڈرامہ نگار،مرثیہ نگار،محقق،تیس سے زائد کتابوں کے مصنف،منفرد لب ولھجہ کے مالک جناب زاھد جعفری جلال پوری جو ریٹائرمنٹ کے بعدشھرت سے دورگمنامی میں زندگی گزار رھے ھیں جن کی صلاحیت و لیاقت کے معترف نہ صرف اھل جلال پور بلکہ معتبر شعرا ادبا، ناقدین بھی ھیں.سید عاشور کاظمی لندن نے اپنی مشھور کتاب 'اردومرثیہ کا سفراور بیسویں صدی کے اردو مرثیہ نگار'میں ان کا خصوصی ذکر کیا ھے۔ ان سے جب خاکسار عزادارحسین ساجد نے انٹر ویو کے لیے خصوصی ملاقات کی تو انھوں نے نھایت خلوص سے استقبال کیااور آنکھیں بندکر ماضی کی یادوں میں کھو گئے۔ چند لمحے بعد آنکھیں کھولیں اور فرمایا!

میاں ساجد!اب جب کہ انگلیوں میں تاب مضرابِ نغمہ نھیں رہ گئی تو کیسے کھوں؟ ؎

غزل اس نے چھیڑی مجھے ساز دینا ذراعمر رفتہ کو آواز دینا

ھائے مری آشفتہ مزاجی اورنگار شان ماضی کے جان لیوا نقوش.سنو ؎

قصہ بہ حد نقطۂ انجام آچکا رک جاؤ!آفتاب لب بام آچکا
چل اپنی خواب گاہ میں آوارگی کو چھوڑ زاھد نگار شام کا پیغام آچکا

مکالمہ کرنے کے بجائے اگرمیری ادبی جنون نوازی کوحیطۂ تحریرمیں لاتے تو کچھ تھا.بھرحال پوچھو!

ساجد جلال پوری: آپ کی پیدائش کب اور کہاں ہوئی؟

زاھدجعفری: میری والدہ مرحومہ بتاتی تھیں کہ 13 رجب کو جب نماز فجر کی اذان ہورہی تھی تو میں نے رورو کر اپنی زندگی کا پہلا ثبوت دیا۔مکتب میں میری تاریخ پیدائش 19 جنوری 1941 درج کی گئی۔میری ماں مجھے بابو اور والد ماجد زاہد کہہ کے پیار کرتے تھے۔مکتب میں میرے نانا منشی غلام اکبر نے میرا نام محمد ثقلین زاہد لکھا۔ میرے دادا کا نام جعفر حسین تھا چنانچہ اسی نسبت سے اپنا تخلص زاہد جعفری اختیار کیا جس سال ہندوستان آزاد ہوا اسی سال مکتب میں نام لکھا گیا۔

س ج: اپنی تعلیمی تفصیلات سے آگاہ فرمائیں؟

ز ج: درجہ پنجم کے بعد بوجہ غربت و مفلسی تعلیمی سلسلہ منقطع ہوگیا مگر جستجو کے پاؤں تھکے نہیں۔ چلتا رہا چلتا رہا کئی سال کے بعد پرائیویٹ مڈل کا امتحان دیا فرسٹ ڈویزن سے پاس ہوگیا تو جامعہ اردو علی گڑھ سے ادیب ماہر و ادیب کامل کیے بعد دیگرے کامیابی ملی ادیب کامل میں پہلی پوزیشن نے سرسید میڈل عطا کیا۔ 1972 میں ایس آر انٹر کالج میں اردو ٹیچر ہوگیا تو اسی سال ہائی اسکول دوسرے سال انٹرمیڈیٹ پانچویں سال گورکھپور یونیورسٹی سے بی اے کیا پھر جب ترقی کا مرحلہ سامنے آیا تو اودھ یونیورسٹی سے ایم اے کا امتحان دیا یہ سب کے سب پرائیویٹ امتحان فرسٹ ڈویزن ہی سے پاس کیے۔

س ج: شاعری کی ابتدا کب ہوئی؟ ہو سکے تو پہلا شعر سنا دیجیے؟

ز ج: 1955 میں ایک ہی دن دو غزلیں کہہ ڈالیں دونوں کے اولین مطلع ابھی تک یاد ہیں۔

دردِ دل کچھ آج جو کم ہے غم سے زیادہ اس کا غم ہے
گلشن گلشن بات چلی تو رنگیں قبا کی بات چلی
مقتل مقتل بات چلی تو میری وفا کی بات چلی

س ج: پہلی تخلیق کس رسالے میں شائع ہوئی؟

ز ج: پہلی غزل ماہنامہ بیسوی صدی نئی دہلی کے 1958 کے سالنامے میں 'آنکھیں' کے عنوان سے اور ماہنامہ تحریک نئی دہلی میں پہلا افسانہ 'گونگا ہے بھگوان' اور ماہنامہ صبحِ نو پٹنہ میں پہلی آزاد نظم 'شب خون' شائع ہوئی۔

س ج: جلال پور کے قدیمی ادبی ماحول پر تھوڑی سی روشنی ڈالیں؟

ز ج: آزادی سے پہلے اختر حسین، حسن عسکری اور حکیم انصار حسین کیف کی کاوشوں سے ایک مذہبی ادبی تنظیم قائم ہوئی اور 'نورِ علی نور' کے عنوان سے محفلِ منقبت کا سلسلہ شروع ہوا پھر اختر بھائی اور حسن عسکری پاکستان چلے گئے۔ پھر دسویں سال کے بعد 'بزمِ اردو ادب' کی تشکیل ہوئی۔ خلیل الرحمٰن عطار، فاخر، پروانہ، عرفان، بہار عبدالاول اس کے روحِ رواں تھے۔ ماہانہ طرحی نشست میں مصرعِ طرح میں حقیر ہی دیا کرتا تھا۔

ویسے برسبیلِ تذکرہ یہ بات تاریخی اعتبار سے بہت اہم ہے کہ جلال پور کے پہلے شاعر شیخ تجمل حسین تھے انھوں نے ایک ناول بھی 'جلال پور کا عاشق' لکھا پھر وہ ہجرت کرکے کامٹی چلے گئے وہاں شاعری کی داغ بیل ڈالی پھر ممبئی جاکر صحافتی زندگی سے وابستہ ہوگئے کریمی پریس میں میر منشی تھے ان کے درجنوں شاگرد تھے۔

س ج: ہمارے علم میں ہے کہ آپ رات رات بھر مطالعے میں مصروف رہتے ہیں۔ یہ ذوق آپ کے اندر کب اور کیسے پیدا ہوا؟

ز ج: جی ہاں جناب! یہ نصف صدی سے زائد کا طویل قصہ ہے میں نے ابھی بتایا تھا کہ جب میرا تعلیمی سلسلہ منقطع ہوگیا تو میری نگاہِ تجسس کو اس تاریکی میں بھی شاعری کے چاند اور کتابوں کی کہکشاؤں نے ایسے ایسے طلسمی منظروں کو دکھانا شروع کردیا کہ کہیں احساسِ محرومی نہیں ہوا یہاں کوئی لائبریری بھی نہیں تھی تو میں نے بیسوی صدی، شمع، تحریک، آجکل، کھلونا، شاعر منگوانا شروع کردیا اور کئی کئی بار پڑھ پڑھ کر خود افسانہ نگاری شروع کردی۔ ظاہر ہے یہ خلوتوں کے لمحے صرف راتوں کے سناٹے ہی دے سکتے تھے۔ دیے جلتے رہے اسی روشنی میں کرشن چندر، جوش، عندلیب شادانی، ابن صفی، واجدہ تبسم کے جادوگرانہ اندازِ بیان و زمزمہ انگیز زبان نے میرے جذبات و احساسات کو جنونِ ہوش مندی میں تمام تر گرفتار کرلیا۔

س ج: شاعری میں آپ نے کس سے اصلاح لی؟

ز ج: عنفوانِ شباب میں بلقیسِ غزل سے عشق ہوگیا تو کورے کاغذات پر اس کے نقش اتارنے لگا۔ تصویر کی نوک پلک درست کرنے کے لیے اپنے استادِ گرامی حضرت کیف جلال پوری کے آگے زانوئے تلمذ تہ کردیا یہ سلسلہ صرف تین چار سال چلا مگر بہت کچھ ملا۔

س ج: آپ نے اب تک کن کن اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے؟

ز ج: میاں ساجد صاحب! کچھ نہ پوچھیے۔ اس صحرانوردی میں سب سے پہلے غزل سے ملاقات ہوئی پھر جدید اردو نظم اور گیتوں سے باتیں کیں۔ رباعی کی پیچیدگیوں نے عروضی صہبا پلائی۔ فنِ تاریخ گوئی نے زبر و بینات کے نوکیلے کانٹوں نے اسی سفرِ شوق میں تلووں کو لہولہان کر دیا۔ اسی دشت کی سیاحی افسانہ، خاکہ نگاری، تحقیقی مضامین، تاریخی آثارِ قدیمہ کے گوناگوں خوشبودار پھولوں کے رنگ تتلیوں کے سنگ دیکھے۔

گیتوں میں غزلوں میں نظموں میں فسانوں میں رہوں
میں اکیلا آدمی! کتنے ٹھکانوں میں رہوں
غم کہو، جذبہ کہو، پاگل کہو یا دل کہو!!!
عشق کی مشہور ساری داستانوں میں رہوں

س ج: آپ کی کون کون سی تخلیقات، تصنیفات زیورِ طبع سے آراستہ و پیراستہ ہوچکی ہیں؟

ز ج: توضیحِ اردو (زبان و قواعد و فصاحت و بلاغت پر)، بابِ بلاغت (مرثیوں کا انتخاب)، گرد و غبار (غزلوں کا مجموعہ)، آخری چراغ (پارۂ عم کا منظوم ترجمہ اور حدیث کسا)، دو دیوانے، خون کی آواز، سولیوں کے چراغ، آگ کا سمندر (مذہبی تاریخی ڈرامے)، ایک افسانوی ڈرامہ 'بازگشت' اب تک منصۂ شہود پر لا سکا ہوں۔ بقیہ ڈیڑھ درجن کتابیں طاقِ غربت میں سسک رہی ہیں۔ ان کے علاوہ ہزاروں صفحات ٹونس ندی کی آغوش میں سلا چکا ہوں۔

حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں

س ج: آپ کو اکثر اجتماع میں 'قطعۂ تاریخ' پڑھتے سنا ہے اور پھر آپ کی ہر کتاب کا نام بھی تاریخی ہے؟ یہ شوق آپ کو کہاں سے ملا؟

ز ج: مادۂ تاریخ نکالنا مشکل ترین فن ہے اس میں آورد کو آمد ہی نہیں بلکہ ریاضی کو ادب بنانا پڑتا ہے۔ مجھ کو یہ شوق لکھنؤ کے قیام میں علامہ فضل لکھنوی کو دیکھ کر ہوا۔ موصوف کو کم از کم ایک درجن سنہ نکالتے دیکھا تو میں نے دماغ سوزی کی بالآخر یہ فن سیکھ ہی لیا اور اب بچوں کے نام سے لے کر مشہور شخصیتوں پر سیکڑوں مادہ نکالنے میں کامیاب رہا ہوں۔ چنانچہ اس فن پر ایک کتاب 'دیارِ تاریخ' بھی مرتب کرچکا ہوں اس کتاب میں علم مادہ تاریخ کی ہر ممکنہ صورت سے بحث کی ہے اور یہ گوشہ بھی قابلِ دید ہے کہ مادہ نکالنے کا آسان ترین طریقہ بھی ہے۔ شکلیں تو بہت ہیں ہر اک مثال دے دے کر سمجھانے کی کوشش بھی کی ہے۔

س ج: قرآن مجید کے تیسویں پارے کا منظوم ترجمہ کرنے میں آپ کو کن دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا؟

ز ج: یہ کم علم عربی زبان کی ابجد سے بھی واقف نہیں، پھر بھی آخری چراغ کو فانوسِ قرطاس میں روشن کرہی دیا تو یہ توفیقِ غیبی اور معجزاتی اشاروں کی عطا ہی ہے۔ مزید دس پارے بھی نظم کرچکا ہوں ہنوز سلسلہ جاری ہے۔ کاش... کاش!۔ دشواریاں تو بے پناہ ہیں مگر متعدد دیگر ترجموں اور تفسیروں کے عمیق مطالعے مدد کرتے رہے ورنہ ایک زبان سے دوسری زبان میں کچھ تبدیل کرنا اور اس کی روح کو دوسرے قالب میں ڈھالنا کارے دارد۔

س ج: سنا ہے کہ 'مہذب اللغات' کی تدوین و ترتیب میں بھی آپ کا تعاون رہا ہے اس کی حقیقت سے

زاھد جعفری جلال پوری کی غیر مطبوعہ تصانیف

عروس العروض (علم عروض پر مشتمل)، آوارہ خوشبو (آزاد نظموں کا مجموعہ)، چمن چمن خوشبو خوشبو (مذہبی انشائیے اور تاریخی تحقیقی مضامین)، بہتر پیوند (مشہور مصرعوں پر تضمینیں) نقوشِ قلم و کاغذ (پیش لفظ، تاثرات، تبصرہ وغیرہ)، شانِ نزول (مشہور شعرا کے اشعار کی شانِ نزول)، ناضریہ (کربلائی شاعری (سلام، مربع، مسدس)، سجدۂ شعور (نعت پاک و حمدیہ شاعری) دیارِ تاریخ (مادۂ تاریخ یعنی تعریتی قطعات)، ماہ کامل (صنعت مہملہ میں مضامین)، دعائے صباح (منظوم ترجمہ)، حدیث کسا (منظوم مسدس)، دعائے مکارم الاخلاق (منظوم ترجمہ)، تسبیح کے دانے (منقبت معصومین)، کشکول (افسانے، افسانچے، ڈرامے وغیرہ وغیرہ متفرقات (نثری شہپارے)، رقص کرتی پرچھائیاں (کچھ اپنے بارے میں (یادوں کے جھروکے سے)، گنگناتی خاموشیاں (......)، شہیدانِ جام و سبو (اختر شیرانی، میراجی، مجاز، منٹو کے بارے میں)، ہزج (سورباعیاں)، گیان گیتا کا (کرداروں کا مطالعاتی تجزیہ)

روشناس کرائیں؟

ذ ج: جلالپور میں پدم شری حضرت مہذب (احمد منیر لکھنوی یادگار عشق و تعشق) آئے تھے میں نے پیش خوانی کی تھی تو وہ مجھے نیا محل لے گئے وہاں میں نے لغت کی تدوین میں پانچ چھ برس گزارے۔ یہ لغت پانچ پانچ سو صفحات کی بیس جلدوں پر مشتمل ہے۔ یہ اردو کی سب سے بڑی ڈکشنری ہے۔ آخری جلد میں میرا نام شامل ہے۔ نیا محل میں عبدالماجد دریابادی، سید حسن کاظم عروج (رئیس کسوارہ)، اختر تلہری، چھنگا صاحب حسین بندہ کاظم جاوید، رنگین (ریختی گو) جیسے جیسے لوگوں کی زیارت کی۔

س ج: نوجوانی میں آپ بہت مقبول تھے۔ بعض والیان ریاست نے بھی آپ کو خصوصی طور پر مدعو کیا تھا؟۔ اس سلسلے میں کچھ بتائیں؟

ذ ج: جی ہاں! میں مشاعروں میں منعقدہ محفلوں میں واقعی بے حد مقبول و معروف رہا ہوں۔ نوجوانی میں میرا لب ولہجہ اور ترنم ایسا تھا کہ ردولی کے راجہ چودھری ارشاد نقوی، سانکھنی کے راجہ غضنفر علی نقوی، رام پور کی مہارانی صاحبہ، پیر پور کے راجہ احمد مہدی اور ریاست لور پور کے تعلقہ دار راجہ سید بادشاہ حسین رمز نے اس ہیچمداں کو اپنے اپنے محلوں اور کوٹھیوں میں بلا بلا کر کئی کئی سال مسلسل سنا ہے!۔

س ج: کیا بعض ہم عصر شعراء وادباء کی طرز پر آپ نے فلمی دنیا ممبئی کا بھی سفر کیا ہے؟

ذ ج: نوجوانی میں میں ذرا جاذب نظر بھی تھا۔ ایک بار ممبئی کیسر باغ کے پروگرام میں گیا تو سید اشتیاق جعفری (جگدیپ) بھی موجود تھے وہ مجھ سے ملے ان دنوں وہ جوائے مکر جی (فلمی ہیرو) کے ساتھ مزاحیہ رول ادا کر رہے تھے۔ جگدیپ مجھے لے کر مکر جی کے بنگلے جو ممبئی پر لے گئے انھوں نے مجھے تین سچویشن بتائی اور گانا لکھنے کی خواہش کی۔ گنگنا کر دھن سنائی تو میں نے ایک مکھڑا کہہ دیا۔

تتلی ہوں میں نازک سی، ہوں، نازک سی، نازک، کول اور چنچل شوخ ہوں میں جب تھرکوں کھائے کمریا ہوں بل۔ تتلی ہوں میں تتلی ہوں

جگدیپ اور مکر جی نے پسندیدگی کا اظہار کیا اور اپنے بنگلے پر روک لیا۔ ٹیپ پر دو اور دھنیں سنائیں میں نے گانے لکھ دیے۔ اور کہا کہ آپ کا نام نیا ہے اور ابھی آپ کی کوئی پہچان بھی نہیں ہے۔ اختیار و استعمال کا حق میرا رہے گا۔ پانچ ہزار روپے دیے۔ یہ 1971 کی بات ہے۔ پھر میں واپس چلا آیا کہ فلم کی کمائی گناہ ہے۔

س ج: فلمیں دیکھنے کا بھی آپ کو شوق تھا۔ سنا ہے بعض فلمیں آپ نے کئی دفعہ دیکھیں اس کی وجہ؟

ذ ج: مغل اعظم، پاکیزہ، میلہ، نیادور، چاندنی چوک، شعلے میں نے واقعی کئی کئی بار دیکھی ہیں۔ جب پرتھوی راج، مینا کماری، دلیپ کمار، مدھوبالا کی اداکاری دیکھتا تھا تو سوچتا تھا کہ۔ خاموشی بھی بولتی ہے۔

س ج: اردو ادب میں آپ کن کن شخصیات کی نظریات سے متاثر ہیں؟

ذ ج: میر و غالب، انیس و دبیر، اقبال و جوش کے علاوہ کرشن چند، ابن صفی، قرۃ العین حیدر، واجدہ تبسم، فکر تونسوی، خامہ بگوش، احتشام حسین، عبدالرحمان بجنوری، شمس الرحمٰن فاروقی کا انفرادی اسلوب مجھے آج بھی کھینچتا ہے۔

کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجا است

س ج: فی الحال آپ کی مصروفیات کیا ہیں؟

ذ ج: زندگی بھر درس و تدریس کا پیشہ رہا ہے پنشن کے بعد' مہیلا ڈگری کالج' میں دس برس تک اردو فارسی بھی پڑھائی۔ اب گوشہ گیر اور بوریا نشین ہوں۔ اپنے حجرے میں ادب کی مشاطہ گری میں مصروف رہتا ہوں۔

س ج: اپنے اہل خاندان کے متعلق بھی کچھ بتائیں، حال ہی میں اہلیہ اور دو جوان بیٹوں کا صدمہ بھی برداشت کرنا پڑا۔ دل پر کیا گزری؟

ذ ج: اس ضعیفی میں لگاتار چھ مہینے کے اندر اتنے بڑے بڑے ناگہانی صدمات سے اس کے باوجود زندہ ہوں۔ خاندان میں دور دور تک کوئی ادب نواز تھا ہی نہیں۔

س ج: اپنے کچھ ہم وطن ہم عصروں کے بارے میں بھی ارشاد فرمائیں؟

ذ ج: خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں

س ج: اپنے شاگردوں کے بارے میں کچھ بتانا چاہیں گے؟

ذ ج: بہت سے ہیں مگر نیک بخت ہیں۔ امیر انصاری امروہی، ظفر اعظمی (مائل)، عباس رضا نیر، مظہر مہدی، فراق احمد (جلالپوری)، اختر اعجاز، علی انصر، تنزیلہ ام، معصومہ زہرا اور ساجد و عرفی اچھے لگے۔ اور بس۔

س ج: کیا آپ کو کوئی سرکاری غیر سرکاری اعزاز ملا؟

ذ ج: سرکاری طور پر یوپی گورنمنٹ نے بیسٹ ٹیچر کا سرٹیفکیٹ دیا۔ فخرالدین علی احمد اکادمی کی طرف ایک مشاعرے کی صدارت کے دوران سند توصیف اور میڈل دیا۔ دیگر ادبی انجمنوں اور سوسائٹیوں سے کئی بار سپاسنامے اور ایوارڈ ملے۔ مجھے جب 'حسینی شاعر' کا ایوارڈ ملا تو مجھے بہت اچھا لگا۔ یہ سب میرے کمرے میں کتابوں کے ہمراہ سجے ہیں۔

س ج: اردو زبان کے حال و مستقبل پر کوئی تبصرہ کیجیے؟

ذ ج: دنیا کی سب سے کم سن اور ہونہار زبان اردو ہے۔ محلوں سے خانقاہوں تک۔ درباروں سے بازاروں تک۔ خواص سے عوام تک۔ ہر قوم سے اس کا رشتہ رہا ہے۔ ماضی بے حد تابناک تھا۔ حال فی الحال بدحال ہے۔ مگر مستقبل بھی تاریک نہیں ہے۔

س ج: آپ کی نظموں، غزلوں، مرثیوں، افسانوں میں ہر جگہ کربلا موجود ہے۔ کیوں؟

ذ ج: میرا خیال ہے کہ۔ کربلا۔ ایسا کائناتی موضوع ہے جس کے پہلو میں فلسفۂ موت و حیات کا دل دھڑک رہا ہے۔ اس حساس پوائنٹ کی سطح کے اندر و باہر جو چیز سانس لے رہی ہے وہی تو جان سخن ہے۔

س ج: 'اردو دنیا' کے متعلق کیا خیال ہے؟

ذ ج: ساجد میاں! آج ساقی، نقوش، نگار، افکار، ادب لطیف، عالمگیر، کارواں، فنون، شب خون، شاعر کے نقش ونگار اسی آئینے میں جلوہ ریز ہیں۔ اردو دنیا واقعی اردو دنیا ہے۔ اس میں فکر و تحقیق ہے۔ اپنے رنگ میں یہ جریدہ ہمہ رنگ ہے۔ واقعی یہ پھول خوشبودار ہے۔ اس معیاری جریدے کو ابھی تک معتبر اور ذہین مدیر ملتے رہے ہیں۔

س ج: اپنے قارئین کی نذر اپنے کچھ پسندیدہ اشعار کرنے کی زحمت کریں گے؟

ذ ج: ابھی تک ایسا ایک شعر بھی نہیں کہہ سکا۔ اور دوسرا خوف بقول غالب

کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ
شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

س ج: آخری سوال حقیر اور اپنے قارئین کو کوئی نصیحت ارشاد فرمائیں؟

ذ ج: اردو، اردو والوں کی تہذیب و شناخت ہے اس لیے دوستو!۔ اردو بولیے اردو پڑھیے، اردو لکھیے، جسم بے کار ہے اگر روح نہ ہو چاند میں دھبہ سہی مگر نور تو ہے۔ اور نور ظلمت شکن طاقت کا نام ہے۔ یہی میرا پیغام محبت ہے۔

س ج: کوئی خواہش....؟

ذ ج: ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان، لیکن پھر بھی کم نکلے

اور

زنداں میں بھی شورش نہ گئی اپنے جنوں کی
اب سنگ مداوا ہے اس آشفتہ سری کا

بس میاں ساجد صاحب!۔ اب تھک چکا ہوں۔ آخری منزل آواز دے رہی ہے۔ خدا حافظ!

■

Azadar Husain Sajid Jalalpuri
Mohalla: Jafrabad, Post: Jalapur
Distt.: Ambedkar Nagar - 224149 (UP)
Mob.: 7571867185

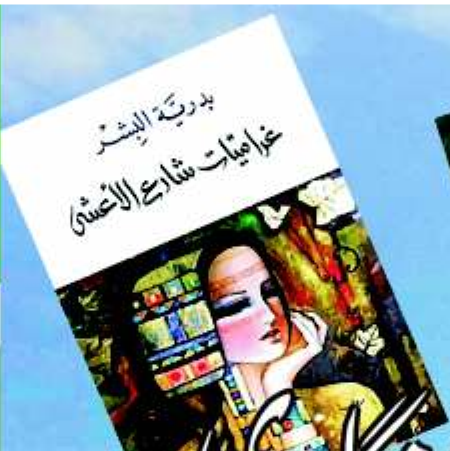

صہیب عالم

سعودی عرب میں ناول نگاری

ایک مختصر جائزہ

سعودی ناول نگار عالم عرب کی جدید عرب تحریکات اور تجربات خاص طور سے مصر کی عربی ناول نگاری سے متاثر ہوئے ہیں۔ اس کی کئی وجوہات ہیں ان میں سب سے بڑی اور اہم وجہ مصر کا حجاز سے قریب ہونا اور مصر میں سعودیوں کا حصول تعلیم ہے۔ سعودی میں ناول نگاری کا آغاز عبد القدوس انصاری کے ناول التوأمان جو کہ 1930 میں نشر ہوا ہے اس سے ہوتا ہے۔ یہ ناول سعودی تاریخ کا ایک بیانیہ اور ایک ثقافتی جدوجہد اور کشمکش کا منظر نامہ ہے۔ اس ناول کے بعد بہت سارے ناول پے در پے منظر عام پر آئے جو معاشرتی پہلوؤں پر مرکوز تھے۔ کچھ ناقدوں اور دانشوروں کا کہنا ہے کہ حامد دمنہوری کا ناول ثمن التضحية جو کہ 1959 میں شائع ہوا، یہی اس مرحلے کے اولین ناولوں میں سے ہے اور کچھ لوگ حامد دمنہوری کو سعودی ناول نگاری میں ایک بنیاد گزار مانتے ہیں۔ اس ناول میں فنکارانہ تکنیکی پہلو جامع طور سے نظر آتا ہے۔ پھر ابراہیم الناصر الحمیدان نے سعودی ناولوں میں ایک نئی روح پھونک دی۔ ان کے ناول ثقوب في رداء الليل 1961 میں اور سفينة الموتى 1969 میں منظر عام پر آئے جو جدید افسانوی فنی تکنیکی بنیادوں پر مبنی تھے۔ پھر یہی ناول 1989 میں سفينة الضياع کے نام سے منظر عام پر آیا۔ اس ناول کا پلاٹ سعودی دار الحکومت ریاض اور اس کے اسپتالوں کے گرد گھومتا ہے۔ جہاں تک ابراہیم الحمیدان کے ناول ثقوب في رداء الليل کا تعلق ہے یہ گاؤں اور شہر کے مابین کشمکش کی عکاسی کرتا ہے۔ یہ ناول سعودی تاریخ کا پہلا افسانوی بیانیہ ہے جو گاؤں اور شہر کے مابین تقابلی رشتے پر روشنی ڈالتا ہے۔ اس موضوع کو ابراہیم الناصر نے اپنے ناول عذراء المنفن جو کہ 1977 میں شائع ہوا کثرت سے پیش کیا ہے۔ اس ناول کی اشاعت سے پہلے خاص طور پر 1973 میں ایک عظیم سعودی ناول نگار عبدالرحمٰن منیف کا ناول الأشجار واغتيال مرزوق نے سعودی کے ادبی حلقوں میں ایک بڑا مقام بنایا اور خصوصی پذیرائی حاصل ہوئی ہے۔

1977 میں عبداللہ جمعان کا پہلا ناول القصاص شائع ہوا۔ اس کے بعد غالب حمزہ ابوالفرج کا ناول الشياطين الحمر شائع ہوا۔ گذشتہ صدی کے ستر کی دہائی کے ناول اکثر مرد اور عوت کے باہمی تعلقات اور خاندانی کشمکش کی عکاسی کرتے ہیں۔ دانشوروں اور محققین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اسّی کی دہائی سعودی ناول نگاری کا ایک اہم موڑ ہے۔ اس کی وجہ سعودی معاشرے کی زندگی میں رونما ہونے والی متعدد تبدیلیاں ہیں جس کے نتیجے میں کئی ایک معیاری ناول منظر عام پر آئے، اس عمل میں مشرقی اور مغربی ثقافتی لین دین، سعودیوں کا مغربی ممالک میں تعلیم کا حصول اور ان کے اندر نئے تخلیقی شعور کو تحریک دینا شامل ہے۔ 1980-89 کے مابین تقریباً 17 ناول شائع ہوئے۔ جن میں سب سے زیادہ مشہور محمد عبدہ یمانی، سلطان القحطانی، امل شطا، ابراہیم الناصر الحمیدان، عصام خوقیر، حمزہ بوقری، عبد اللہ جفری، عبدالعزیز الصقعبی اور عبدالعزیز مشری کے نام شامل ہیں۔ عبدالعزیز نے شہر اور گاؤں کے درمیان کشمکش کی تصویر پیش کی ہے، جب کہ الصقعبی نے اپنا ناول رائحة الفحم کو منظوم تحریر کیا ہے۔ صحیح معنوں میں ان ناولوں کو سعودی عرب کے جدید ناول کا آغاز کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔

دوسری خلیجی جنگ کے نتیجے میں ناولوں میں اقدار کی کمزوری، شناخت اور کچھ ان تلخ حقیقتوں کی عکاسی ملتی ہے جس نے سعودی معاشرے کو متاثر کیا ہے اور جس کے تلخ تجربے سے سعودی معاشرہ گذر رہا ہے۔ اور اس پس منظر میں سوالات کا ایک انبوہ جمع ہوگیا ہے، جس نے بہت سارے نوجوانوں کو متاثر کیا اور یہ نوجوان جوابات کے متلاشی ہیں۔ اس مرحلے کی ابتداء غازی القصیبی کے ناول شقة الحرية اور ڈاکٹر ترکی الحمد کے ناول العدامة اور اس کے بعد عبدہ الخال کے ناولوں سے ہوئی ہے۔ اس دوران کچھ اور نوجوان ناول نگاروں کے نام سامنے آئے، خاص طور سے عبدالحفیظ الشمری، محمد المزینی، عبداللہ التعزی، محمد حسن علوان، یوسف المحیمد کے نام پیش کیے جا سکتے ہیں۔ اس فن میں مرد ناول نگار کے ساتھ ساتھ خواتین ناول نگار نے بھی طبع آزمائی کی جیسے رجاء عالم، نورہ الغامدی، لیلی الجہنی مہا الفیصل، نداء ابوعلی، رجاء الصانع، بدریہ البشر، امیمہ الخمیس ہیں۔ ان کے ناولوں میں اتحاد اور فلسفہ حیات جیسے موضوعات ملتے ہیں۔ الشمری کا ناول فيضة الرعد کو ناقدوں نے دوسرے دور کا آغاز سمجھا۔ جس نے ناول کی ساخت اور ہیئت کے سابقہ تجربات کو مسترد کر دیا ہے۔

11 ستمبر کے واقعے نے سعودی عرب کے ادبی منظر نامہ میں تخلیقی صلاحیتوں کو مہمیز کرنے میں ایک اہم رول ادا کیا ہے۔ نوجوان اس واقعے سے جذباتی سطح پر متاثر ہوئے، ناول کے علاوہ دوسرے ادبی اصناف پر 11 ستمبر کے واقعات کا ایک نمایاں اور گہرا نقش پایا جاتا ہے۔ خالد الیوسف کا ناول وديان الابريزي اس کڑی کا ایک اہم ناول ہے، جس میں عشقیہ روداد کے علاوہ ایک حقیقت پسندی کا اظہار کیا گیا ہے۔ بے چین ضمیر اور

ذہن و دماغ کی حالت کو نمایاں کیا گیا ہے۔ انسانی نفسیاتی جذبات کو مربوط کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ سعودی ناولوں میں یہ نئی خصوصیت اور ساخت کی موجودگی مضبوط طور پر نظر آتی ہے۔

اعداد وشمار کے مطابق 1930 سے 2010 کے دوران خالد الیوسف کے شائع شدہ ناولوں کی تعداد تقریباً 580 ہے۔ جب کہ دوسرے اعداد وشمار کے مطابق ناولوں کی تعداد 720 ہے۔ لیکن یہ بات قطعی طور پر یقینی ہے کہ مملکت سعودی عرب میں تعلیم کی شرح نمو اپنے عروج پر پہنچ چکی ہے اور دیگر ثقافتوں کے ساتھ ان کا لین دین اور جدید مواصلات سے رابطہ نے اس میدان میں ایک نئی روح پھونک دی ہے۔ سعودی عرب میں ناول لکھنے کا ایک غیر معمولی رجحان پیدا ہوا ہے۔ محققین، دانشوروں اور نقادوں نے اس کے مندرجات، رجحانات، فنکارانہ طریقوں اور دوسرے مصنفین کا مطالعہ کرنے پر زور دیا ہے۔ سعودی عرب کی تاریخ میں ناولوں نے بہت سارے مسائل بھی کھڑے کیے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ نوے کی دہائی کے آغاز سے ہی رومانوی تخیل کی برتری ان موضوعات میں سے ایک ہے جن پر سعودی قلم کاروں کی تخلیقات سامنے آئی ہیں، اس ادبی میدان میں بہت سارے سوالات اور مباحثات بھی جنم لیے ہیں۔

سعودی عرب کے ماہر، خالد الیوسف کے مطابق، سعودی عرب میں فکشن بہت تیزی سے پروان چڑھا ہے۔ سنہ 2005 میں 26 ناولز اور 2006 میں 50 ناول میں شائع ہوئے ہیں۔ ایک عمدہ مثال نوجوان ناول نگار ابراہیم بادی کا ناول حب فی السعودیة کی ہے جس میں اس نے بڑی دیدہ دلیری سے سعودی کے رومانوی موضوعات سے بحث کیا ہے۔ یہ ناول 2007 میں بیروت کے دار الآداب سے شائع ہوا تھا۔ لیکن عرب بیانیہ کی روایت میں اس ناول کا مغرب سے درآمد شدہ جدیدیت کے مخالفین اور اس روایت کے حامیوں نے خیر مقدم نہیں کیا ہے۔

غازی القصیبی کا ناول شقة الحرية جو ریاض سے 1994 میں شائع ہوا تھا، جس کے اب تک کئی ایڈیشن منظر عام پر آچکے ہیں۔ اور اس کا انگریزی ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔ ترکی الحمد ایک مفکر اور سیاسی مصنف ہیں ان کا ایک ناول أطياف الأزقة المهجورة 1998 میں بھی شائع ہوا۔ اس میں کوئی شک نہیں الحمد کا ناول عصر حاضر کے سعودی ناول کی تاریخ میں ایک بنیادی مرحلہ کی عکاسی کرتا ہے اور ایک سماجی اور سیاسی نظریہ پیش کرتا ہے۔ یہ ناول نگار حقیقت پسندانہ انداز میں معاشرے کے تضادات کو پیش کرتا ہے۔ نوجوان ادیب رجاء الصانع کا پہلا ناول بنات الرياض ہے جو 2005 میں شائع ہوا تھا، جو نسائی دنیا کے رازوں کو واشگاف کرتا ہے، جو اپنے اپ میں ایک سنگین امر تھا۔ یہ ناول پہلے کچھ سالوں میں 60 ہزار سے زیادہ فروخت ہوا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ڈیجیٹل انقلاب نے ادب کے میدان میں ایک بہت بڑا اثر ڈالا ہے۔ 1990 کی دہائی کے آخر سے آن لائن پریس، ویب سائٹس اور بلاگ عام ہو چکے ہیں، جس سے مصنفین کو زیادہ موثر آسان اور وسیع نیٹ ورک مہیا ہوا ہے۔ ہمیں انٹرنٹ اور چیٹنگ کی دنیا میں ترتیب پانے والے ناول بنات الرياض میں اس کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ اس میں ریاض کا ایک نوجوان اپنے آن لائن گروپ میں اپنی محبت کا اظہار کرتا ہے۔ ہر جمعہ کو ایک نوجوان سعودی خاتون اپنے دوستوں کی ایک ای میل بھیجتی ہے جس میں اس کی محبت کی زندگی اور اپنے تین دوستوں کی زندگی کو بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے۔ اس ناول کے تئیں منفی ومثبت دونوں طرح کی آراء سامنے آئی ہیں۔

سعودی ناول کا نشو ونما کئی ارتقائی مرحلے سے گذرا ہے۔ اور ہر ایک مرحلے میں ایک فنی اور تکنیکی قدروں کا اضافہ ہوا ہے۔ سماجی ومعاشرتی ڈھانچے سے سعودی عربیہ کی ناول نگاری مربوط ہے۔ ان ناولوں میں سماجی تغیرات اور ترقیات کی نمایاں جھلک نظر آتی ہے۔ ابتدائی مرحلے کے ناول نگار جس کی ابتدا 1930 سے ہوئی ہے اور اسی دوران سعودی عرب کا وجود میں آنا یہ ایک ایسا مرحلہ تھا جس میں قومی وحدت، وطن اور بادشاہی کی فکر اور سیاسی کشمکش نمایاں طور سے نظر آتی ہے، اس مرحلے کے ادبا نے نئی مملکت کے خط وخال اور اس کے نزاعی معاملے سے بحث کی ہے۔

ناول کے ناقدوں کا کہنا ہے کہ گذشتہ صدی کی ساٹھ کی دہائی میں سعودی تانیثی ناول نگاروں کا ظہور ہوا۔ اس میں سب سے زیادہ نمایاں نام سمیرہ خاشقجی کا ہے جو کہ سعودی کے باہر شائع ہوا۔ اور ساٹھ کی دہائی سے اسّی کی دہائی کے درمیان جو تانیثی ناول سامنے آئے وہ سعودی معاشرے کے تعلیمی اور سماجی نتیجے کی پیداوار نہیں بلکہ شخصی تانیثی تجربے کی بنیاد پر تھے جو کہ سعودی

معاشرے کے باہر ثقافتی اور تعلیمی تحریکات سے متاثر تھا، اس سلسلے میں سمیرہ خاشقجی کے علاوہ ہدی الرشید، ہند باغفار کے ناول ہیں جو اس دوران شائع ہوئے۔ ان کے بعد فوزیہ ابو خالد وشریفہ السمان کا نام آتا ہے جنھوں نے دوسرے ماحول میں تعلیم اور ثقافت کو سیکھنے میں کافی محنت کی اور ان کے اکثر ناول غیر سعودی معاشرے کے اردگرد گھومتا ہیں۔ جیسے کہ نكريات دامعه، بريق عينيك، قطرات من الدموع جوکہ سعودی کے باہر لکھے گئے۔ جس میں ناول نگاروں کا وطن سے دوری کا درد، روز رونما ہونے والے حادثات اور لوگوں کی پریشانی کے عکاس ہیں، یہ ناول سعودی معاشرے کے سماجی پہلوؤں کو نظر انداز کرتے نظر آتے ہیں، اسی طرح سے ہند باغفار کا ناول البراء ة المفقودة اور ہدی الرشید کا ناول غدا سيكون الخميس ہیں جوکہ ستر کی دہائی میں شائع ہوا، بیرون سعودی عرب کی دنیا کی عکاسی کرتا ہے، اس کے مقابل نوے کی دہائی کے تانیثی ناول جیسا کہ لیلی جہنی کا ناول الفردوس اليباب، نورہ الغامدی کا ناول (وجهة البوصلة) ہے، یہ وہ اولیں ناول ہیں جوکہ سابقہ ناولوں سے ہٹ کر سعودی معاشرے کے اندرونی ثقافتی وسماجی پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہیں۔ اور ان ناولوں کو شہرت بھی ملی۔ چونکہ ناول معاشرے کا آئینہ ہوتا ہے اور زماں ومکاں سے جڑا ہوتا ہے، ان سارے تجربات جو سعودی میں ثقافتی اور تعلیمی بیداری کے بعد سامنے آئے ہیں اس میں نمایاں طور سے دکھا جا سکتا ہے۔ جس نے ایک الگ رجحان پیدا کیا۔ ان ناولوں میں اُمل شطا کا ناول غدا أنسى! رجاء العالم کا ناول ٤ صفر اور بهیہ بوبسیت کا ناول درة من الاحساء، وصفیہ عنبر کا ناول وهج من بين رماد السنين وصفیہ بغدادی کا ناول ضياع والنور يبهر، کا نمایاں طور سے ذکر کیا جا سکتا ہے۔

سیاسی، سماجی اور اقتصادی تغیرات کا سعودی ناول نگاروں پر کافی اثر پڑا ہے جیسے کہ نوے کی دہائی کے ناولوں میں امریکہ کا عراق پر حملہ، اور خلیجی ممالک کا جنگ میں چلے جانا اور اس کا سیاسی، عسکری اور اقتصادی اثر آج تک محسوس کیا جا سکتا ہے۔

غازی القصیبی کے ناولوں میں شقة الحرية، العصفورية، اور (7) وغیرہ کافی اہم ہے۔ نوے کے دور میں کچھ نمایاں ناولوں کا ذکر کرنا مناسب ہوگا اس میں عبد اللہ التعزی کا ناول الحفائر تتنفس، محمد حسن علوان کا ناول سقف الكفاية ویوسف المحیمد کا ناول فخاخ الرائحة وعبد الحفیظ الشمری کا ناول فيض الرعد اور ابراہیم شحی کا ناول أنثى تشطر القبيلة ہے۔ محمد عزیز العرفج کا ناول الدور الأعلى، عبد الرحمن منیف کا ناول مدن الملح، بدریہ البشر کا ناول غراميات شارع الأعشى، ترکی الحمد کا ناول الكراديب، العدامة اور الشميسي، رجاء العالم کا ناول طوق الحمام، عبدہ الخال کا ناول مدن تأكل العشب، عبد اللہ نائب کا ناول مكان موجف، فهد شقيق، وجه النائم، موسی العلوی کا ناول زرياب مقبول، محمد المزینی کا ناول حكومة الظل، منذر القباني، ضرب الرمل، وصلاح قرشی کا ناول بنت الجبل، ساق الغراب، فرح العماری کا ناول مدينة النجوم ویوسف المحیمد کا ناول الحمام لا يطير في بريده اور رجاء عالم کا ناول ستر ہے۔ سلطان طاہر عیاض کا ناول انسان وشيطان بین الاقوامی شہرت کی بلندیوں کو چھونے لگا ہے۔

سعودی ناول نگاروں کو رائٹرز ایوارڈ، گریٹ وومن ایوارڈ، قومی اور بین الاقوامی جیسے متعدد انعامات واکرامات سے نوازا گیا ہے۔ اس سلسلے میں عبدہ الخال کا ناول ترمی بشرر، رجا العالم کا ناول طوق الحمام اور محمد حسن علوان کا ناول موت صغیر کا ذکر کرنا مناسب ہے جسے 2010، 2011 اور 2017 میں بوکر ایوارڈ عطا کیا گیا ہے۔ اسی سلسلے میں ایک قابل ذکر پہلو یہ ہے کہ سعودی عرب سے تعلق رکھنے والی ریتاج الحازمی کو دنیا کی کم عمر ناول نگاری کی حیثیت سے گنیز بک آف ریکارڈز میں شامل کرنے کے لیے نامزد کر لیا گیا ہے۔ اور اس کم عمر مصنفہ کے دو ناول شائع ہو چکے ہیں اور دو ناولوں پر کام کر رہی ہیں۔ انھوں نے ایک ناول بچوں کے لیے بھی لکھا ہے۔ ان کا پہلا ناول تراث البر المفقود اور دوسرا ناول Portal of Hidden World ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ سعودی ناولوں نے عالم عرب کے ادبی حلقوں میں ایک نمایاں اور اہم مقام بنایا ہے۔ کچھ ناولوں کا کئی عالمی زبانوں میں ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔ بعض عالمی ادب کے ناقدوں نے ان کی کوششوں اور کاوشوں کی ستائش بھی کی ہے۔ سعودی کے رومانوی وتخیلاتی ناولوں کو کافی شہرت ملی ہے، سعودی ناول نگاروں نے مکمل آزادی کے ساتھ اپنے احساسات اور جذبات کا بے باکانہ اظہار کیا ہے۔ اس سلسلے میں سب سے اہم ناول حكاية الحب اور ألف امرأة في جسدي، كفن الحب ہے۔ سعودی ناولوں کا امتیازی وصف یہ ہے کہ اعلی ذوق، زمان ومکان کی مضبوط بناوٹ اور ادبی ساخت کی تنسیق اور ہم آہنگی ہے۔

اس مضمون کی تیاری میں مندرجہ ذیل مقالات سے استفادہ کیا گیا ہے:

1. سلون الميمان، الرواية السعودية المعاصرة وتحديات (عربی ترجمہ: خدیجہ حلفاوی)، 2017
2. حسن النعمي، مراحل تطور الرواية السعودية، مجلة الجسرة الثقافيه، 2020
3. محمد عبدالله المزيني، الرواية السعودية: تاريخها وتطورها، الجزيرة، شمارہ نمبر 14210، 2011۔

■

Dr. Suhaib Alam
Asst Prof. Dept of Arabic
Jamia Millia Islamia
New Delhi - 110025

جسیم الدین

بوکر انعام یافتہ ناول نگار

عبدالوہاب عیساوی

الجزائر کی سرزمین حالیہ دنوں میں عربی ناول نگاری کے لیے زرخیز ثابت ہورہی ہے، یہاں مرد ناول نگاروں کی جہاں بڑی تعداد ہے، وہیں خواتین ناول نگار بھی نہ صرف اپنی موجودگی درج کرارہی ہیں، بلکہ ناول نگاری میں مردوں کے شانہ بہ شانہ چل رہی ہیں۔ حال ہی میں جزائری ناول نگار عبدالوہاب عیساوی کو ان کے تاریخی ناول 'الدیوان الاسبرطی' پر انھیں بوکر پرائز سے سرفراز کیا گیا۔ عبدالوہاب عیساوی پہلے جزائری ناول نگار ہیں جنھیں پرائز 2020 سے سرفراز کیا گیا ہے۔ 1985 میں جزائر کے 'الجلفة' ریاست کے 'حاسی بحبح' شہر میں پیدا ہونے والے اس نوجوان عربی ناول نگار کے اشہب قلم سے 'سیرا دی موریتی' (تاریخی ناول)، 'سینما جاکوب'، 'الدوائر والابواب'، 'سفر اعمال المسیّین'، اور 'الدیوان الاسبرطی' جیسے شہرۂ آفاق ناول منظر عام پر آکر شرف قبولیت حاصل کرچکے ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ پیشے سے الکٹرانک انجینئر عیساوی نے نہایت قلیل مدت میں ایسے ادبی سرمایے قوم کو دیے کہ آج الجزائر عربی ناول نگاری میں سرفہرست ہے۔ یہاں ایک سے بڑھ کر ایک ناول نگار اپنے فکر وفن سے ادبی سرمایے میں غیر معمولی اضافہ کررہے ہیں۔ واسینی الاعرج، احلام مستغانمی، آسیا جبار، امل بوشارب، عائشہ بنور وغیرہ کے نام بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ تاریخ اقوام کے لیے قیمتی اثاثہ ہے اور تاریخی ناول اس اثاثے اور سرمائے کی حفاظت کا بہتر اور مؤثر ذریعہ۔ کسی بھی کہانی میں کردار وں کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا مگر ہیرو کسی بھی ناول کا اہم، مرکزی اور اولیت و مقبولیت رکھنے والا کردار ہوتا ہے۔ تاریخی ناولوں میں ہیرو کے کردار کی اہمیت دو چند ہوتی ہے۔ ادبی اعتبار سے دیکھا جائے تو ناول نگاری ادب کی ایک ایسی صنف ہے جو ماضی و حال کی تاریخی روش و مقاومتی تحریکوں سے آشنائی میں کافی موثر رہی ہے۔ تاریخی واقعات کو ایک کہانی کے روپ میں پرویا جائے تو فکر ونظر پر چھا جاتی ہے۔ تاریخی واقعات کو ناول کے سانچے میں ڈھالنا ایک ادبی روش رہی ہے۔ 'الدیوان الاسبرطی' بھی تاریخی ناول ہے۔ جسے بوکر پرائز کے لیے منتخب کیا گیا ہے۔ ادب خواہ کسی زبان کا ہو، وہ سماج کا آئینہ ہوتا ہے، ادب سے ہی انسان کی امیدیں اور خواب آشکارا ہوتے ہیں، ادب کا کام ہی سماجی مسائل کو پیش کرنا ہے۔ ادب اور ادبا کی قدر دانی کا معیار کوئی بڑا سے بڑا انعام نہیں ہوتا، بلکہ یہ قابل قدر خدمات کے اعتراف کا ایک وسیلہ ہے۔ الگ الگ زبانوں میں ادبا اپنے گرد وپیش کے سماجی، انسانی ومعاشرتی مسائل کو اپنا موضوع بناتے ہیں، دنیا کے دیگر علوم وفنون کی طرح ادب بھی ایک فن ہے جس کے واضح اثرات دیگر تمام علوم پر پڑتے ہیں اور اس کا تعلق براہ راست سماج اور اس کے روزمرہ مسائل سے ہوتا ہے۔

نوبل پرائز کے بعد بوکر پرائز عالمی سطح کا دوسرا سب سے بڑا ادبی انعام ہے، جو عربی ادبیات کے لیے مختص ہے۔ 2007 میں الجائزة العالمية للرواية العربية (انٹرنیشنل پرائز فار عربک فکشن) کے نام سے عالمی سطح کا ایوارڈ مقرر کیا گیا، جس کا انتظام وانصرام حکومت متحدہ عرب امارات کی وزارت سیاحت وثقافت اور 'مؤسسة جائزة بوكر البريطانية' (برٹش بوکر پرائز فاؤنڈیشن) کے ذمہ ہے۔ اس کا مرکزی دفتر ابوظبی میں واقع ہے۔ رواں سال سے متصل سال میں لکھے گئے کم ازکم 100 ناول کو بوکر پرائز کے لیے ابتدائی مرحلے میں قبول کیا جاتا ہے، بعد میں جیوری کمیٹی (جو عرب ممالک کے ناقدین، ناول نگار اور ماہر تعلیم پر مشتمل ہوتی ہے) کے کئی مراحل سے گزر کر آخری مرحلے میں 6 ناول کو منتخب کیا جاتا ہے۔ جن میں سب سے اول نمبر پر رہنے والے ناول کو پچاس ہزار ڈالر بطور انعام دیا جاتا ہے، جب کہ باقی پانچ کو دس دس ہزار ڈالر دیے جاتے ہیں۔ یہ اتفاق ہے کہ بوکر پرائز کے لیے 2020 میں ایک سو پینتیس ناول نگاروں کی امیدواری کو قبول کیا گیا۔ امیدوار ناول نگاروں کی اولین فہرست میں چار ناول نگار کا تعلق الجزائر سے تھا اور اس سے بھی دلچسپ بات یہ ہے کہ سعید خطیبی اور عبدالوہاب عیساوی پہلی بار امیدوار کی حیثیت سے شامل ہوئے اور 'الدیوان الاسبرطی' کو بوکر پرائز 2020 کے لیے منتخب کیا گیا۔ رواں سال بوکر پرائز کے لیے جن چھ ناول کا انتخاب کیا گیا، ان میں عالیہ ممدوح عراقی کا 'التانکی'، سعید خطیبی جزائری کا 'حرب سراییفو'، خلیل الرزیریا کا 'الحی الروسی'، یوسف محمد احمد زیدان مصری کا 'فردقان اعتقال الشیخ الرئیس'، جبور الدیہی لبنانی کا 'ملک الهند' اور عبدالوہاب عیساوی جزائری کا ناول 'الدیوان الاسبرطی' شامل تھے۔

یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ 'الدیوان الاسبرطی' پر بھی بات کی جائے۔ اس میں ناول نگار نے جزائر کی انیسویں صدی کی صورتحال اور فرانسیسیوں کے ظالمانہ سلوک کو بتایا ہے، یہ ناول عمدہ اسلوب اور مختلف آہنگ کے ساتھ قاری کو الجزائر کے سیاسی، معاشرتی ابعاد کے ساتھ ماضی کی تاریخ سے روشناس کراتا ہے۔ یہ ناول قاری کو جہاں جزائریوں پر ہونے والے فرانسیسی مظالم کو بتاتا ہے، وہیں نسل نو کو اس بات پر ابھارتا ہے کہ اپنے پرکھوں کی ہمت وحوصلہ سے سبق لے کر اب بھی ظلم وزیادتی کے خلاف صف بستہ ہونا پڑے تو اس میں کوئی تامل نہیں ہونا چاہیے۔ ناول کے مرکزی کردار میں ایسے پانچ اشخاص کو پیش کیا گیا ہے جو الجزائر کے شہر المحروسة میں، 1815 سے 1833 کے درمیان ایک دوسرے کے ساتھ گھل مل جاتے ہیں۔ سب سے پہلا کردار صحافی 'ڈیبن' کا ہے، جو ایک رپورٹر کی حیثیت سے الجزائر کے خلاف صلیبی جنگ کے دوران آئے تھے اور دوسرا کردار

’کافیاز‘ کا ہے، جو نپولین کی فوج میں سپاہی تھے، پھر اس مہم کی منصوبہ بندی کی۔ الجزائر کی تین شخصیات جن کے عہدے مختلف ہیں۔ ان کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ انقلاب ہی موجودہ نظام کی تبدیلی کا واحد راستہ ہے۔ جہاں تک پانچویں کردار کا تعلق ہے تو وہ ’دوجۃ‘ نام کی دوشیزہ ہے، جس کا کردار صرف اتنا ہے کہ وہ ’المحروسۃ‘ کی تبدیلیوں کو دیکھتی ہے اور اپنی بہتر زندگی کی طلب میں آزادانہ مزاج کے ساتھ جینا چاہتی ہے، لیکن جبری طور پر اسے ’المحروسۃ‘ میں رہنا پڑتا ہے اور اس شہر کی شرائط کے مطابق چلنا پڑتا ہے۔ ناول پڑھ کر جہاں جزائر کی ایک صدی کی تاریخ سے آشنائی ہوتی ہے، وہیں جزائر کی سماجی، تہذیبی اور تاریخی زندگی سے بھی واقفیت ہوتی ہے۔ ناول کا مرکز ومحور جزائر کی ظلم وجبر سے بھری تاریخ کا اعادہ ہے، عیساوی اپنی فنکارانہ صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے جہاں جزائر کی غیور قوم کی روشن تاریخ کو بیان کرتے ہیں، وہیں نوجوان نسل کو اپنی روشن تاریخ سے سبق لے کر میدان عمل میں کودنے کی تلقین بھی کرتے ہیں، انھوں نے نہ صرف حالات وواقعات بیان کیے ہیں، بلکہ نامناسب رسم ورواج، ناموزوں طریقوں پر تنقید بھی کی ہے اور جزائری عوام کے لیے نئی روشنی اور نئی فکر پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ پانچ ابواب پر مشتمل 388 صفحات کے ناول کی اشاعت دار میم الجزائر کی طرف سے ہوئی ہے۔

الجزائر (عربی) جسے انگریزی میں الجیریا (Algeria) بھی کہتے ہیں، شمالی افریقہ میں واقع ایک ملک ہے۔ رقبے کے اعتبار سے بحیرۂ روم پر واقع، عرب دنیا اور افریقی براعظم میں سوڈان کے بعد سب سے بڑا ملک ہے۔ دنیا میں اس کا 11واں نمبر ہے۔ الجزائر کے شمال مشرق میں تیونس، مغرب میں مراکش، جنوب مغرب میں مغربی صحارا، موریتانیا اور مالی ہیں۔ جنوب مشرق میں نائیجیریا جبکہ شمال میں بحیرہ روم واقع ہیں۔ اس کا رقبہ تقریباً 24 لاکھ مربع میل جب کہ آبادی 3 کروڑ 57 لاکھ نفوس پر مشتمل ہے۔ الجزائر کے دار الحکومت کا نام بھی الجزائر ہے۔ الجزائر عرب لیگ، اقوام متحدہ اور اوپیک کا رکن ہے۔ الجزائر کو خیر الدین بربروا اور اس کے بھائی عروج نے 1517 میں سلطنت عثمانیہ سے جوڑ دیا تھا۔ 1541 میں رومن سلطنت کے بادشاہ چارلس پنجم نے الجزائر پر 65 بحری جنگی جہازوں اور 23 ہزار فوجیوں کی مدد سے حملہ کر دیا۔ اس فوج میں دو ہزار گھڑ سوار بھی شامل تھے۔ تاہم انھیں بدترین شکست ہوئی اور الجزائر کے رہنما حسن آغا کو قومی رہنما مان لیا گیا۔ الجزائر بہت بڑی فوجی قوت بن کر ابھرا۔

عثمانیوں نے الجزائر کی موجودہ سرحدیں شمال میں قائم کر دیں۔ عثمانی جہادیوں کے لیے الجزائر کے ساحل پڑاؤ کا کام کرنے لگے۔ 17ویں صدی میں عثمانیوں کے امریکی بحری جہازوں پر حملوں کی وجہ سے پہلی اور دوسری بربر جنگیں ہوئیں۔ دونوں اطراف کی فوجیں دشمنوں کو پکڑنے کے بعد غلام بنا لیتی تھیں۔ ان لوگوں کے گہرے اثر ورسوخ کی بنا پر اس علاقے کو بربری ساحل کہا جاتا تھا۔ یہ لوگ اکثر یورپی ساحلوں پر حملہ کر کے مسیحیوں کو غلام بنا کر ترکی، مصر، ایران، الجزائر اور مراکش کے بازاروں میں بیچ دیتے تھے۔ رابرٹ ڈیوس کے مطابق 16ویں سے 19ویں صدی کے دوران دس لاکھ سے ساڑھے بارہ لاکھ یورپیوں کو غلام بنا کر بیچا گیا۔ ان لوگوں کی اکثریت اٹلی، سپین اور پرتگال کی ساحلی بستیوں کے علاوہ فرانس، انگلینڈ، آئرلینڈ، ہالینڈ، جرمنی، پولینڈ، روس، سکینڈے نیویا، آئس لینڈ، ہندوستان، جنوب مشرقی ایشیا اور شمالی امریکا سے پکڑی گئی تھی۔ ان حملوں کا اثر تباہ کن تھا۔ فرانس، انگلینڈ اور سپین کے ہزاروں بحری جہاز تباہ ہوئے اور سپین اور اٹلی کے ساحلوں کا بہت بڑا حصہ غیر آباد ہو گیا۔ 19ویں صدی تک انہی بحری قزاقوں کی وجہ سے ساحلی علاقے غیر آباد رہے۔ بعد میں اپنے سفیر کی بے عزتی کے پیش نظر فرانسیسیوں نے 1830 میں حملہ کر کے الجزائر پر قبضہ کر لیا۔ یہ جنگ بہت طویل تھی اور بہت خون خرابا ہوا۔ 1830 سے 1872 تک مقامی آبادی جنگوں اور بیماریوں کی وجہ سے ایک تہائی کم ہو گئی۔ 1825 سے 1847 تک پچاس ہزار سے زیادہ فرانسیسی الجزائر منتقل ہوئے۔ تاہم یہ منتقلی بہت آہستگی سے ہوئی کیونکہ مقامی آبادی نے اس کے خلاف بہت جہد وجہد کی۔

قبضے کے بعد فرانس نے ہر ممکن کوشش کر کے الجزائر کو فرانس کا اٹوٹ انگ بنایا۔ فرانس، سپین، اٹلی اور مالٹا سے ہزاروں کی تعداد میں آبادکار الجزائر منتقل ہوئے اور الجزائر کے ساحلی میدانوں پر کاشتکاری کے علاوہ شہروں کے اہم حصوں پر بھی قابض ہو گئے۔ ان آبادکاروں کو حکومتِ فرانس کی پشت پناہی حاصل تھی۔ 19ویں صدی کے اواخر سے الجزائر میں آباد یورپی النسل افراد اور الجزائری یہودیوں کو فرانس کا شہری تسلیم کر لیا گیا۔ الجزائر کی 1962 میں آزادی کے بعد یہاں یورپی النسل افراد کو کالے پیروں والے کہا جانے لگا کیونکہ آبادکار کالے بوٹ پہنتے تھے۔ تاہم یہ نام محض جنگ کے لیے لیا جاتا تھا۔ تاہم مسلمان الجزائری باشندوں کی بہت بڑی اکثریت کو بشمول پرانے فوجیوں کے، فرانسیسی شہریت اور ووٹ کے حق سے محروم رکھا گیا۔

’الدیوان الاسبرطی‘ میں عیساوی نے جنوبی فرانس میں واقع شہر ’طولون‘ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

’طولون کا نقشہ خوشی کے ایک تہوار کے طور پر ذہن کے نگارخانے میں گشت کرنے لگتا ہے، چند مانوس چہرے نمودار ہوتے ہیں اور چند دیگر نامانوس چہرے سڑکوں پر نظر آتے ہیں، تاحد نگاہ لشکر کی صفیں ہیں، بوجھل قدموں کے ساتھ بندرگاہ کی طرف رواں دواں ہیں، ہر شخص اس مقدس جنگ کا حصہ بننے کا متمنی ہے، جو اپنے پرکھوں کی عظمت رفتہ کی بازیابی چاہتا ہے، ہر کوئی آسمانی بحری قزاق کو مٹانا چاہتا ہے جو عیسائیوں کو غلام بناتا ہے۔ ہر شخص ترکوں کی ظالمانہ علامت کو ختم کرنے کا خواب دیکھتا ہے، لیکن آج کا طولون کس حال میں ہے؟ کیا تمھیں خبر ہے کہ خوشی کی بازگشت عنقریب سنوں گا، لشکروں کے نشان قدم پر چلوں گا؟ یا لوگوں نے اپنے روز وشب کے معمول میں سرگرداں ہو کر ماضی کی اپنی تمام امیدوں کو پس پشت ڈال دیا ہے، یقیناً صورت حال ایسی ہی ہے، کیا اس شہر کا خاتمہ نہیں ہوا جس نے سبھوں کو دہشت زدہ کیا اور ترکوں سے روم کی تولیت میں آ گیا۔

اس ناول پر عرب متدین ادبا کی جانب سے تنقید کا بھی سلسلہ شروع ہو چکا ہے۔ جزائر میں فرانس کے خلاف لڑنے والے نوجوانوں نے اس ناول کی حقیقت وواقعیت پر ہی سوال کھڑے کر دیے کہ اسے بوکر پرائز صرف اس لیے دیا گیا کہ اس ناول میں ترکوں کو جزائر کی تعمیر وترقی میں ناکامی کے لیے ذمے دار مانا گیا ہے، جب کہ فرانس کو ہر معاملے میں کلین چٹ دی گئی ہے۔ اس ناول کے چار عظیم کرداروں میں دو جزائری کے کردار کو مشتبہ طور پر پیش کیا گیا ہے، جب کہ فرانس کے دو افسران کے کردار کو اچھا بنا کر پیش کیا گیا ہے، یہی اس ناول کی حقیقت ہے اور اسے ترکوں کے تئیں حقد وحسد کی وجہ سے بوکر پرائز کا حقدار مانا گیا ہے۔ بہرحال یہ حقیقت ہے کہ الجزائر کے ادبا عربی ادبیات کے عالمی منظرنامے پر اپنی نمایاں موجودگی درج کرا رہے ہیں، جو کہ قابل تقلید اقدام ہے۔ عبدالوہاب عیساوی کو بوکر پرائز سے قبل بھی متعدد قومی وبین الاقوامی اعزازات سے نوازا جا چکا ہے، جن میں ناول ’سینما جاکوب‘ پر 2012 میں رئیس الجمہوریۃ علی معاشی ایوارڈ، شارٹ اسٹوری ’حقول الصفصاف‘ پر 2013 شارجہ ایوارڈ، ناول ’سیرا دی مویتری‘ پر 2015 میں آسیا جبار ایوارڈ، ناول ’الدوائر والابواب‘ پر 2017 میں سعاد الصباح ایوارڈ، ناول ’سفر اعمال المنسیین‘ پر 2017 میں کتارا ایوارڈ بطور خاص قابل ذکر ہیں۔

■

Dr. Jaseemuddin
Dept of Arabic, Delhi University - 110007
Mob.:9711484126
Email.: jasimqasmi@gmail.com

محمد قاسم

عبدالحمید جودہ سحار

عربی ناول نگاری کا ایک درخشاں نام

جدید عربی ادب میں مصر کو نمایاں حیثیت حاصل ہے، اس مردم خیز سرزمین سے جس قدر بڑے بڑے ادبا وشعرا پیدا ہوئے اس کی نظیر کسی دوسرے ملک میں نہیں ملتی، مصر جب فرانسیسی سامراجیت کے زیرِ نگیں آیا تو وہاں کے علمی وادبی، سماجی وسیاسی حالات الغرض تمام شعبہائے زندگی پر زبردست اثر پڑا، نت نئے علوم وفنون سے روشناس ہونے کی وجہ سے عربی زبان کا دامن وسیع تر ہوگیا، افکار ونظریات میں تغیر وتبدل پیدا ہوا، خیالات میں وسعت اور بالیدگی کی راہ ہموار ہوئی، بہت سارے ادبا نے اعلی تعلیم کے حصول کی غرض سے یورپ کا رختِ سفر باندھا، وہاں جاکر مغرب کے جدید ادبی رجحانات سے واقفیت حاصل کی، اور عربی ادب میں نئی نئی مغربی اصناف متعارف کروائیں، ان ادبا میں سرفہرست رفاعہ طہطاوی، محمد حسین ہیکل، ڈاکٹر طہٰ حسین، عبد القادر المازنی، عباس محمود عقاد، محمود تیمور، توفیق الحکیم وغیرہ قابل ذکر ہیں، ان کے بعد کے مصری ادبا جو عربی ادب کو نئی اونچائیوں تک لے گئے ان میں نجیب کیلانی، علی احمد باکثیر، محمد عبدالحلیم عبداللہ، احسان عبدالقدوس، یوسف ادریس، عادل کامل، نوبل انعام یافتہ نجیب محفوظ وغیرہ شامل ہیں۔ ان ہی میں ایک نمایاں شخصیت کے مالک 'عبدالحمید جودہ سحار' بھی ہیں جو مصر کے مشہور صاحب طرز ادیب اور انشاپرداز گذرے ہیں جنھوں نے اپنی علمی اور ادبی نگارشات سے عربی ادب کی نثری اصناف میں گراں قدر اضافہ کیا ہے۔

عبدالحمید جودہ سحار 1913 میں قاہرہ کے ایک دیندار اور مذہبی روایات کے پابند خاندان میں پیدا ہوئے، ان کے والد نہایت شریف اور سلیم الطبع انسان تھے جن کا سحار کی تعلیم وتربیت میں بہت بڑا کردار ہے، سحار نے ابتدائی تعلیم پرائیویٹ اسکولوں میں بعد ازاں سلیمان جاویش اور الجمالیة پرائمری اسکول میں حاصل کی، ان سارے اسکولوں میں انھیں معمولی سی باتوں پر اساتذہ کی درشتی اور سختی کا سامنا کرنا پڑتا تھا جس کی وجہ سے ان کا دل تعلیم سے بیزار ہونے لگا، یوں تو بچپن سے ہی ان کے ذہن ودماغ پر موت کا خیال چھایا رہتا تھا اس پر مستزاد یہ کہ مدرسہ جاتے وقت شاید ہی کوئی دن ایسا ہوتا کہ راستے میں انھیں کوئی جنازہ دیکھنے کو نہ ملے کیونکہ قبرستان کا راستہ بھی ادھر ہی سے گذرتا تھا، ان سارے اسباب کی وجہ سے پڑھنے لکھنے اور اسباق کا مذاکرہ کرنے سے راہ فرار اختیار کرنے لگے۔ فٹ بال، سنیما اور تھیٹر وغیرہ سے ان کی دلچسپی بڑھتی گئی اور سارے اوقات ان جیسی چیزوں میں ہی صرف ہونے لگے، کچھ دنوں بعد ان کی فکر میں تبدیلی رونما ہوئی، اپنے بھائی احمد اور سعید اور دیگر درسی ساتھیوں کے ساتھ پڑھنے لکھنے اور مطالعہ کی رغبت میں اضافہ ہوا۔ ان کے دونوں بھائی بچپن ہی سے ادبی کتابیں پڑھنے کے شوقین تھے، رسائل وجرائد میں ان کے مضامین اور نظمیں

بھی شائع ہوتی تھیں، ان کی بدولت سحار کو بھی رسائل وجرائد کی معرفت کے ساتھ علم و ادب سے مناسبت پیدا ہوئی۔ سحار کے والد بھی علم دوست تھے گھر کے باہری حصہ میں ان کی دوستوں کے ساتھ ہر روز رات میں نشست ہوا کرتی تھی جہاں روزمرہ کے حالات پر گفتگو ہوتی پھر مشہور علما، ادبا اور مورخین کی کتابیں پڑھی جاتیں اس کے بعد حاضرین اپنے اپنے علمی ذوق کے مطابق تنقید وتبصرہ کیا کرتے تھے، سحار بھی بدستور اس مجلس میں شریک ہوا کرتے تھے اور انھیں بھی حاضرین مجلس کے سامنے بعض علمی اور ادبی کتابیں پڑھنے کے مواقع ملا کرتے تھے جس کے سبب ان کے علمی اور ادبی ذوق کو مہمیز ملی۔ ثانوی تعلیم کی تکمیل سے پہلے ہی انشا نگاری کا اچھا ذوق پیدا ہو گیا تھا، جس کے سبب ان کے عربی کے استاذ انھیں عزیز رکھتے تھے اور ان کے اسلوب تحریر کو سراہا بھی کرتے تھے، ہائی اسکول کے بعد قاہرہ یونیورسٹی کی فیکلٹی آف کامرس میں داخلہ لیا اور بی۔کام کی ڈگری حاصل کی۔

یونیورسٹی کی تعلیم کے زمانہ میں معاشیات کے موضوع پر ان کا سب سے پہلا مضمون مجلّہ الأهرام میں شائع ہوا۔ اس کے بعد افسانہ نگاری کے میدان میں طبع آزمائی شروع کی، پہلا افسانہ رحل البیت (گھر کا کھیا) مجلّہ الرسالة میں شائع ہوا، اس کے بعد وقفے وقفے سے یکے بعد دیگرے ان کی ادبی کاوشیں ڈاکٹر احمد امین اور احمد حسن زیات کی ادارت میں نکلنے والے الثقافة، الرسالة اور الرواية جیسے رسائل نیز دیگر ہفت واری جرائد میں شائع ہوتی رہیں۔ سحار مختلف میدانوں کے شہسوار تھے، انھوں نے متعدد موضوعات پر خامہ فرسائی کی، سوانحی تاریخ نگاری میں بلال مؤذن الرسول، سعدبن أبي وقاص، أبوذر غفاري، المسيح عيسىٰ بن مريم، حياة الحسين، أهل بيت النبي، أبناء أبي بكرالصديق، عمر بن عبد العزيز جیسی کاوشیں ہیں تو سیرت نبوی ﷺ کے موضوع پر بیس حصوں پر مشتمل ان کی شاہکار کتاب محمد رسول الله والذين معه ان کے وسعت مطالعہ اور فن سیرت پر قدرت کی غماز ہے۔ بچوں کے لیے اسلامی کہانیوں کی سیریز قصص الأنبياء، قصص السيرة النبوية، قصص الخلفاء الراشدين، قصص العرب في أوروبا کے عنوان سے شائع کی۔ سحار کے کئی افسانوی مجموعے منصۂ شہود پر آئے جن کے نام یہ ہیں: في الوظيفة (ملازمت میں)، همزات الشياطين (شیطانوں کے وسوسے)، صدى السنين (بازگشتِ ایام)، ليلة عاصفة (آندھی کی رات)، أرملة من فلسطين (فلسطین کی ایک بیوہ)، خفقات قلب (دل کی دھڑکنیں)، في الوظيفة (ملازمت میں) اس مجموعے کا اردو ترجمہ ''نوکرشاہی'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ سحار ایک کامیاب ناول نگار تھے انھوں نے تقریباً ایک درجن ناول لکھے۔ أحمس بطل الاستقلال (’احمس‘ مجاہد آزادی) ناول کے میدان میں سحار کی پہلی کاوش ہے، اس ناول کا کردار أحمس مصری قوم پرست نوجوان ہے جس نے مصری نوجوانوں کو ساتھ لیکر غاصب هكسوس کو مصر سے باہر بھگانے کے لیے ان کا ڈٹ کر مقابلہ کیا، جس وقت یہ ناول لکھا گیا اس وقت مصر مغربی سامراجیت کے چنگل میں محبوس تھا، کسی قسم کی برملا مخالفت قید وبند کی صعوبت کا باعث بن سکتی تھی لہٰذا سحار نے اس ناول کے ذریعہ مصری عوام خاص کر نوجوانوں کو یہ پیغام دینا چاہا کہ مصر کے اس نوجوان نے زمانۂ قدیم میں غیر مصری هكسوس کی سو سال کے عرصے پر محیط حکومت کا جس جوش، جذبہ اور منظم جدو جہد کے ذریعہ خاتمہ کر دیا تھا، ویسے ہی ہمیں بھی سامراجی طاقت کا مقابلہ کر کے ان کی حکومت کو اکھاڑ پھینکنا چاہیے۔ دوسرا ناول في قافلة الزمان (کاروانِ زمانہ کے درمیان) کے نام سے ہے اس ناول میں اٹھارہویں صدی عیسوی کے اخیر سے لیکر انیسویں صدی کی تیسری دہائی تک مصر کے سماجی حالات، معاشرے میں رائج رسم ورواج اور عقائد ونظریات کو پیش کیا ہے، یہ طویل ناول ایک تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے جس میں سحار نے ایک خاندان کی تقریباً تین نسلوں کے نشیب وفراز کا تذکرہ کیا ہے۔ الشارع الجديد (نئی سڑک) اس ناول میں مادّی، فکری اور عوامی انقلاب کے سبب مصری سماج میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کی عکاسی کی گئی ہے۔ النصف الآخر (نصف دیگر) یہ ناول ایک مالدار شخص کی گھریلو زندگی پر مشتمل ہے، یہ شخص نوجوان اولاد نیز ہر طرح کی آسائش کے باوجود اپنی بیوی کے انتقال کے بعد تکلیف دہ احساسِ تنہائی سے باہر نکلنے کے لیے دوسری شریک حیات کی تلاش میں رہتا ہے، دوسری شادی کرنے کے بعد اسے اپنی اولاد خاص کر اکلوتی لاڈلی بیٹی کی سخت مخالفت کا سامنا کرنا پڑتا ہے، بھی کے رویے میں تبدیلی کے سبب پورے گھر کا ماحول تبدیل ہو جاتا ہے لیکن بعد میں جب انھیں یہ احساس ہو جاتا ہے کہ ان کے والد حق بجانب ہیں تو پھر سب مل جل کر خوشی خوشی رہنے لگتے ہیں۔ المستنقع (دلدل) یہ ناول گھریلو زندگی کا عکاس ہے، باپ کے غیر ذمہ دارانہ رویہ اور بے جا لاڈ پیار کے سبب بڑی لڑکی کے اندر اخلاقی بگاڑ اور جنسی بے راہ روی، بڑی بہن سے پہلے چھوٹی بہن کی شادی میں رکاوٹ ودشواری مزید برآں نفسانی کمزوریوں کے سبب قدروں کی پامالی اور تعدد ازدواج جیسے سماجی مسائل کا احاطہ کرتا ہے۔ أميرة قرطبة (قرطبہ کی شہزادی) یہ تاریخی ناول ہے اس میں انھوں نے اندلس کی طوائف الملوکی اور اقتدار کے حصول کے لیے ایک دوسرے کے خلاف ہر ممکن سازش نیز آپسی رسا کشی اور بغض وحسد کی نقاب کشائی کی ہے۔ قلعة الأبطال (جانبازوں کا قلعہ) مصر میں ناکام اور ظالم حکومت کے خلاف احمد عرابی کی قیادت میں قومی انقلابی تحریک کی قربانیاں اور اس وقت مصر کے سیاسی اور سماجی حالات کو پیش کیا ہے۔ أم العروسة (دلہن کی ماں) اس ناول میں سحار نے عائلی مسائل اور معاشرے میں پائی جانے والے غلط رسم ورواج کا نقشہ کھینچا ہے، متوسط طبقہ سے تعلق رکھنے والے ایک محنت کش ملازمت پیشہ باپ کی محدود آمدنی پر پورے گھر کی کفالت کا انحصار ہے آمدنی کا کوئی دوسرا ذریعہ نہیں ہے، اسی حالت میں بڑی لڑکی کی رخصتی کا وقت آن پہنچتا ہے، بیوی کی فرمائش پر جہیز اور بہت سی بے جا رسم ورواج کو پورا کرنے کے لیے مستقبل کا خیال کیے بغیر باپ اپنی ساری پونجی صرف کر دیتا ہے اور مالی تنگی کا شکار ہو جاتا ہے، جبکہ دوسری بیٹیاں بھی شادی کی عمر کو پہنچ چکی ہوتی ہیں، یوں کہا جائے کہ ظالمانہ رسم ورواج، اسراف اور فضول خرچی پر ایک طرح سے نقد کیا گیا ہے۔ الحفيد (نواسہ) یہ ناول پچھلے ناول کا تکملہ ہے، بدلتے ہوئے زمانہ کے سبب عادات واطوار میں تبدیلی، نیز زوجین کی ازدواجی زندگی میں آپس کے تعلقات میں ناخوشگواری کے اسباب اور وجوہات کو بیان کرنے کی سعی کی ہے۔ الحصاد (انجام) شاہ فاروق کی تخت نشینی سے لیکر اس کی معزولی تک کے دورانیہ پر محیط اس ناول میں جاگیرداری کی اصلیت اور جاگیرداروں کی زندگی کے تلخ حقائق اور سیاہ پہلوؤں کو اجاگر کیا گیا ہے۔ النقاب الأزرق (نیلا نقاب) سحار کا یہ ناول ان لڑکیوں کے لیے نصیحت ہے جو بھولے پن میں بغیر پرکھے اجنبی لڑکوں سے ربط وتعلق قائم کر لیتی ہیں، لیکن جب یہ لڑکے ان سے شادی نہیں کرتے اور دوسرے کسی سے ان کی شادی ہوتی ہے، تو چاہے یہ پاکدامن رہی ہوں اور شادی کے بعد شوہر کے لیے کتنی ہی مخلص ہو جائیں لیکن جب شوہر کو ماضی کا علم ہو جاتا ہے تو اس کا غیرت مند دل کسی صورت میں اسے اپنانے کے لیے آمادہ نہیں ہو پاتا پھر اُن کی مستقبل

کی زندگی اجیرن بن جاتی ہے۔ السھول البیض (اُجلی کیاریاں) اس میں 1956 میں سوئیز کی جنگ میں مصر پر ہونے والے سہ طرفہ حملے کے دوران ملک کے حالات اور حملہ آور ممالک کی افواج کا ڈٹ کر مقابلہ کرنے میں مصری عوام کی حماست، جدوجہد اور قربانیوں کو پیش کیا ہے۔ سحار کے اسلوب تحریر سے ان کے زاویۂ فکر کو سمجھنے میں مدد ملے گی، ذیل میں ان کے ناول المستنقع کا وہ مکالمہ جس سے ناول کی شروعات ہوتی ہے ملاحظہ ہو:

لابُدَّ أن نتزوج.

ہمیں شادی لینی چاہیے۔

تريث يا فؤاد!

فواد! صبر سے کام لو۔

لقد نفد صبري، سنة كاملة وأنا أنتظر، لم أعد قادراً على كبت مشاعري، النار تتلظى في جوفي كلّما ضممتك إلى صدري، والوساوس تتضخم في رأسي، وتنساب كالأبالسة تفح في أعماقي تغريني بك...

میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا ہے، مجھے انتظار کرتے کرتے مکمل ایک سال ہو گیا، اپنے جذبات قابو میں رکھنے کی اب مجھ میں سکت نہیں رہی، جب بھی تم کو سینے سے لگاتا ہوں میری سوزش دروں میں اضافہ ہو جاتا ہے اور غلط قسم کے خیالات کی میرے دماغ میں بھرمار ہو جاتی ہے، اور پھر وہ (خیالات) تمہارے ساتھ غلط کاری پر مجھے آمادہ کرنے کے لیے میرے اندر شیطانوں کی طرح گردش میں آجاتے ہیں۔

بتُّ أخشى نفسي، أخاف أن ينتصر ضعفي، أن يفلت مني زمام أمري، أن أرتكب ما أخشاه، إن كبح مشاعري الفوارة يرهقني، يستبد بي، يزلزل كياني، حتى إنني أرتجف كلّما وقع في خلدي أن إرادتي قد تنقوض، وأن الوحش المتربص في أغواري قد ينطلق.

مجھے تو اپنے ہی سے ڈر لگنے لگا ہے، مجھے ڈر ہے کہ کہیں میری کمزوری حاوی نہ ہو جائے، میری خود اعتمادی کی لگام میرے ہاتھ سے نہ چھوٹ جائے، اور میں وہ کر بیٹھوں جس کا مجھے خدشہ ہے، اپنے جوش مارتے ہوئے جذبات کو قابو کرتے کرتے میں بے بس اور کمزور ہو گیا ہوں میرا وجود متزلزل ہو چکا ہے، میں اس خیال سے ہی کانپ جاتا ہوں کہ کہیں میرا عزم نہ ٹوٹ جائے اور میرے اندر کا وحشی درندہ باہر نہ آجائے۔

لو عصفت بنا رغبتنا واستسلمنا للإغراء لن أغفر لنفسي، سأحيا قلقاً معذباً، فأنا أريد زوجتي طاهرة الذيل حتى ليلة الزفاف.

اگر ہماری خواہش نفس ہمیں بہالے گئی اور اس کے بہکاوے میں ہم آگئے تو میں خود کو کبھی معاف نہیں کر پاؤں گا، زندگی بھر اس کا قلق مجھے ستاتا رہے گا، لہٰذا میں چاہتا ہوں کہ میری بیوی شب زفاف تک پاکدامن رہے۔

وتلفتت سهير في قلق ثم قالت:

سہیر اداسی کے انداز میں متوجہ ہو کر بولی:

لو رفضوا زواجنا لانهارت آمالنا، وتحطمت سعادتنا، وتلاشى الحلم اللذيذ الذي نعيش فيه.

اگر ان لوگوں نے ہماری شادی نہیں ہونے دی تو ہماری امیدوں پر پانی پھر جائے گا اور جس پرلطف خواب میں ہم جی رہے ہیں وہ چکنا چور ہو جائے گا۔

إننا نهاب وهماً، فكرة نبتت في رأسك وجعلتِ تنفخين فيها يوماً بعد يوم حتى أصبح مارداً جباراً يفزعنا، إنني لا أدري لماذا يرفضون زواجنا...؟ ہمیں بس ایک وہم ہے جس سے خواہ مخواہ ہم ڈرے ہوئے ہیں، تمہارے ذہن میں ایک خیال کیا پیدا ہوا کہ دن بدن تم اس کو بڑھاوا ہی دینے لگی اب وہ ایک بھاری دیو بنکر ہمیں ڈرانے لگا ہے، مجھے تو نہیں سمجھ میں آ رہا ہے کہ وہ لوگ ہمیں شادی کرنے سے کیونکر منع کریں گے؟ (المستنقع، ص2)

سحار کے ناولوں کو پڑھنے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنے ناولوں میں ارد گرد کے گلی محلے، لوگوں کے رہن سہن، رسوم و رواج، جنسی رجحانات اسی طرح متوسط طبقہ کی مشکلات و دشواریاں اور اس زمانے کے معاشی، سماجی، اور سیاسی حالات کی چابک دستی سے ایسے دلکش پیرائے میں تصویر کشی کی ہے کہ قاری کو پڑھتے وقت اسی عہد میں پہنچ جانے کا احساس ہوتا ہے، سحار کے بعض ناولوں کو باوجود طوالت کے پڑھنے میں اکتاہت نہیں محسوس ہوتی بلکہ واقعات کے حسن تسلسل کی وجہ سے دلچسپی برقرار رہتی ہے مزید یہ کہ ان کا اسلوب سلیس، عام فہم اور دلپذیر ہونے کے ساتھ ساتھ حقیقت کا آئینہ دار ہے۔ سحار کی تحریروں میں اور حقیقت نگاری، فطرت نگاری نیز رومانویت کے بھی عناصر پائے جاتے ہیں وہ کسی خاص ادبی مسلک میں مقید نہیں رہتے بلکہ اصلاحی مقصد کے تحت موقع اور محل کے اعتبار سے ہر ایک ادبی رجحان سے استفادہ کرتے ہیں۔ اشتراکیت پسند ادبا کی طرح سحار کے مدنظر صرف مادیت ہی نہیں رہتی بلکہ ان کے پیش نظر مذہبی و اخلاقی نقطۂ نظر بھی ہوتا ہے، جس کی روشنی میں وہ اپنے قلم کو جنبش دیتے ہیں، انھوں نے اپنی تخلیقات اور نگارشات کے ذریعہ جدید نسل کے اندر صالح اصول واقدار کے احیا کی سعی جمیل کی ہے۔

سحار کے ناولوں کو پڑھنے سے یہ واضح ہوتاہے کہ انھوں نے اپنے ناولوں میں ارد گرد کے گلی محلے، لوگوں کے رہن سہن، رسوم ورواج، جنسی رجحانات اسی طرح متوسط طبقہ کی مشکلات ودشواریاں اور اس زمانے کے معاشی، سماجی، اور سیاسی حالات کی چابک دستی سے ایسے دلکش پیرائے میں تصویر کشی کی ہے کہ قاری کو پڑھتے وقت اسی عہد میں پہنچ جانے کا احساس ہوتا ہے، سحار کے بعض ناولوں کو باوجود طوالت کے پڑھنے میں اکتا ہٹ نہیں محسوس ہوتی بلکہ واقعات کے حسن تسلسل کی وجہ سے دلچسپی برقرار رہتی ہے۔

ماخذ و مراجع:

1 هذه حياتي: عبدالحمید جودہ سحار، مکتبہ مصر: فجالہ۔

2 صور وذكريات: عبدالحمید جودہ سحار، مکتبہ مصر: فجالہ۔

3 السحار... والفكر الإسلامي: مامون غریب، مکتبہ مصر: فجالہ، طباعت اوّل 1975

4 التيار الإسلامي في قصص عبد الحميد جودة السحار: ڈاکٹر صفوت زید، الهيئة المصرية العامة للكتاب 1985

5 القصة عند عبد الحميد جودة السحار: فاطمہ زہراء موافی، شركة مكتبات عكاظ للنشر والتوزيع، جدہ، طباعت اوّل 1981

6 السحار مفكراً وأديباً وسينمائياً: عبدالمنعم صبحی، الهيئة المصرية العامة للكتاب: قاہرہ 1975

7 أعلام الأدب العربي المعاصر: محمد ہواری، دار الكتب العلمية: بیروت، طباعت اوّل 2016

8 السحار رحلة إلى السيرة النبوية: محمد جبریل، مکتبہ مصر: فجالہ۔

9 المجالس المحفوظية: جمال غیطانی، دار نهضة مصر للنشر: جیزہ 2016

■

Mohd Qasim
Research Scholar
Department of Arabic & Persian
University of Allahabad - 211002

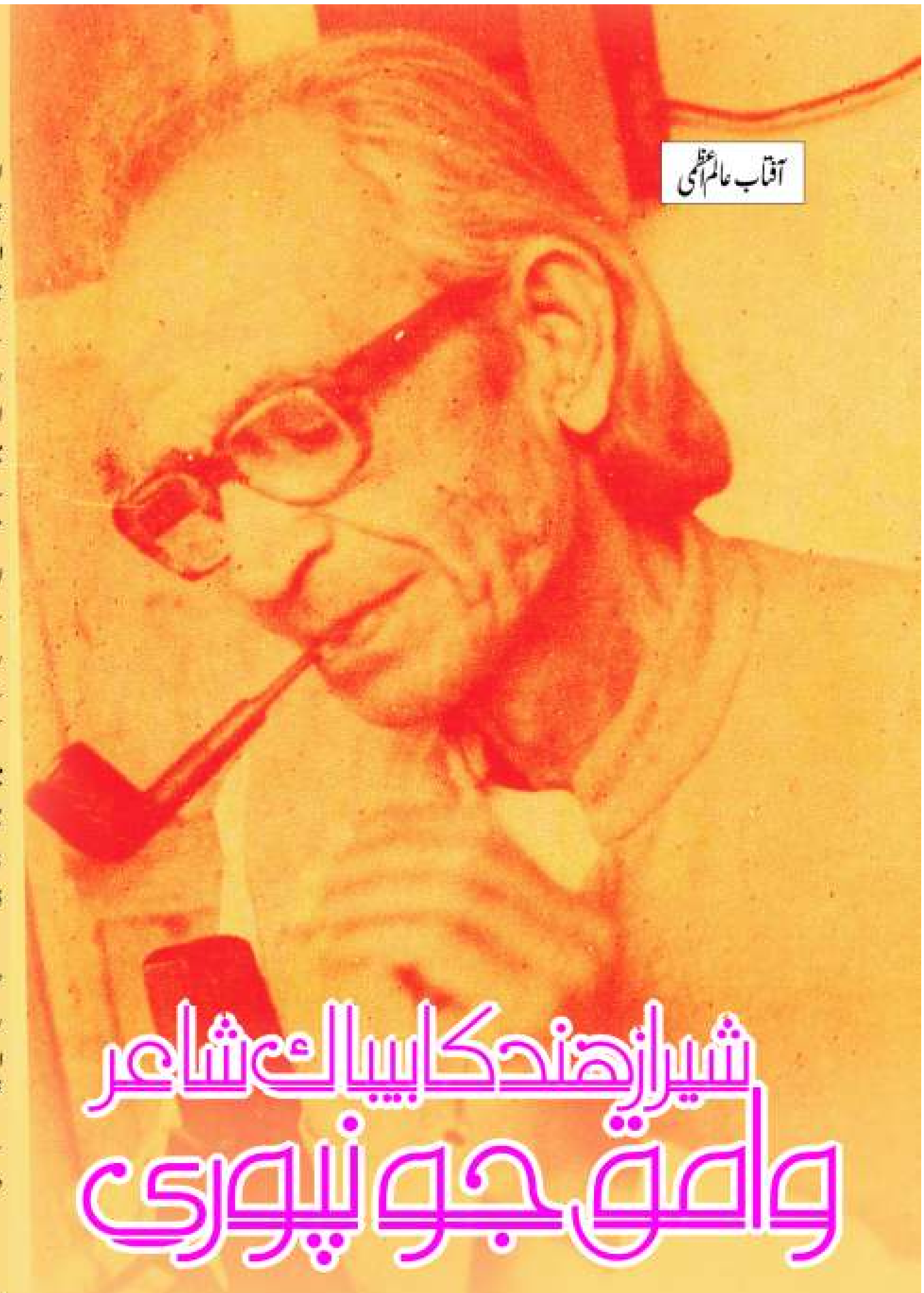

شیراز ہند کا بیباک شاعر
وامق جونپوری

آفتاب عالم اعظمی

جونپور ضلع شمالی ہندوستان کا تاریخی شہر ہے جو دریائے گومتی کے کنارے آباد ہے۔ اس کی بنیاد فیروز شاہ تغلق نے 1359 میں ظفرآباد کے قریب رکھی۔ مؤرخین کے نزدیک جونپور شہر جونا شاہ سے مشتق ہے جو تخت نشینی سے قبل محمد بن تغلق کا لقب تھا۔ فیروز شاہ تغلق کے ہاتھوں تاسیس سے شیر شاہ سوری کے عہد تک جونپور ضلع علوم وفنون کا اہم مرکز رہا ہے۔ اٹالہ مسجد یہاں کی نمایاں اور تاریخی مسجد ہے۔ مسجد سے متصل ایک قدیم مدرسہ ہے جو اب بھی قائم ہے۔ شیر شاہ سوری (فرید) کی تعلیم یہیں پر ہوئی۔ بعدازاں اس کی شہرت شیراز ہند کے طور پر ہوئی جس کی تاریخ میں بڑی اہمیت ہے۔

اردو شعر وادب کی ترقی میں شیراز ہند جونپور منفرد حیثیت کا حامل ہے جو درجنوں ادبا وشعرا کی جائے پیدائش ہے۔ بیسویں صدی میں شفیق جونپوری اور وامق جونپوری کی شخصیت بے حد نمایاں ہے۔ شفیق نے روایتی شاعری کے علاوہ اسلامی موضوعات کو شاعری کا جزو بنایا اور تا عمر اس پر قائم رہے۔ وامق نے بھی تا عمر شاعری کی مگر ترقی پسند تحریک کے بتائے ہوئے اصولوں سے سمجھوتہ نہیں کیا۔ عوامی موضوعات ان کی شاعری کا جزو ہے البتہ بدلتے رجحانات کے ساتھ انھوں نے بھی موضوعات میں تنوع پیدا کیا۔ ان کی خاص صفت یہ ہے کہ انھوں نے اپنے دل کی بات شاعری کے پیرائے میں بیبا کانہ کہی جس کے نتیجے میں انھیں اپنی سرکاری نوکری چھوڑنی پڑی۔

وامق جونپوری کا نام احمد مجتبیٰ زیدی الواسطی ہے۔ ان کی ولادت 23/ اکتوبر 1909 کو کجگاؤں (تیزھواں) میں ہوئی۔ مذہبی وابتدائی تعلیم کے بعد بی اے اور ایل ایل بی کی تعلیم حاصل کی۔ تعلیم سے فراغت کے بعد فیض آباد میں وکالت شروع کی لیکن جاگیردارانہ ماحول میں پرورش کے سبب وہ جگہ راس نہ آئی۔ نوکری کی تلاش میں دہلی کا رخ کیا۔ ترقی پسند تحریک کے نمائندہ رسالہ 'شاہراہ' کی ادارت قبول کرلی۔ چند عرصے بعد صوبائی محکمہ راشننگ میں اے آر او کے عہدے پر تقرر ہوا مگر تحریکی سرگرمیوں کے سبب یہ نوکری بھی سودمند ثابت نہ ہوئی۔ تین سال بعد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ انجینئرنگ میں آفس کی ملازمت اختیار کرلی جہاں انھیں بہت سکون میسر ہوا۔ تقریباً چھ سال بعد ریجنل انجینئرنگ کالج سرینگر کشمیر میں اسسٹنٹ رجسٹرار کے عہدے پر تقرر ہوا۔ 1969 میں ملازمت سے سبکدوش ہوکر آبائی وطن کجگاؤں میں مستقل سکونت اختیار کرلی۔ نوکری سے فراغت کے بعد پابندی سے مشاعرے میں شریک ہونے لگے۔ زندگی کے آخری تین سال بے خوابی میں گزارنے کے بعد شیراز ہند کا بیباک شاعر 21/ نومبر 1998 کو ابدی نیند سو گیا۔ ان کی زندگی اور شاعری کا احاطہ فاروق ارگلی نے اس انداز میں کیا:

''وامق بنیادی طور پر عوام کے شاعر تھے اور نصف صدی سے زائد مدت تک ہندوستان کے دلوں پر چھائے رہے۔ ان کی شاعری عام فہم زبان میں سرمایہ داری اور اجارہ داری کے عفریت کے ہاتھوں کمزوروں کے استحصال، ظلم، نابرابری اور ناانصافی کے خلاف ایسی طاقتور آواز ہے جس پر غریبوں، محنت کشوں اور مظلوموں کو بجا طور پر درویش صفت اس عہد ساز شاعر پر فخر ہے۔''

(ص 4، دیباچہ کلیات وامق جونپوری)

اس عہد ساز شاعر نے شاعری میں کبھی کسی کی شاگردی اختیار نہیں کی۔ بچپن ہی سے وہ اپنے وطن کے جلسہ محرم میں دیگر شعرا کے کلام پڑھتے رہے جس سے فطرتاً ان کا مزاج شاعرانہ ہوگیا۔ طالب علمی کے زمانے میں خود اشعار کہتے اور ساتھی شعرا سے مجلسوں میں پڑھواتے۔ اس طرح یہ سلسلہ برسوں چلتا رہا۔ تعلیم سے فراغت کے بعد فیض آباد میں وکالت سے منسلک ہوئے تو وہاں شعرا کی ادبی محفلوں میں شریک ہونے لگے۔ مہمل اشعار نظم کرکے ساتھی شعرا کو دے دیتے جس پر انھیں داد وتحسین سے نوازا جاتا۔ قریبی دوستوں کے اصرار پر وامق اپنا کلام خود پڑھنے لگے۔ 1940 کے مشاعرے میں ایک طرحی غزل سامعین کی نذر کی۔ اس طرح وہ اچانک شاعر ہوگئے جس کا اظہار انھوں نے اس انداز میں کیا:

''میری ذات سے وابستہ دو حادثوں سے انکار نہیں

کیا جاسکتا۔ ایک یہ کہ میں 1909 میں پیدا ہوا کہ زندگی بھر اپنے وجود کا خمیازہ بھگتا کروں، دوسرا حادثہ 1940 میں یہ ہوا کہ میں ایک دم سے شاعر ہوگیا کہ اندر ہی اندر کڑھتا اور سلگتا رہوں۔'' (ص 33 ماہنامہ آجکل فروری 1999)

وامق جونپوری کی پہلی طرحی غزل نے ہی شعری ذوق رکھنے والوں کے دلوں کو موہ لیا اور ان کا شمار بحیثیت شاعر ہونے لگا۔ 1941 میں گورکھپور کے ایک مشاعرے کا دعوت نامہ موصول ہوا۔ انھوں نے باقاعدہ شرکت کی اور سامعین کے سامنے جو غزل پڑھی اس کا مطلع ہے:

آہ کہ نارسائیاں نہ گئیں
آسماں تک دہائیاں نہ گئیں

اس کے بعد ہی وامق میں خود اعتمادی اور حوصلہ پیدا ہوا۔ اس مشاعرہ میں سلام مچھلی شہری بھی تھے۔ جب انھوں نے کالج کی لڑکیوں سے متعلق نظم پڑھنا شروع کی تو صدر مشاعرہ کو اعتراض ہوا۔ اعتراض اتنا شدید تھا کہ ناظم مشاعرہ کو مشاعرہ ختم کرنے کا اعلان کرنا پڑا۔ ترقی پسند تحریک سے منسلک نوجوان شعرا نے سامعین کی خواہش پر دوسرے دن کالج سے باہر مشاعرے کا انعقاد کیا۔ اس میں وامق بھی بحیثیت شاعر شریک ہوئے اور یہ قطعہ پڑھا

دریا میں تلاطم برپا ہے، کشتی کا فسانہ کیا معنی
گرداب سے جب لڑنا ہے تمھیں، تنکہ کا سہارا کیا معنی
یہ نوحۂ کشتی بند کرو، خود موجۂ طوفاں بن جاؤ
پیروں کے تلے ساحل ہوگا، ساحل کی تمنا کیا معنی

یہیں پر انھوں نے تحریک کی باقاعدہ رکنیت اختیار کی گویا وامق نے شاعری کے ذریعہ اپنا مقصد تلاش کرلیا۔ حسب روایت انھوں نے بھی شاعری کی ابتدا غزل سے کی لیکن ان شاہکار نظموں، تقسیم پنجاب، مینا بازار، بھوکا بنگال، بول رے ساتھی بول، میر کارواں، نیلا پرچم، زمین، فن، آنکھیں، وقت، غزل در غزل، سفر ناتمام اور کالعدم۔ کن فکاں نے انھیں ہر خاص و عام میں مقبول بنایا اور وامق کو عوامی شاعر کہا جانے لگا۔

وامق جونپوری نے اپنی شاعرانہ زندگی میں چار مجموعے 'چیخیں، جرس، شب چراغ، سفر ناتمام اور ایک خود نوشت 'گفتنی ناگفتنی' کا ادب اردو کے ذخیرہ میں اضافہ کیا نیز بچوں کے لیے نظمیں، گیت، تنقیدی مضامین، دیباچے اور تبصرے بھی لکھے جو رسالوں و کتابوں کی گرد میں روپوش ہیں انھیں بھی ادب کا حصہ بنانے کی ضرورت ہے۔

چیخیں: یہ گیارہ نظموں کا مجموعہ کلام 1948 میں شائع ہوا۔ اس میں شامل سبھی نظمیں تقسیم ہند کے دوران رونما ہونے والے فرقہ وارانہ فسادات کے موضوع پر ہیں۔ اس کی اہم نظم 'پنجاب' ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

ہٹ گئے ہوش کے محور سے تمدن کے قدم
زندگی برسوں کی بیمار نظر آتی ہے
یوم آزادی کا ہر لمحہ جھکائے ہوئے سر
جس کی ہر سانس میں مدقوق تعفن لرزاں
دادخواہی کے لیے پھر سوئے مغرب ہے رواں
جل رہی ہے سرِ بازار چتا غیرت کی
موت اور زیست کے دوراہے پہ پہرا دینے
اہرمن اپنے جہنم سے نکل آیا ہے

جرس: یہ مجموعہ کلام 1950 میں شائع ہوا جو چالیس نظموں، چند غزلوں، قطعات اور متفرق اشعار پر مشتمل ہے۔ اس مجموعہ کلام کی اہم نظمیں زویا تانیا، رات کے دو بجے، ور وزن کی آڑ سے، مائی ایٹم، رقص بسمل، جنتا کی لڑائی، مزدوروں کا کورس، بول رے ساتھی بول، بھوکا بنگال اور مینا بازار ہیں۔ بھوکا بنگال قحط بنگال کے موضوع پر 1944 میں لکھی۔ انھوں نے قحط بنگال کا مشاہدہ بذات خود کیا ہے۔ اس موضوع پر ترقی پسند تحریک سے وابستہ متعدد شعرا نے نظمیں لکھیں لیکن وامق کی یہ نظم کافی مقبول ہوئی اور اس کے ذریعے سماجی کارکنوں نے قحط بنگال کے متاثرین کے لیے بے شمار روپیہ اور غلہ وصول کیا۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

پورب دیس میں ڈگی باجی پھیلا سکھ کا تان
دکھ کی اگنی کون بجھائے، سوکھ گئے سب تال
جن ہاتھوں نے موتی رولے آج وہی کنگال
آج وہی کنگال
بھوکا ہے بنگال رے ساتھی بھوکا ہے بنگال
ندی نالے گلی ڈگر پر لاشوں کے انبار
جان کی ایسی مہنگی شے کا الٹ گیا بیوپار
مٹھی بھر چاول سے بڑھ کر سستا ہے یہ مال رے ساتھی
سستا ہے یہ مال
بھوکا ہے بنگال رے ساتھی بھوکا ہے بنگال

نظم مینا بازار (1945) وامق کی شاہکار نظم ہے جو اردو کی پہلی سٹائر (Satire) غنائیہ نظم کہلاتی ہے۔ انھوں نے تشبیہات واستعارات اور علامتوں کے ذریعے بنارس کے طوائفی ماحول کی عکاسی کی ہے۔ صنف نازک خاص موضوع ہے جن کو معاشرے نے خود جنم دیا اور پھر اسے الگ چھوڑ دیا۔ سماجی حقیقت نگاری اور مقصدیت کا امتزاج اس کی نمایاں خصوصیت ہے۔

شب چراغ: وامق کا یہ مجموعہ کلام 1978 میں الہ آباد سے شائع ہوا جو چودہ نظموں کے علاوہ غزلوں، قطعات، رباعیات اور چند متفرق اشعار پر مشتمل ہے۔ میر کارواں، نیلا پرچم، فن، آنکھیں، وقت اور زمین شاہکار نظمیں ہیں جس کی اشاعت پر انھیں اعزازات سے نوازا گیا۔ تقسیم ہند کے بعد گاندھی جی کا قتل کسی عظیم سانحے سے کم نہ تھا۔ پورے ملک کی عوام میں سوگواری اور ہمدردی کی کیفیت طاری تھی یہی کیفیت وامق کے دل میں بھی پیدا ہوئی اور 'میر کارواں' جیسی شاہکار نظم تخلیق کی۔ اس نظم کے ذریعے انھوں نے گاندھی جی کو خراج عقیدت اور ہندوستانیوں کو اتحاد کا پیغام دینے کی کوشش کی۔ وامق نے یہ نظم 'مکتی' کے نام سے لکھی جس کو بعد میں 'میر کارواں' کے نام سے اپنے مجموعہ کلام میں شامل کیا۔ میر کارواں ان کی آزاد نظموں میں بہترین نظم شمار کی جاتی ہے۔ یہ نظم گویا گاندھی جی کا مرثیہ ہے اگرچہ وامق نے مرثیہ کے اجزائے فن کو ملحوظ نہ رکھا ہو مگر احساسات وجذبات کی مصوری فنکارانہ انداز میں کی ہے جس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

وہ بوڑھی سوکھی ہڈیوں کا اک کانپتا بدن
مگر اسی میں اس قدر جواں لہو تھا موجزن
کہ جس کی بوند بوند میں بسی تھی الفتِ وطن
لہو وہ آج بہ گیا
وہ بوڑھا جسم مرگیا
مگر وہ کام کر گیا

'زمین' وامق کی طویل نظم ہے جس میں انھوں نے طربیہ انداز اختیار کیا ہے اور زمین کی خصوصیات بیان کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے نظریات اور سائنسی حقائق کو بھی واضح کیا ہے۔ وامق نے اردو میں اس نوعیت کی پہلی اوڈ (Ode) تخلیق کی جس کے بارے میں انگریزی پروفیسر محمود حسین نے کہا تھا کہ ''انگریزی کی کوئی اوڈ زبان وبیان واسلوب اور سجاوٹ کے اعتبار سے 'زمین' کا مقابلہ نہیں کرسکتی۔ دراصل وامق نے تشبیہات واستعارات کی مدد سے اپنے فکر وفن کی اساس کا عمدہ تجربہ کیا ہے۔ اس طرح وامق کی نظم فنی اعتبار سے منفرد حیثیت کی حامل ہے جس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

اے مری پیاری زمیں/کتنی جواں اور حسیں/نوع بشر کی امیں
نورس وناز آفریں/گلبدن ومہ جبیں/خاک تری دلنشیں
ترے چمن زار پر/دامن کہسار پر/ہر در و دیوار پر
حسن کی سرشاریاں/عشق کی چنگاریاں/فکر کی گلکاریاں
فکر کی مہمیز پر/برق سے بھی تیز تر/فن کو ملا ہے اثر
فن سے تو جنت نشاں/چتر ترا آسماں/مانگ تری کہکشاں

سفر ناتمام: یہ مجموعہ کلام 1990 میں لکھنؤ سے شائع ہوا جو سترہ نظموں، چند غزلوں اور قطعات پر مشتمل ہے۔ اس میں شامل کلام وامق نے دو اقسام کے لوگوں کے لیے تخلیق کیں ایک دانشور طبقے کے لیے دوسرے درمیانی اور نسبتاً کم تعلیم یافتہ لوگوں کے لیے۔ غزل در غزل، ہم بزدل

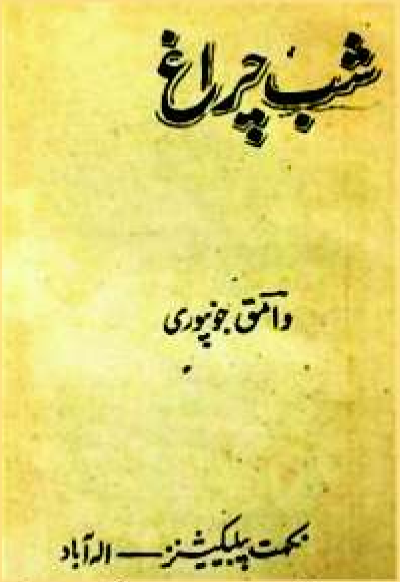

ہیں، ایک دو تین، سفرنا تمام اور کالعدم۔ کن فکاں ان کی شاہکار نظمیں ہیں۔ سفرنا تمام ایسی نظم ہے جس میں وامق نے اپنی زندگی کا نچوڑ پیش کیا جس کی بنیاد پر انھوں نے مجموعے کا نام 'سفرنا تمام' رکھا۔ وامق کے فکر وفن کی گہرائی اس میں نمایاں ہے اور زبان وبیان، علامتوں وترکیبوں سے کلام میں دلکشی اور رعنائی پیدا کی۔ فنی وفکری بصیرت کا امتزاج اس کا خاص وصف ہے جس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

زندگی کون سی منزل پہ رکی ہے آکر
آگے چلتی بھی نہیں / راہ بدلتی بھی نہیں
سست رفتار ہے یہ دور عبوری کتنا
سخت وبے جان ہے وہ پیکر نوری کتنا
چاند اک خواب جو تھا / شہر امید تہ آب جو تھا
حسن کے ماتھے کا نھا ٹیکا / پائے آدم کے تلے آتے ہی
اُترے چہرے کی طرح ہوگیا کتنا پھیکا

وامق کی اہم نظم 'وقت' ہے اگرچہ یہ نظم مجموعہ 'شب چراغ' میں شامل ہے لیکن وقت اور سفرنا تمام دونوں نظمیں وامق نے ریٹائرمنٹ کے بعد تخلیق کیں۔ ان دونوں نظموں کی تخلیق کے بعد ہی سے وامق کو اردو اور ہندی میں تلاش کیا جانے لگا اور تب ان کی شخصیت کو اردو شاعری میں نمایاں مقام حاصل ہوا۔ 'وقت' وامق کی طویل نظم ہے جس میں انھوں نے مفکرانہ انداز کا نیا تجربہ کیا اور اپنے تخیلات وتفکرات میں امتزاج پیدا کر کے تصور وقت کی بہترین عکاسی کی۔ وقت کو انھوں نے کبھی پانی کی لکیر سے تشبیہ دی تو کبھی انقلاب سے لیکن وقت کا تصور ہر دور میں باقی رہے گا۔ اس نظم کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

وقت کا کوئی کنارہ ہے نہ اس کی کوئی تھاہ
اس کی ہر موج ہزاروں صدیاں
جزر ومد اس کے تواریخ جہان گزراں
وقت رفتار ہے لمحات کا اک دھارا ہے
وقت دلدار و جہاندار و جہاں آرا ہے
وقت دوّار ہے / تخلیق کا گہوارہ ہے
وقت فنکار ہے / تہذیب کا فوارہ ہے

نظموں کے علاوہ وامق جونپوری نے بہترین غزلیں بھی کہیں۔ ان کا شمار ترقی پسند تحریک کے فعال اور نمایاں شعرا میں ہوتا ہے۔ تحریک کے وجود سے پہلے وامق رومانی شاعری کا ایک دور عبور کر چکے تھے۔ اس عمر میں رومانی خیالات اور عشقیہ جذبات کا آنا فطری بات ہے جو ان کی شاعری میں بھی نمایاں ہے لیکن انھوں نے اپنے عشقیہ جذبات کو اس انداز میں پیش کیا ہے کہ وہ دوسروں پر ظاہر نہ ہو سکے اور مقصد بھی حاصل ہو جائے۔ اس سلسلے کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

کھویا کھویا سے پاکے ہمیں وہ دل کی باتیں جان گئے
ان کا تجاہل دیکھتے ہی ہم ان کی نظر پہچان گئے
سازوں میں رہے نغمہ بن کر، رگ رگ میں اٹھا ہے درد اکثر
پردوں میں چھپے تم لاکھ مگر ہم جان گئے پہچان گئے
قریب تھے تو قیامت کا لطف آتا تھا
ہوئے جو دور تو یادوں کا حشر برپا ہے
ہم جب محبت کی قسم کھا گئے
ان کے حسین چہرے پہ رنگ آگئے

رومانی دور کے بعد وامق کی شاعری انقلابی دور میں داخل ہوئی۔ ہندوستان پر انگریزوں کا قبضہ تھا اور ترقی پسند تحریک سے وابستہ ادبا وشعرا نے ہندوستانیوں میں انقلابی روح پھونکی اور حصول آزادی کے لیے انقلاب کا نعرہ بلند کیا لیکن وامق کی شاعری میں ایسا نہیں ہے ان کی شاعری میں انقلابی موضوعات داخل تو ہوئے لیکن اپنی مخصوص لے اور نغمگی کے سہارے انھوں نے انقلاب کی منزل طے کی اور ہندوستانیوں کے ذہن وروح دونوں کے لیے تابناک مستقبل کی بشارت دی اس کام کو انجام دینے کے لیے انھوں نے مختلف طریقے اپنائے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

زنجیر ٹوٹنے کی صدا سن رہے تم
کس نے کہا ہماری فغاں میں اثر نہیں
پیغام زندگی جو نہ ہو وہ فنا ہی کیا
تاروں سے جو نہ جھلکے وہ رنگ سحر نہیں
کبھی کتاب بھی انقلاب لائے ہیں
بدل بدل کے سبو ہم شراب لائے ہیں
انھیں سلام کرو ان کا احترام کرو
فلک سے توڑ کے جو ماہتاب لائے ہیں

انقلاب کے بعد انگریز تو ملک چھوڑ کر چلے گئے لیکن جنگ کی تباہی سے روزگار کے مواقع یکسر ختم ہو گئے اور لوگوں کو بنیادی ضرورت مہیا نہ تھی۔ ان مسائل سے نوجوان شعرا بھی نبرد آزما تھے جن لوگوں نے اس اہم موضوع کو اپنی شاعری کا جزو بنایا ان میں وامق بھی تھے۔ زمینداری ختم ہو چکی تھی اور فکر معاش کا مسئلہ فکر جاناں اور انقلاب پر غالب تھا۔ اس سلسلے کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

وہ عہد مسرت کی باتیں وہ وقت سہانا بھول گئے
جب سے غم دوراں یاد آیا سب لطف زمانہ بھول گئے
اندوہ کی ماری دنیا میں کچھ اپنی زباں سے کہہ نہ سکے
اوروں کے فسانے سن سن کر ہم اپنا فسانہ بھول گئے

آزادی کے بعد جب حالات سازگار ہوئے اور فکر معاش کا مسئلہ ختم ہوا تو شاعری میں بھی نمایاں تبدیلی آئی۔ نوجوان شعرا میں کلاسیکی رجحان بڑھا اس سے وامق کی شاعری میں بھی تبدیلی رونما ہوئی۔ انھوں نے مختلف موضوعات کو شاعری میں جگہ دی اور ہیئت ومواد، لہجہ اور زبان وبیان میں جدت پیدا کر کے غزل کو جمالیاتی حسن سے آشنا کیا۔ اس طرح انھوں نے نظم کے ساتھ غزل میں بھی ترقی کے منازل طے کیے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

چل دیے وہ چھیڑ کے اک ساز نو
دل کا سکوں لے گئے وہ کیا گئے
پابندیوں میں تھے تو دکھاتے تھے معجزے
آزادیوں میں شعبدہ گر ہو کے رہ گئے
صحیح وقت پہ جب داد فن ملی وامق
ہمارا ہوگیا نیلام ایک بولی میں
یہ مانا حسن کی فطرت بہت نازک ہے اے وامق
مزاج عشق کی لیکن نزاکت اور ہوتی ہے
وامق دو دھاری تیغ ہے وہ لہجۂ جدید
نغمے تمام خون میں تر ہو کے رہ گئے
اس دور ترقی کا اک معجزہ یہ بھی ہے
مجرم نظر آتے ہیں جب کام نہیں ہوتا

گفتنی وناگفتنی:۔ یہ (خود نوشت) 1993 میں پٹنہ سے شائع ہوئی جو 434 صفحات، چودہ ابواب اور چند عکسی خطوط پر مشتمل ہے جس میں سوانحی باب خاص اہمیت کا حامل ہے۔ وامق کی شاعری اور نجی زندگی کو جاننے کے لیے اس کتاب کا مطالعہ بے حد مفید ہوگا۔ عمومی جائزہ کے بعد یہ کہا جا سکتا ہے کہ وامق کا یہ شعر ان کی زندگی اور شاعری دونوں پر یکساں صادق آتا ہے۔

آہن نہیں کہ، چاہے جب موڑ دیجیے
شیشہ ہوں، مڑ تو سکتا نہیں، توڑ دیجیے

■

Dr. Aftab Alam Azmi
M M K Degree College
Mungrawan
Azamgarh-276001 (UP)
Mob.:9452411642

مخمور سعیدی کی شعری کائنات

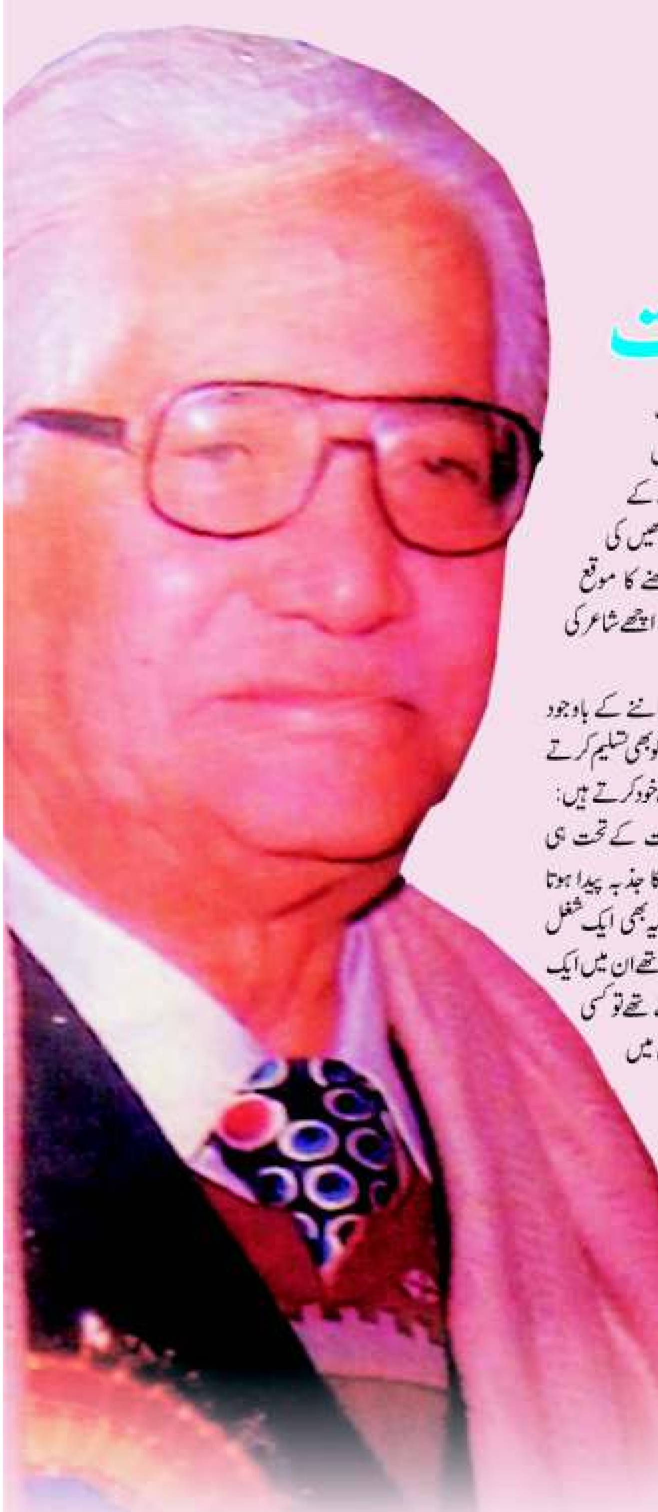

عرفان رشید

مخمور سعیدی کی شعری کائنات کا جائزہ پیش کرنے سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ وہ کون سے محرکات تھے جن کی وجہ سے سلطان محمد خان مخمور سعیدی کے نام سے مشہور و معروف ہوئے۔ انسان اچانک شاعر نہیں بن جاتا اس کے لیے مطالعہ، ماحول، شوق، تربیت اور مسلسل مشق کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایسا ہی کچھ مخمور سعیدی کے ساتھ بھی ہوا ہے۔ پہلا محرک یہ تھا کہ انھیں اپنے دادا اور والد جناب احمد خان نازش سے شاعری کا ذوق ورثے میں ملا۔ گھر کا ماحول شاعرانہ تھا جس کی وجہ سے انھوں نے چھوٹی عمر ہی میں شعر کہنے شروع کیے تھے۔ باپ کی سخت ناراضگی کے باوجود انھوں نے شاعری کے شغف کو جاری وساری رکھا۔

دوسرا محرک شہر ٹونک (راجستھان) ہے جو ادبی لحاظ سے پہلے ہی مشہور تھا اور جہاں اختر شیرانی اور بسمل سعیدی جیسی عظیم شخصیتیں اس وقت اردو شعر وادب میں اپنا ایک مقام قائم کر چکی تھیں اور انھیں کی تربیت میں مخمور سعیدی نے شعروادب کے فن کو نکھارنے اور سنوارنے کی کوشش کی ہے۔ اختر شیرانی سے مخمور سعیدی کے والد کے مراسم کافی اچھے تھے۔ دونوں ہم درس رہے ہیں اور جب لاہور سے اختر شیرانی آتے تھے مخمور سعیدی کے یہاں ضرور جاتے تھے اور اپنے رسائل 'بہارستان' اور 'رومان' جو وہ لاہور سے نکالا کرتے تھے ان کے یہاں ضرور چھوڑتے تھے۔ بقول مخمور سعیدی ''میں ان رسالوں کا دلچسپی کے ساتھ مطالعہ کیا کرتا تھا'' ان رسائل کو پڑھتے پڑھتے انھیں شاعری کا شوق پہلے سے زیادہ ہو گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعد میں انھوں نے غالب، اقبال، میر، ذوق، جگر، حسرت وغیرہ کے دواوین پڑھنے شروع کیے۔

تیسرا اور آخر محرک رسالہ 'تحریک' سے وابستگی تھی۔ اس کے بعد مخمور سعیدی ایک شاعر کی حیثیت سے پہچانے جانے لگے۔ ان کی ابتدائی شاعری پر 'تحریک' کے مدیر اور مالک جناب گوپال متل کا اثر بھی دکھائی دیتا ہے جو اس وقت جدیدیت کا علم لے کر اکیلے کھڑے ہو گئے تھے۔

مخمور سعیدی نے اپنے والد کے کہنے پر بسمل سعیدی کو اپنا استاد مقرر کیا۔ وہ بسمل سعیدی اور اپنے والد محترم سے علم عروض حاصل کر چکے تھے کیونکہ مخمور پہلے ہی سے اردو کے علاوہ فارسی اور عربی سے واقف تھے اس لیے انھیں علم عروض سیکھنے میں زیادہ وقت نہیں لگا۔ ٹونک سے دلی آنے کے بعد اپنے استاد کی صحبت میں رہے اور انھیں کی بدولت باقی عظیم شخصیتوں میں بھی بیٹھنے کا موقع نصیب ہوا اور یہی وجہ تھی کہ جلد ہی ایک اچھے شاعر کی حیثیت سے سامنے آئے۔

مخمور سعیدی ان سب محرکات کو ماننے کے باوجود داخلی محرکات یعنی فطری ودیعت اور شوق کو بھی تسلیم کرتے ہیں۔ ایک انٹرویو کے دوران اس کا اعتراف خود کرتے ہیں:

''میرے خیال سے داخلی محرکات کے تحت ہی شاعری وجود میں آتی ہے اور شعر کہنے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ بعض لوگ شوقیہ شعر کہتے ہیں تو یہ بھی ایک شغل ہے۔ ہمارے یہاں شرفا کے کئی مشاغل تھے ان میں ایک مشغلہ شعر کہنا بھی تھا۔ جب خود نہیں کہتے تھے تو کسی سے کہلواتے تھے اور مشاعروں اور نشستوں میں سنایا کرتے تھے۔''

(راشد انور راشد 'مخمور سعیدی سے گفتگو' مشمولہ 'بھیڑ میں اکیلا' ص 270)

مذکورہ بالا اقتباس سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ صرف گھر کا ماحول اور صحبت شاعری کے لیے کافی نہیں ہے بلکہ بذات خود شوق ہونا بہت ضروری ہے جو مخمور سعیدی میں بدرجۂ اتم موجود تھا۔ یہی وہ محرکات تھے جن کی وجہ سے مخمور ایک اچھے شاعر بن کر سامنے آئے اور آج اپنی شاعری کی بدولت لوگوں کے دلوں میں اپنی جگہ بنا چکے ہیں۔

یوں تو شاعر اپنا کلیات، دیوان اور شعری مجموعے کی شروعات حمد، نعت، منقبت وغیرہ سے کرتے ہیں لیکن مخمور سعیدی نے اس میں بھی غالب کی طرح ایک الگ ہی انداز سے کام لیا ہے۔ انھوں نے براہ راست اپنی شاعری کا آغاز غزل اور نظم سے کیا۔

مخمور سعیدی کا پہلا شعری مجموعہ 'گفتنی' (1960) کو منظر عام پر آیا۔ دوسرا مجموعہ 'سیہ بر سفید' (1969) میں شائع ہوا اور بعد میں 'آواز کا جسم' (1972)، 'سب رنگ' (1975)، 'واحد متکلم' (1979)، 'آتے جاتے لمحوں کی صدا' (1979)، 'بانس کے جنگلوں سے گزرتی ہوا' (1983)، 'دیوار و در کے درمیاں' (1994) اور آخری

مجموعہ 'راستا اور میں' (2003) میں منظر عام پر آئے ہیں۔

مخمور سعیدی کا کلیات 'عمر گزشتہ کا حساب' دو جلدوں پر مشتمل 2000 کو منظر عام پر آیا ہے۔ اس کلیات میں آٹھ مجموعے شامل ہیں۔ آخری مجموعہ 'راستا اور میں' اس میں شامل نہیں ہے۔ اس کی پہلی جلد میں غزلیں اور دوسری جلد میں نظمیں ہیں۔ پہلی جلد میں تقریباً 296 غزلیں شامل ہیں اور مجموعہ 'راستا اور میں' میں 60 غزلیں ہیں۔ کل ملا کر ان کے یہاں 356 غزلیں ملتی ہیں۔

مخمور سعیدی نے اپنی غزل گوئی کی شروعات انیسویں صدی کی پانچویں دہائی کے آخر میں کی ہے اور یہ غزل کی روایت رہی ہے کہ جب بھی کوئی شاعر شاعری کی شروعات کرتا ہے تو پہلے حسن و عشق جیسے موضوعات سے کام لیتا ہے۔ ایسا ہی کچھ مخمور کے پہلے مجموعہ 'گفتنی' میں بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔ اس مجموعے کی پہلی غزل کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے۔

قدم قدم پہ نگاہوں کی جستجو تیری
نفس نفس میں سمائی ہے آرزو تیری
نہ پوچھ آہ کچھ ان بازوؤں کی ویرانی
کھلی نہ جن پہ کبھی زلفِ مشک بو تیری

مخمور کو اپنے ماضی سے بے انتہا محبت تھی لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ روایت پسند تھے۔ وہ ماضی کو حال کے آگے مائل ہونے نہیں دیتے۔ لیکن اپنے ماضی سے محبت اور اپنی تہذیب سے دور جانے کا غم انھیں ہمیشہ رہا ہے۔ رشید حسن خاں نے بھی مخمور کی شاعری میں اس کی یوں نشاندہی کی ہے وہ لکھتے ہیں:

''اس مخمور کو ماضی سے محبت ہے۔ اس کے مٹنے کا غم بھی ہے وہ اس پر گہرے دکھ کا اظہار بھی کرتا ہے لیکن وہ حال سے بیزار نہیں ہے، وہ زندگی کے نئے آداب کو جانتا ہے اور ان پر اصرار بھی کرتا ہے اور جہاں بھی وہ یہ محسوس کرتا ہے کہ ماضی حال کے راستے کا پتھر بن جاتا ہے وہاں اس سے واضح اختلاف کا اظہار کرتا ہے۔''

(رشید حسن خان، بحوالہ شمین، کاف نظام 'مخمور سعیدی ایک کولاژ' ایوان اردو، دہلی (جلد 33) شمارہ بارہ 2010 ص 10)

مخمور سعیدی کی شاعری اگر چہ ان کے ذاتی تجربات ومشاہدات اور ذہنی وجذباتی کیفیات کی دین ہے مگر اس میں جگ بیتی بھی ہے۔ بقول مخمور ''میں سماج میں زندہ ہوں اور سماج مجھ سے زندہ ہے۔'' یعنی جس طرح سے میر کی شاعری کو پڑھنے کے بعد ہمیں میر کے غم اپنے معلوم ہونے لگتے ہیں اسی طرح مخمور کی شاعری کو پڑھنے کے بعد ایسا ہی تاثر پیدا ہوجاتا ہے۔

مخمور کو اپنے شہر کے حالات سے آگہی تھی۔ ملک تو آزاد ہوگیا تھا لیکن جاتے جاتے ایک اور الم چھوڑ گیا تھا یعنی ملک تقسیم ہوگیا تھا جس کے باعث فرقہ وارانہ فسادات، جبر لوٹ مار، خون ریزی انتہا کو پہنچ چکی تھی۔ اس وقت ایک شاعر کے خاموش رہنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ کیجیے۔

یہ ڈر ہے یہاں اب کھیتیوں میں بس موت ہی اگ سکے گی
زمینوں میں لاشوں کو بونے کا منظر میرے سامنے ہے

کسی نے پھونک نہ دی ہوں جو بستیاں تھیں ادھر
ندی کے پار یہ اٹھتا ہوا دھواں کیا ہے
کچھ لوگ جو پھر رہے ہیں در در
کس نے انھیں کردیا ہے بے گھر

یہ چند اشعار ہیں جو اس دور کی عکاسی کرتے ہیں کہ کس طرح سے لوگوں کو بے گھر کردیا گیا تھا اور بستیوں کی بستیاں کیسے راکھ کے ڈھیر میں منتقل کر دی گئیں تھیں۔ انسانی زندگی بے وقعت ہوگئی تھی جہاں مخمور رمزیت اور اشاریت کے انداز اختیار کرتے ہیں۔

ہمارے شہرائے مخمور مقتل بنتے جاتے ہیں
بدل کر بھیس چنگیز اور نادر لوٹ آئے ہیں
شبنم کی جگہ آگ کی بارش ہے فضا میں
خوابوں کی یہ بستی تھی چمن زار مگر اب!

مخمور کو اس کا علم ہوگیا تھا کہ موجودہ صورتِ حال تباہ کاری کی صورت حال ہے، صارفیت نے اپنی جڑوں کو بہت زیادہ مضبوط کیا ہے، انسان کے چاروں طرف مسائل ومشکلات کی یلغار ہے۔ اب صرف انسان کو اپنا غم اور تنہائی پریشان نہیں کرتی ہے بلکہ انسان ایک دوسرے سے کٹ گیا ہے۔ ماضی کا وہ بھائی چارہ، ایک دوسرے کے دکھ درد میں کام آنا، انسانیت اور مشترکہ تہذیب وغیرہ سے اب موجودہ انسان کافی دور نظر آتا ہے۔ شاعر کو بھی ان سب کا بے حد رنج وملال ہے انھیں یہ غم کھائے جا رہا تھا کہ آخر سماج میں یہ بکھراؤ کیوں آگیا ہے، انھیں رشتوں کی پامالی، خاندانوں کا شیرازہ بکھر جانے پر بے حد افسوس ہو رہا ہے اور انھیں چیزوں کا کرب مخمور کے ان اشعار سے واضح ہو جاتا ہے۔

کتنی دیواریں اٹھی ہیں ایک گھر کے درمیاں
گھر کہیں گم ہوگیا دیوار ودر کے درمیاں
پھیلتی جاتی تھیں شہروں میں عجب ویرانیاں
ٹوٹتے جاتے تھے سب رشتے گھروں کے درمیاں
دونوں طرف ٹوٹتے رشتوں کی گھٹن ہے
آنگن میں کھڑی ہوگئی دیوار مگر اب!

مخمور سعیدی کو دو زندگیوں کا تجربہ تھا گاؤں کا بھی اور شہر کا بھی۔ جس سماج میں مخمور نے آنکھیں کھولی اور جہاں ان کا بچپن گزرا، وہاں بھی اب رشتوں میں دراڑیں پڑ گئی ہیں اور جس شہر یعنی دلی میں وہ رہتے تھے وہاں بھی کوئی کسی کا نہیں تھا۔ اس طرح سے انھیں زندگی اجنبی لگنے لگی تھی جس کی وجہ سے وہ بار بار ماضی میں جانے کی کوشش کرتے ہیں۔ انھیں ماضی سے بے حد عقیدت تھی بقول رشید حسن خاں:

''مخمور سعیدی کی شاعری اپنے عہد سے زیادہ شاعر کے احساس اور اس کے ماضی وحال کی آئینہ دار ہے۔ یہ اس کے ذہنی سفر کی داستان ہے۔ اس کی محرومیوں کی کہانی ہے اور اس کے عقیدوں کی ترجمانی ہے... اس کی شاعری میں اس کے ماضی وحال کو دیکھ سکتے ہیں۔ جو بدلتے ہوئے حالات کے داستان سرا ہیں۔ اس میں شخص کا فسانہ زیادہ اور دنیا کا افسانہ اس کے ذیل میں بیان ہوا ہے یہ خیالات کی داستاں کم ہے تاثرات کی کہانی زیادہ ہے۔''

(رشید حسن خان 'ذہن کا سفر' مشمولہ مخمور سعیدی ہمہ جہت فن کار' ص 40)

مخمور سعیدی کی شاعری میں راستا، شہر، سفر، گھر، وقت جیسے بلیغ استعارے اور علامتوں کا استعمال ہوا ہے۔ راستا اور وقت علامت ہے زندگی، جو دریا کی طرح بہتی ہے، کبھی تھمنے کا نام نہیں لیتی ہے۔ سفر امید اور یقین کا استعارہ ہے، شہر موجودہ حالات کی علامت ہے اور گھر سماجی بکھراؤ اور ماضی کا استعارہ ہے۔

ماندگی کا کٹھن مرحلہ اور میں
طے نہ ہوتا ہوا راستا اور میں
اک رستہ طے ہو جائے تو کتنے رستے دیں آواز
ختم سفر کی حسرت لے کر منزل بھٹکوں میں
وقت ہر راہ میں دیوار کھڑی کردے گا
وقت کی قید سے گھبرا کے جدھر جاؤ گے
راستے شہر کے سب بند ہوئے ہیں تم پر
گھر سے نکلو گے تو مخمور کدھر جاؤ گے

مخمور کو زبان وبیان پر باضابطہ دسترس تھی۔ انھوں نے کبھی جدیدیت کی یلغار میں آکر مشکل ومبہم علامتیں اور استعارات استعمال نہیں کیے بلکہ صاف اور سلیس اور بامحاورہ الفاظ میں اپنی بات کو قارئین تک پہنچانے کی کوشش کی ہے۔

مخمور کی غزل اردو غزل میں اپنا ایک منفرد مقام رکھتی ہے۔ جہاں انھوں نے ایک طرف روایت کی قدر کی ہے وہیں دوسری طرف ترقی پسند اور جدیدیت کے اہم پہلو کو بھی سراہا ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری میں ایک توازن برقرار رکھا ہے۔ نہ کسی تحریک کے ساتھ قدم ملانے کی کوشش کی اور نہ کوئی علیحدہ تحریک یا انجمن بنانے کی کوشش کی۔

مخمور نے کلاسکیت، ترقی پسند، جدیدیت اور مابعد جدیدیت کو ایک لڑی میں پرونے کی کوشش کی ہے اور کافی

حد تک اس میں وہ کامیاب نظر آتے ہیں۔ بقول ملک نسیم:

''مخمور سعیدی کی غزل کا اسکی طرزِ ادا کا اقرار بھی ہے اور اقرار اور انحراف کے حسن ویقین کا اظہار بھی۔ ان کی غزل اپنے عہد کے تفکر کی پاسدار ہے لیکن اسے کسی عہد تک محدود کردینا سخت ناانصافی ہوگی ان کے شعر کی مجموعی تاثیر آپ بیتی اور جگ بیتی میں کوئی حدِ فاصل قائم نہیں کرتی۔''

(ملک نسیم 'مخمور سعیدی اور ان کا فن' مشمولہ 'بجھیر میں اکیلا' ص 216)

مخمور کی غزلوں کی ایک خاصیت یہ بھی ہے کہ ان کی غزلیں عام سے عام قاری کو سوچنے پر مجبور کرتی ہیں دوسری طرف دلی جذبات واحساسات کی ترجمانی کرتی ہیں۔ انھوں نے اپنی غزلوں کے ذریعے ایسا راستہ ہموار کیا ہے جہاں سے آگے ہمارے شاعروں کو چلنے میں آسانی ہوتی ہے اور انسان کو نامساعد حالات میں بھی جینے کا حوصلہ مل جاتا ہے۔ مخمور کا کہنا بالکل صحیح معلوم ہوتا ہے کہ

عمر کتابوں کی مخمور سوا ہے ہم سے
ہم نہ رہیں گے، حرف ہمارا رہ جائے گا

مخمور سعیدی نے غزل کے ساتھ ساتھ نظم کو بھی وسیلہ اظہار بنایا۔ حالاں کہ یہ ایک بہت مشکل کام ہے کہ شاعر غزل اور نظم میں یکساں مقبول ومشہور ہو۔ مخمور کے تقریباً ہر مجموعے میں غزلوں کے ساتھ ساتھ نظمیں بھی خاصی تعداد میں ملتی ہیں۔ ان کے کلیات 'عمر گزشتہ کا حساب' میں تقریباً 187 نظمیں شامل ہیں۔ جن میں پابند نظمیں ہونے کے ساتھ ساتھ آزاد، معریٰ اور نثری نظمیں بھی شامل ہیں۔ جس طرح سے مخمور نے غزل میں ایک نیا انداز اختیار کیا ہے اسی طرح انھوں نے نظم میں اپنی ایک الگ راہ نکالنے کی کوشش کی ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے ان کی اسی خصوصیات پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے:

''مخمور سعیدی کے بارے میں میرا خیال تھا کہ ان کی غزل میں جو پختہ کارانہ رنگ روپ، مفکرانہ ٹھہراؤ اور استعاراتی کیفیت ہے وہ ان کی نظم میں نہیں۔ 'دیوار و در کے درمیاں' نے میرا خیال غلط ثابت کردیا ہے۔ مخمور سعیدی کی نظم میں اب وہ ارتکاز، کم گوئی میں کثیرالمعنویت اور شدت احساس کے ساتھ ساتھ بالواسطگی نظر آنے لگتی ہے جو جدید نظم کو گزشتہ نسل کی نظم سے الگ کرتی ہے۔''

(شمس الرحمٰن فاروقی 'مفکرانہ ٹھہراؤ اور استعاراتی کیفیت' (کلیات عمر گزشتہ کا حساب) ص 327)

مخمور سعیدی کی نظمیہ شاعری میں 'لفظ' کو ایک خاص مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ انھوں نے 'لفظ' کے تخلیقی اظہار کو مختلف صورتوں میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ مجموعۂ 'آواز کا جسم' کے منظوم پیش لفظ میں انھوں نے لفظ کی اہمیت کو اس طرح سے اجاگر کیا ہے۔

لفظ آواز کا جسم ہے/ لفظ کو اپنے احساس کے گرم ہونٹوں سے چھوا/ ذہن کی نرم بانہوں میں بھر اور محسوس کر/ لمس آواز کا/ قرب خاموش لمحوں کے دمساز کا

مخمور سعیدی جس طرح سے غزل میں روایت کی قدر کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ نظم میں بھی انھوں نے مٹتی ہوئی تہذیب، رشتوں کا ٹوٹنا، گھریلو حالات اور سماجی تبدیلیاں جیسے موضوعات کو پیش کیا ہے۔ ان کی ایک علامتی نظم 'لفظوں کا المیہ' کا ایک بند مثال کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔

نئے نئے لفظ شور کرتے بڑھتے چلے آرہے ہیں اور میں/ ہجوم پر شور میں، اکیلا/ یہ دیکھتا ہوں/ جہاں جہاں کل پرانے لفظوں نے ڈال رکھے تھے اپنے ڈیرے/ وہاں نئے لفظ آکے آباد ہوگئے ہیں/ مکاں اگرچہ اجڑنہ پائے، مکین برباد ہوگئے ہیں/ پرانے لفظوں کے ساتھ ہی اک پرانی دنیا بھی کھوگئی ہے/ خموشیوں کے سیاہ زنداں میں جاکے روپوش ہوگئی ہے

اس نظم میں ایک طرف سے لفظوں کا ماتم دکھائی دے رہا ہے اور دوسری طرف ماضی کا مٹ جانا۔ شاعر کو اس کا احساس ہوگیا تھا کہ ہمارا ماضی ہم سے دور ہوتا چلا جارہا ہے اور نئے رنگ وڈھنگ بہت تیزی سے ہماری زندگی میں شامل ہورہے ہیں۔

مخمور کی ابتدائی نظموں میں علامہ اقبال، فیض، مجید امجد اور خاص طور اختر الایمان کا اثر صاف جھلکتا ہے۔

مخمور سعیدی نے اپنی زندگی میں بہت سے واقعات وحادثات دیکھے ہیں۔ دلی آنے کے بعد انھیں بہت سارے ایسے حالات کا سامنا کرنا پڑا جن کا اثر ان کی شاعری پر صاف دکھائی دیتا ہے۔ نظم 'آخری بس' ایک بہترین نظم ہے جس میں مخمور نے ایک انسان کے احساسات کی تصویر کشی کی ہے جو گاؤں سے شہر کسب معاش کے لیے آجاتا ہے لیکن یہاں رہ کر وہ اپنے ماضی سے کٹ جاتا ہے۔ اپنے اسلاف سے بہت دور چلا جاتا ہے۔ پہلے پہل انھیں یہ محسوس ہوتا ہے کہ شاید ان کے ساتھ آباواجداد کے عقیدے ہیں لیکن وقت گزر جانے کے بعد ان کے پاس کچھ بھی نہیں بچتا ہے۔ اس لیے شاعر گاؤں سے شہر آنے والے ہر مسافر کو ترغیب دیتا ہے کہ واپس اپنے اسلاف کے پاس چلے جاؤ۔ یہاں آپ اپنی میراث سے بہت دور ہوجاؤ گے۔ وہاں ہی آپ کوئی چھوٹا سا کام کرلو جہاں پر آپ اپنے اسلاف کی اقدار اور عقائد کو آنے والی نسلوں کے لیے بچائے رکھ سکو اور شاعر آخر میں بس کا وقت بتاتا ہے اور آخری بس میں جانے کو کہتا ہے، پیش ہے نظم آخری بس کا ایک بند۔

لیکن میرے دل کے کسی گوشے میں ابھی تک/ بوسیدہ بے کار عقیدے/ پرکھوں کی میراث پرانی/ بچی کچھی کچھ پڑی ہوئی ہے/ اس کی حفاظت کی خاطر تم سے کہتا ہوں/ تم واپس جانا چاہو تو/ گیارہ بج کر بیس منٹ پر آخری بس ہے

اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ مخمور کو ماضی سے اپنے اسلاف کی اقدار اور عقائد سے کس قدر والہانہ محبت تھی۔

مخمور کے یہاں رومانی نظموں کی تعداد خاصی کم ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ حسن وعشق کی داستان مخمور کی نظمیہ شاعری میں بس آٹے میں نمک کے برابر ہے۔ ان کی بہترین رومانی نظموں میں ''خاک وباد سے آگے، لمحے کا حسن، شکست، وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ نظم 'شکست' سے چند شعر بطور مثال پیش ہیں۔

ترا ہنستا ہوا چہرہ/ غزل گاتی ہوئی آنکھیں/ میں اس چہرے کو جب ہاتھوں میں لے کر چوم لیتا ہوں/ تو لگتا ہے/ اتر آتی کنواری روشنی صبح ازل کی/ میرے سینے میں......

مختصر یہی ہے کہ مخمور سعیدی نے منہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے نظمیں نہیں کہیں بلکہ ان کا تخلیقی مزاج نظم کے فطری آہنگ سے مانوس نظر آتا ہے یہی وجہ ہے کہ غزلیہ شاعری کے ساتھ ساتھ انھوں نے نظمیہ شاعری کو یکساں سنجیدگی اور احتیاط کے ساتھ برتنے کی کوشش کی ہے۔

مخمور نے غزل اور نظم کے علاوہ دوسری شعری اصناف میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ انھوں نے قطعہ، رباعی، دوہے، وغیرہ میں بھی اپنی صلاحیتوں کے جوہر دکھانے کی کوشش کی ہے۔ جس میں وہ کسی حد تک کامیاب بھی نظر آتے ہیں۔

مخمور سعیدی کی شاعری کا جائزہ لینے سے یہ بات عیاں ہوجاتی ہے کہ ان کی شاعری کا کینوس بہت بڑا ہے۔ جس میں انھوں نے روزمرہ کے حالات وواقعات کو بہترین انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے زندگی کا مطالعہ کافی باریک بینی سے کیا تھا اور اپنے جذبات واحساسات کی عکاسی جس انداز سے کی تھی اس میں وہ کافی حد تک کامیاب نظر آتے ہیں۔ زندگی نے انھیں کافی مایوس کیا ہے لیکن پھر بھی ان کے یہاں جینے کا حوصلہ ملتا ہے۔ زندگی سے مایوسی کے باوجود آگے بڑھنے کا حوصلہ وہ اپنے قاری کو بھی دینا چاہتے ہیں۔ ان کی شخصیت اور شاعری کے مطالعے سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ مخمور سعیدی نہ صرف ایک اچھی شخصیت کے مالک تھے بلکہ ایک اچھے شاعر بھی تھے۔

■

Irfan Rasheed
Dept of Urdu, Kashmir University
Dargah Hazrat Bal, Srinagar - 190006
Tel.:9622701103

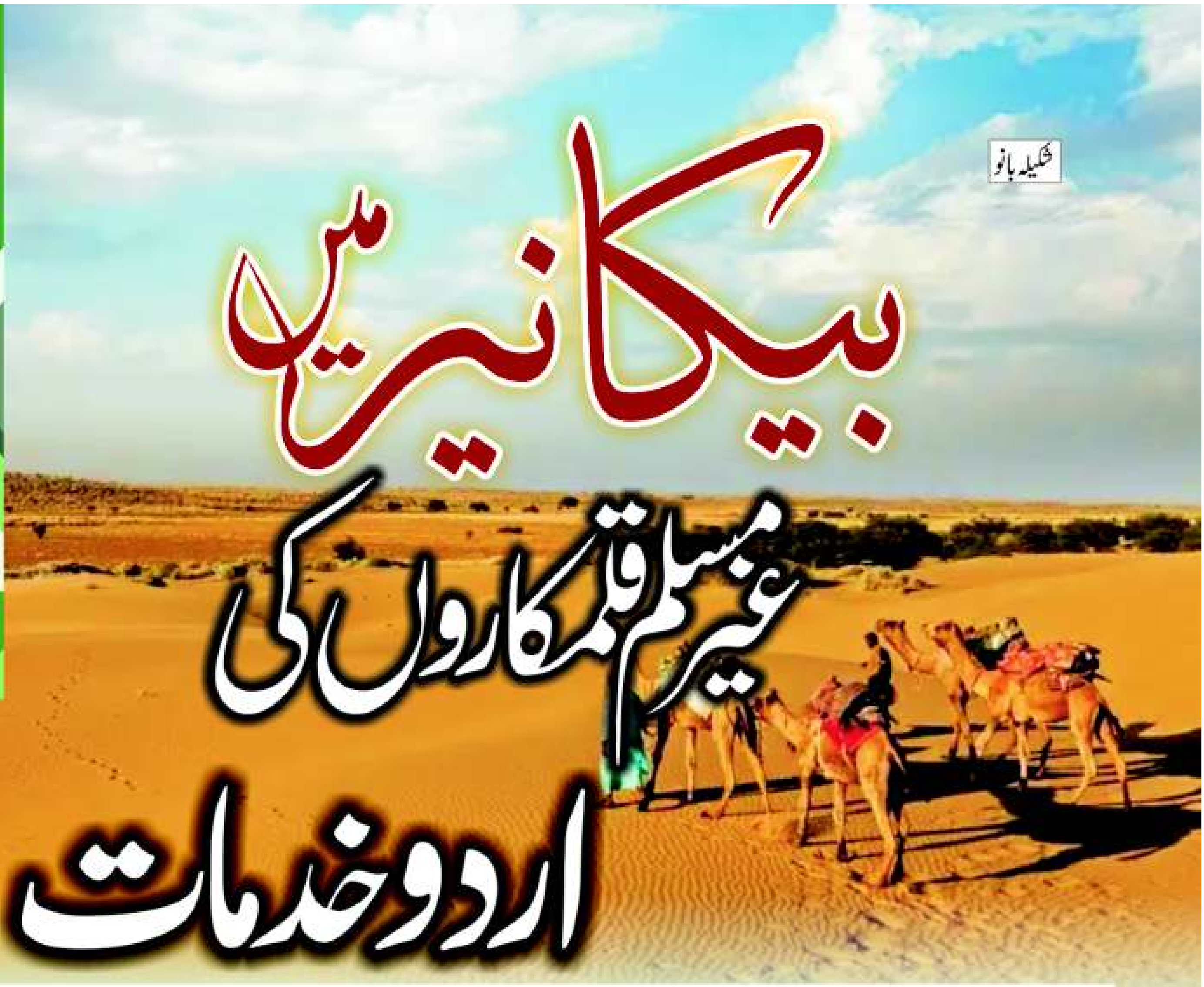

بیکانیر میں غیر مسلم قلمکاروں کی اردو خدمات

شکیلہ بانو

بیکانیر شہر کی بنیاد جودھپور ریاست کے راج کمار اور بیکانیر ریاست کے بنیاد گزار راؤ بیکا نے 1488 میں رکھی۔ یہ ریاست راجپوتانہ کی اہم اور بڑی ریاستوں میں سے ایک تھی۔ یہ ریاست جہاں شمشیر وسناں کے حوالے سے اپنی شاندار تاریخ رکھتی ہے وہیں تہذیب وثقافت اور علوم وفنون کے لحاظ سے بھی کسی دوسری ریاست سے پیچھے نہیں رہی۔ ہندوستان میں جس گنگا جمنی تہذیب کی بات کی جاتی ہے اس کی سب سے اچھی مثال اسی شہر میں ملتی ہے۔ اس تہذیبی اشتراک کا سلسلہ ابتدا ہی سے شروع ہو گیا تھا۔ مغلیہ سلطنت سے گہرے روابط کے سبب یہاں تہذیب وثقافت اور علوم وفنون پر بھی مغلیہ دربار اور ان کی تہذیبی زندگی کے گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ اس سلسلے میں مزید روشنی ڈالتے ہوئے ڈاکٹر ابوالفیض عثمانی لکھتے ہیں:

''راجہ کلیان مل (1548-1573) نے اکبر اعظم کی اطاعت قبول کرکے اپنے بھائی کان سنگھ کی دختر کو اس کے عقد میں دیا تھا۔ اس قرابت کے باعث سلاطین مغلیہ نے والیان بیکانیر کو اعلی خطابات اور معزز القابات سے نوازا یہ سلسلہ احمد شاہ کے عہد تک جاری رہا اور احمد شاہ اس ریاست کے چودھویں فرماں رواں راجہ گنج سنگھ (1727-1788) کو ہفت ہزاری منصب اور راج راجیشور مہاراج دھراج مہاراجہ سرومنی گنج سنگھ بہادر'' کا خطاب عطا کیا تھا۔ انھیں تعلقات کی بنا پر بیکانیر میں فارسی کا رواج پانا ایک فطری امر تھا۔

ریاست کے سترہویں حکمراں مہاراجہ صورت سنگھ (1801-1829) نے 1820 میں انگریزوں سے معاہدہ کرکے سلاطین مغلیہ سے تعلقات ختم کردیے۔ مگر ریاست کی سرکاری زبان فارسی ہی رہی۔[1]

انیسویں حکمراں مہاراجہ سردار سنگھ (1852-1872) نے مرزا غالب سے ریاست کے سکہ پر کندہ کرنے کے لیے 'سکہ' لکھنے کی فرمائش کی تھی اور مرزا غالب نے تین شعر لکھ کر مہاراجہ کو بھیجے تھے۔ مہاراجہ مذکور کی جانب سے ملکہ وکٹوریہ کے نام فارسی میں ایک مکتوب کا مسودہ بھی مرزا غالب نے حسب الطلب روانہ کیا تھا جس کا ذکر غالب کے مکتوب تاریخ 5 جنوری 1859 میں موجود ہے۔[2]

مہاراجہ ڈونگر سنگھ کے لیے کہا جاتا ہے کہ اس نے خود بھی اردو پڑھی تھی اور ریاست کے سرکاری مدارس میں بھی فارسی اردو تعلیم کا انتظام کیا تھا۔ اس کے بعد میں مہاراجہ گنگا سنگھ 1887 میں تخت نشین ہوا اور اس کے عہد میں بیکانیر کے سرکاری دفاتر میں بھی اردو کا استعمال ہونے لگا اور اس طرح اردو داں حضرات ریاست کے مختلف محکموں میں ملازم ہوئے۔''[3]

بیکانیر میں دوسری ریاستوں کی طرح مغلیہ سلطنت کے اثرات یہاں کی تہذیب وثقافت اور زبان وادب پر خوب دیکھنے کو ملتے ہیں۔ یہاں کی سرکاری زبان اگرچہ راجستھانی تھی لیکن مغلیہ سلطنت سے رابطہ بنائے رکھنے کے لیے فارسی زبان کا استعمال بھی ہوتا تھا۔ اس لیے مغلیہ سلطنت کے زوال کے ساتھ ہی فارسی زبان کی اہمیت بھی کم ہوتی گئی اور ایسٹ انڈیا کمپنی نے فارسی کی جگہ انگریزی کو سرکاری زبان قرار دے دیا اور دفاتر میں اردو کو بھی رائج کر دیا۔ مختلف دیسی ریاستوں میں فارسی اور اردو جاننے والوں کی ضرورت بنی رہتی تھی۔ ان ریاستوں

نے اپنے مدارس میں فارسی اور اردو کی تعلیم کو ضروری قرار دیا۔ بغیر تفریق مذہب وملت، اردو اور فارسی کی تعلیم عام تھی۔ اس لیے ان دونوں زبانوں میں ہندو یا مسلمان یا سکھ ہو یا کوئی اور اپنا علمی اظہار کرتے تھے۔ دفاتر کے کام کے علاوہ دیگر علمی کاموں میں بھی انھیں زبانوں کو ذریعہ اظہار بنایا جاتا تھا۔ شروع میں فارسی کو اہمیت حاصل رہی لیکن رفتہ رفتہ اس کی جگہ اردو نے لے لی۔ یہی وجہ ہے کہ انیسویں صدی میں فارسی کے مقابلے میں اردو زیادہ تخلیقی اور تحریری کام ہوتا نظر آتا ہے۔ بیکانیر ریاست میں بھی ایسے بہت سے لوگ موجود تھے جنھیں اردو میں فارسی پر مہارت حاصل تھی ان میں مسلمان بھی تھے اور غیر مسلم بھی۔ چونکہ 19 ویں صدی میں دفاتر کی زبان اردو تھی اس لیے یہاں کی تاریخ اور دیگر ریاستی رپورٹ وغیرہ اردو میں تیار کروائی گئیں۔

چنانچہ اسی زمانے میں ریاستِ بیکانیر کے محکمہ ایجنسی کونسل کے ایڈیشنل ممبر کے عہدے پر منشی سوہن لال بھٹناگر فائز ہوئے منشی سوہن لال بھٹناگر نے 'تاریخ راجیہ بیکانیر' کے نام سے 'ریاستِ بیکانیر کی تاریخ' مرتب کی جو 1889 میں شائع ہوئی۔ یہ کتاب 1890 میں جیل پریس بیکانیر میں چھپی تھی۔ اس میں ریاست کے جغرافیائی حالات ریاستی نظم ونسق کے علاوہ رفتارِ تعلیم پر بھی روشنی پڑتی ہے۔[4]

اسی طرح رائے بہادر سوڈھی حکم سنگھ اسسٹنٹ کمشنر پنجاب وائس پریزیڈینٹ ایجنسی کونسل راجسری بیکانیر نے 'بیکانیر کا جغرافیہ' اور 'سوانح عمری رؤسا وشرفائے بیکانیر' کے نام سے دو کتابیں لکھیں۔ سوانح عمری 'رؤسا وشرفائے بیکانیر' کی پہلی جلد 1894 میں شائع ہوئی۔ اس کتاب کے بارے میں سوڈھی صاحب لکھتے ہیں:

''جو واقعات اس کتاب میں لکھے گئے ہیں وہ عموماً یا تو کاغذات بیکانیر سے اخذ کیے گئے ہیں یا جغرافیہ بیکانیر وگائیڈ ٹو بیکانیر مرتبہ مصنف سے اخذ کیے گئے ہیں۔ اور بغیر حتی الامکان ان معتبر لوگوں سے دریافت کر کے لکھے گئے ہیں جن کو ان سے پوری واقفیت تھی... یہ کتاب تین جلدوں پر منقسم کی گئی ہے جن میں سے یہ جلد اول مکمل ہو کر چھپ چکی ہیں، اور باقی جلدیں چھپ رہی ہیں۔''[5]

یہ کتاب حروف تہجی کے اعتبار سے ترتیب دی گئی ہے۔ یعنی یہ ایک تذکرہ ہے۔ اس میں کل 198 صفحات ہیں۔ جغرافیہ بیکانیر اردو میں لکھی گئی تھی جو نایاب البتہ اس کا انگریزی ترجمہ دستیاب ہے۔ ایک بہت ضخیم کتاب 'تاریخ ریاست بیکانیر' کے نام سے لکھی گئی۔ جسے ٹھاکر میگھ سنگھ نے تصنیف کیا۔ یہ 1898 میں شائع ہوئی۔

تاریخِ راجیہ بیکانیر اور دیگر کتابوں پر لکھے گئے تاریخی قطعات سے پتا چلتا ہے کہ اس وقت بہت سے ایسے لوگ موجود تھے جو شاعری کرتے تھے۔ ان میں سے چند نام یہ ہیں:

1 منشی شنکر سوروپ نجات
2 منشی جے سکھ لال
3 منشی جے رام پرشاد تشنہ
4 منشی بندلیش پرشاد

ملازمت کے سلسلے میں یہاں کچھ ایسے یوروپین اور انڈو یوروپین حضرات بھی آئے جو شاعری کے دل دادہ تھے۔ ان میں کپتان ڈومنگو پال ذرہ اور لوئیس پیٹرک لیزوا توقیر شامل ہیں۔ کپتان ڈومنگو پال ذرہ مہاراجہ سردار سنگھ کے عہد میں بیکانیر پہنچے اور افسر جیل ومیونسپلٹی اور فوج کے کپتان تھے۔ پھر وہ جے پور چلے گئے جہاں 1909 میں ان کا انتقال ہوگیا۔

نمونہ کلام دیکھیے۔

ہم عاشقوں کو خاک نشینی پسند ہے
وہ شاہِ اوج حسن تحمل سے مبتلا
اقرار شام سے ہے بڑھا روز حشر پر
کیوں دل ہوا ایسے اہل تغافل سے مبتلا

لوئیس پٹرک لیزوا توقیر کا ذکر بھی ڈاکٹر رام بابو سکسینہ نے اپنی کتاب European and Indo- European Poets of Urdu and persian میں کیا ہے۔ لوئس پیٹرک لیزوا توقیر 1876 میں پیدا ہوئے۔ تعلیم سے فارغ ہو کر ریاست بیکانیر میں ہیڈ کلرکی سے ملازمت شروع کی اور ترقی کر کے ایڈیشنل ریونیو منسٹر کے عہدے تک پہنچے۔ (M.B.E.) کا خطاب بھی حاصل کیا۔ 22 اپریل 1938 کو انتقال ہوا۔[6]

نمونہ کلام۔

گالیاں کھانا خون دل پینا
ذائقے ہیں یہ دل لگانے کے
وہ اپنی بزم میں غیروں کے خوف سے توقیر
ہماری سمت کرم کی نگاہ کر نہ سکے

بیسویں صدی میں شعر وادب کا ذوق پروان چڑھا اور یہاں ادبی سرگرمیاں ہونے لگیں تو باہر سے آنے والوں کے علاوہ مقامی شعرا بھی سامنے آئے جن میں بیدل بیکانیری، راسخ بیکانیری اور ان کے بعد کی نسل سے تعلق رکھنے والوں میں عثمان عارف، غازی بیکانیری کے نام لیے جاسکتے ہیں۔ 1947 کے بعد کئی ایسے غیر مسلم حضرات یہاں تشریف لائے جو اردو سے واقفیت رکھتے تھے اور ان میں سے کچھ ادیب بھی تھے ان میں کا میشور دیال حزیں، ہردرشن سنگھ سہگل، مدن کیولیہ، دیوان چند دیواں پریم کمار سنگھ پریم، ملاپ چند راہی اور ساحل دہلوی کے نام سامنے آتے ہیں۔

کامیشور دیال حزیں 23 فروری 1915 کو ضلع میرٹھ میں پیدا ہوئے۔ 1940 سے قبل آپ بیکانیر میں ملازم ہوئے اور جس وقت بیکانیر تشریف لائے اس وقت اردو میں افسانے لکھا کرتے تھے، مختلف رسائل اور اخبارات میں ان کے افسانے بھی شائع ہوئے۔ یہ سلسلہ بیکانیر آنے کے بعد بھی جاری رہا۔ لیکن بعد وہ شاعری کی طرف آگئے۔ اب تک ان کے کلام کے مجموعے 'دل حزیں' اور 'بعد جانے کے تمھارے' (دیوان حزیں) کے نام سے منظر عام پر آچکے ہیں۔ غزل گوئی سے انھیں خاص شغف تھا۔ بہت پر اثر شعر کہتے تھے۔ ان کے بارے میں جناب عثمان عارف صاحب فرماتے ہیں:

''شعرائے بیکانیر میں جن شاعروں کو قبولِ خاص و عام کا درجہ حاصل ہے اور جن کے نام اور مقام 'تاریخ شعر وسخن' میں قائم اور محفوظ رہیں گے ان میں جناب حزیں کا ذکر بڑے وثوق اور اعتماد سے کیا جا سکتا ہے۔۔ حزیں صاحب کے کلام کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ میر کی زبان میں 'پراگندہ طبع لوگ' یا بہ زبان مولانا روم عشق خوش سودا کے دل ودادو رفتہ اپنی اپنی نشستوں اور محفلوں میں آہیں بھر بھر کر دہراتے ہیں۔ وجہ وہی درد و محبت کی کرشمہ سازی، حسن فتنہ ساماں کی جادوگری۔ دراصل حزیں کی شاعری نگاہوں کے دم سے نہیں دلوں کے ٹکراو سے پیدا ہوئی ہے۔''[7]

جہاں ایک طرف حزیں جذبہ عشق کی مختلف کیفیات کا بیان کرتے ہیں وہیں ان کی زندگی کے حقائق کا گہرا شعور بھی نظر آتا ہے۔ دیکھیے۔

تری نیچی نگاہیں جن کو اٹھنا تک نہیں آتا
انھیں کو ہم نے دیتے موت کا پیغام دیکھا ہے
وہیں موجیں رواں ہیں جن میں کشتی زندگانی کی
نہ اس آئے تو طوفاں ہیں جو راس آئے تو ساحل ہیں
عشق کی راہوں میں پروانہ ہی رہبر ہے حزیں
اپنی آنکھوں سے لگا لے خاک ہر پروانہ ہم
کعبے میں اور دہر میں ملت کی قید ہے
میں تشنہ کام لوٹا ہوں دونوں مقام سے

دیوان چند دیواں کی پیدائش 13 نومبر 1933 کو ٹانک ضلع ڈیرا اسماعیل خاں میں ہوئی۔ ان کے والد کا نام لکا رام تھا۔ دیوان نے بیکانیر کے مشہور شاعر مستان بیکانیری

کی نظم پڑھی جو کہ ایک بھیانک حادثے پر لکھی ہوئی تھی جس سے پڑھ کر دیوان بہت ہی متاثر ہوئے اس نظم نے ان کے اندر سوئے ہوئے شاعر کو جگایا اور اس طرح دیوان شعر گوئی کی طرف مائل ہوئے۔ 1947 میں پاکستان ہجرت کر کے آنے والے قافلے کے ساتھ ہندوستان آئے اور بیکانیر میں بس گئے۔ ان کی تعلیم اردو میں ہوئی تھی اس لیے بچپن ہی سے انھیں اردو سے خاص لگاؤ تھا۔ انھوں نے تقسیم کے وقت فسادات کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ جس میں ان کا سب کچھ جل کر خاک ہو گیا تھا۔ دیوان کا سب کچھ لٹ چکا تھا جو بچا کے لا سکے تھے وہ ان کی اردو زبان تھی۔ جس میں ان کی یادیں چھپی ہوئی تھیں۔ ان کے ساتھ جو کچھ ہوا اور جن حالات سے ان کا واسطہ پڑا اس نے ان کو تنگ نظری کا شکار نہ ہونے دیا۔ انھوں نے اپنے ذہن کو صاف رکھا اور محبت، اخوت اور مذہبی رواداری کو اپنا شعار بنائے رکھا۔ انھوں نے جہاں غزلیں لکھی ہیں وہیں نعت، سلام اور منقبت بھی لکھیں۔ جناب دیوان چند دیوان تقریباً چالیس سال تک مشاعروں میں شرکت کرتے رہے۔ ان کی دو کتابیں منظرِ عام پر آ چکی ہیں۔

1 پروازِ شاہین (حمد و نعت کا مجموعہ)

2 حسنِ ادب (غزلیات اور قطعات کا مجموعہ)

دیوان چند دیوان غزل کے ساتھ حمد، نعت، سلام اور منقبت بھی بڑی عقیدت کے ساتھ کہتے تھے۔ چند مثالیں دیکھیے

حمد

غیر ممکن ہے تری تعریف ہو مجھ سے بیاں
میں ہوں عاجز اور تو ہے مالکِ ہر دو جہاں

نعت کا یہ شعر دیکھیں۔

کیا خوف اس کو روزِ قیامت کی دھوپ سے
دیواں ہے زیرِ سایۂ دامانِ مصطفےٰ
دوا کیا کارگر ہوگی میں بیمارِ محمد ہوں
طبیبو! نام لو ان کا تو میری جاں میں جاں آئے
انوارِ حق برستے ہیں دن رات اس جگہ
جنت سے کم نہیں ہے گلستانِ مصطفےٰ
گونجتی تھی زمانے میں جو آوازِ بلالی
اب تک وہی آواز فضاؤں میں بسی ہے

دیوان نے سلام بھی بڑی عقیدت کے ساتھ لکھے ہیں۔ یہ اشعار دیکھیں۔

دیواں بھی حسینی ہے مناتا ہے یہ ماتم
عاشور میں اس کو کبھی خنداں نہیں دیکھا
اپنے لہو سے سینچ کے اس ریگ زار کو
شبیر کربلا کو گلستاں بنا گئے

پھر سے کسی حسین کی آمد ضرور ہے
لو وقت کے یزید پھر اپنی پہ آ گئے

مناقب کے میدان میں بھی دیوان نے اپنی عقیدت کا اظہار بہت پر اثر انداز میں کیا ہے۔ حضرت صدیق اکبر کی شان میں منقبت کا یہ شعر ملاحظہ ہو

قرینے سے سجا دیواں یہ نذرانہ عقیدت کا
سنا ہے خاص نسبت ہے تجھے صدیق اکبر سے

اردو زبان سے ان کو بے انتہا محبت تھی جس کا ثبوت ان کا یہ شعر ہے۔

کیا حسیں ہے یہ اردو زباں دوستو
اس کا عاشق ہے سارا جہاں دوستو

دیوان چند کی غزلیہ شاعری میں ماضی کا درد شدت کے ساتھ ابھر کر سامنے آتا ہے۔ ملاحظہ کریں۔

آشیانہ جلے ایک مدت ہوئی
دل سے اٹھتا ہے اب تک دھواں دوستوں

مگر اسی کے ساتھ ان کے یہاں غزل کا کلاسکی لہجہ بھی پایا جاتا ہے۔ مثلاً

یہ زلفِ سیہ اور ترا روئے منور
میں ایک جگہ شام و سحر دیکھ رہا ہوں
تیری زلفوں کے سائے میں اندھری رات دیکھی ہے
سلامت تیری رعنائی ہم اپنے ہوش کھو بیٹھے

پریم 21 اکتوبر 1913 کو خان پور ریاست بھاول پور میں پیدا ہوئے، ان کے والد دیوی دیال ایڈوکیٹ فارسی و اردو کے اچھے عالم تھے۔ 5 جنوری 1947 آپ کو خانپور چھوڑنا پڑا اور ایک شرنارتھی کی حیثیت سے ہندوستان آئے۔ پریم نے بی اے بی ٹی بھی کیا اور فارسی و اردو میں آنرس کی ڈگریاں بھی حاصل کیں۔ آپ اسسٹنٹ ڈائریکٹر آف ایجوکیشن راجستھان کے عہدے پر فائز رہے۔ شعرو سخن سے فطری ذوق تھا۔ تقسیم کے وقت اپنا گھر، جاگیر اور ملازمت چھوڑ کر بیکانیر آ گئے۔ پریم کا شعری مجموعہ 'بہت دور جانا ہے تجھ کو مسافر' 2001 میں ان کے انتقال کے بعد منظر عام پر آیا جسے ڈاکٹر محمد حسین نے ترتیب دیا۔ اس مجموعے میں قطعات و رباعیات اور غزلیات و منظومات شامل ہیں۔ ان کی شاعری میں روحانیت اور رومانیت پائی جاتی ہے۔ پریم خودداری اور زندہ دلی کے شاعر ہیں۔ وہ اپنی غزلوں نظموں میں ان لوگوں کی تعریف کرتے ہیں جو ہمت کے بل پر زندہ رہتے ہیں۔ سہاروں کے بھروسے پر نہیں۔ مسافر کا مقصد صرف اور صرف منزل تک پہنچنا ہوتا ہے چاہے اس پر کتنی ہی مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹے ہوں وہ قسمت کے بھروسے نہیں رہتے بلکہ قسمت کو بدلنا بھی جانتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ۔

نہیں بدلا زمانہ تو، بدل دو تم زمانے کو
یوں ہی ہوتا رہے گا شکوۂ دورِ زماں کب تک
یہ دورِ شام بھی ہے دو گھڑی کا میہماں اب تو
کرن پھوٹی، سحر کا پھر نیا پیغام آتا ہے

پریم سنگھ اجالوں کے طلب گار تھے۔ وہ اندھیروں سے ڈر کر اپنا راستہ نہیں بھٹکنا چاہتے تھے انھیں بھروسہ تھا کہ اندھیرا مٹے گا اور اجالا پھیلے گا۔ ان کا شعر ملاحظہ فرمائیں۔

روشنی سے ہم نہیں محروم رہ سکتے سدا
بڑھ رہا ہے سایۂ تاریکیِ باطل تو کیا

پریم کی غزلوں میں انسانیت سے محبت کا جذبہ بھی پایا جاتا ہے۔ وہ انسان کو محبت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ ایسی عبارت سے کوئی مطلب نہیں جس میں خدا کو تو خوش کیا جاتا ہے لیکن اس کے بندوں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہو۔ اس لیے وہ اپنی غزل میں کہتے ہیں کہ۔

ہاں پریم کا تو مذہب ہی نہیں مومن وہ نہیں ہو سکتا مگر
بھگوان کے بھکتوں میں نہیں، ہے پیار اسے انسانوں سے

دو شعر اور دیکھیں۔

رنج و غم کے خریدار ابھی باقی ہیں
بہت اٹھ گئے دو چار ابھی باقی ہیں
خیالِ مرگ سے ڈر کر تجھے قرار نہیں
یہ ایک بار ہی آتی ہے بار بار نہیں

ملاپ چند راہی کا تعلق بھی اسی قافلے سے تھا جو پاکستان سے ہندوستان ہجرت کر کے آئے۔ وہ 1936 میں ڈیرہ اسماعیل خاں میں پیدا ہوئے۔ 1981 میں انتقال کیا۔ ان کے ادبی ذوق کی نشو و نما میں انصار محشر عباسی کا بڑا اہم کردار رہے۔ ان کا مجموعۂ کلام شائع نہ ہو سکا۔ یہ مثال دیکھ دیکھیں۔

میرے غم آپ کو اگر ملتے
آپ نے ہوش کھو دیے ہوتے
میرا دم ہے کہ مسکرا تا ہوں
آپ ہوتے تو رو دیے ہوتے8

ہر درشن سنگھ سہگل صاحب بھی انھیں حضرات میں شامل ہیں جو پاکستان سے ہجرت کر کے بیکانیر تشریف لائے۔ آپ ایک پختہ کار افسانہ نگار ہیں اردو کے موقر رسائل میں شائع ہوئے ہیں جن میں شاعر خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ ان کے افسانوں کے مجموعے دیوناگری رسم الخط میں شائع ہو چکے ہیں۔

ڈاکٹر مدن کیولیہ ہندی کے پروفیسر رہے ہیں۔ ہندی ادب میں انھوں نے بحیثیت نقاد اور تخلیق کار اپنا مقام بنایا ہے۔ وہ اردو سے بھی واقف ہیں۔ انھیں طنزو

مزاح سے خاص شغف ہے ان کے مزاحیہ مضامین اردو کی کتابوں میں شامل ہیں۔ کیولیہ جی شعر بھی کہہ لیتے ہیں۔

رام کشن سائل دہلوی (پ 1922م 1989) کا شعری مجموعہ 'سرمایۂ ساحل' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ آپ دہلی میں پیدا ہوئے وہیں آپ کا بچپن گزرا اس لیے ان کی زبان پر دہلوی اثرات نظر آتے ہیں۔ غزل کے علاوہ نعت وحمد بڑے اشتیاق سے کہتے ہیں۔ نمونہ کلام دیکھیں۔

کوئی وحشی کوئی مجنوں کوئی دیوانہ کہے
ہم کو دنیا نے دیے نام تری فرقت میں

ان کے علاوہ ستیہ پرکاش گپتا ناداں اور پریم شنکر شرما وحشی کا بھی تعلق بیکانیر سے رہا۔ وحشی کا یہ شعر دیکھیں۔

خدا غارت کرے اس تیرگی کو
ترستے رہ گئے ہم روشنی کو 9

بیکانیر میں ادبی محفلوں کا انعقاد جس کثرت سے ہوتا ہے اس کی مثال شاید ہی کہیں ملے۔ یہاں کی گنگا جمنی تہذیب کے فروغ میں ان ادبی تقاریب کا اہم کردار ہے۔ یہاں کسی ایسی ادبی سرگرمی کا تصور نہیں کیا جا سکتا جس میں اردو ہندی اور راجستھانی شاعر اور ادیب شامل نہ ہوں۔ کسی بھی زبان سے متعلق کوئی بھی مجلس منعقد کی جائے اس میں سبھی زبانوں کے اہل قلم شامل ہوتے ہیں۔ اس لیے یہاں لسانی تعصب کا نام ونشان نہیں پایا جاتا۔ اس سے یہ فائدہ ہوا کہ نئی نسل کے بہت سے لوگ بہ یک وقت تینوں زبانوں میں تخلیقی سرگرمی میں منہمک ہو گئے۔ اردو شاعری کے حوالے سے یہ بات بڑی خوش آئند ہے کہ نئی نسل کے تخلیق کار اس طرف بڑے ذوق وشوق سے آئے ہیں۔ ان میں ڈاکٹر منجو کچھاوا، جناب روی شکل، امت گوسوامی، سنجے ورن، اور رجندر سورن کار کے نام لیے جا سکتے ہیں۔

ان میں ڈاکٹر منجو کچھاوا صاحبہ کا ادبی سفر بہت دلچسپ رہا ہے۔ ان کی شاعری خصوصاً ہندوستانی زبان کی خوبصورتی سے سجی ہوئی ہے۔ ان کی شاعری میں اردو اور ہندی الفاظ کی عکاسی بڑی دلفریب نظر آتی ہے۔ ان کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ وہ بڑی تیز رفتاری کے ساتھ تخلیقی میدان میں آگے بڑھ رہی ہیں۔ اگرچہ اردو رسم الخط سے واقف نہیں مگر اردو شعری روایت کا پورا خیال رکھتے ہوئے شعر کہتی ہیں۔ چند ہی سالوں میں ان کے آدھا درجن سے زیادہ شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ جن میں ایک مجموعہ دیوناگری اور اردو رسم الخط میں بھی شائع ہوا ہے۔ اب تک ان کے مندرجہ ذیل مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں:

1 انچھوئے پہلو 2016
2 گونجتی خاموشی 2018
3 میں نہیں ہوں 2019
4 یقین ہونے تک 2019
5 سیپیوں کی قید میں 2019
6 خواب پر چرچا 2020

ڈاکٹر صاحبہ کے چار ذاتی مجموعے اور تقریباً دس اجتماعی مجموعے ہندی رسم الخط میں منظر عام پر آ چکے ہیں۔

منجو کچھاوا فطری شاعرہ ہیں اگر یوں کہیں کہ فنافی الشاعر ہیں تو بے جا نہ ہوگا۔ ان کی شاعری ان کی قلبی کیفیات کی آئینہ دار ہے۔ جس میں ہزار ہا رنگ پائے جاتے ہیں۔ یہاں ان کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں جس سے ان کی تخلیقی ثروت مندی کا اندازہ ہو سکے گا۔

میں کوئی گل نہیں ہوں خوشبو ہوں
مجھ کو باندھو گے باولے ہو کیا
اگر دعا ہی نہ نکلے زباں سے اس کی انا
فقیر کا کبھی کشکول بھر نہیں سکتا
جن دیوں کی حفاظت میں لگا ہے کب سے
دھیان رکھنا وہ تیرے ہاتھ جلا سکتے ہیں

روی شکل بھی بہت ڈوب کر شعر کہتے ہیں۔ وہ بڑی نفیس شخصیت کے حامل انسان ہیں یہی نفاست ان کی شاعری میں نظر آتی ہیں۔ اردو سے انھیں بہت لگاؤ ہے۔ کم ہی وقت میں انھوں نے اردو اوزان وبحور اور زبان وبیان پر گرفت بنالی ہے۔ بہت ہی الگ طریقے سے شعر کہتے ہیں۔ ان کے دو شعری مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں سحر ہونے کو اور میں ہوں۔

ان کا رنگ کلام دیکھیے۔

وقت کے ساتھ زمانے سے گزر جاؤگے
خشک مٹی کی طرح ہاتھ سے چھٹ جاؤگے
وقت ملبوس کے جیسے ہی بدل دے گا تمھیں
جسم پر حق نہ جماؤ کہ بکھر جاؤ گے
اٹھ رہا ہے نقاب پھولوں کا
دیکھیے تو شباب پھولوں کا
وصل کی رات میں کہاں فرصت
کون رکھے حساب پھولوں کا

امت گوسوامی اور ان کے بھائی است گوسوامی بیکانیر میں ایسی ہستیاں ہیں جو اردو کے دیوانے ہیں۔ انھیں اردو سے محبت وراثت میں ملی ہے۔ ان کے والد کو غالب کا تقریباً پورا دیوان ازبر تھا۔ یہی حال ان دونوں بھائیوں کا ہے غالب کے بیشتر اشعار انھیں بھی یاد ہیں۔ اس کے علاوہ اردو کے قدیم وجدید شعرا کے اشعار اور پوری پوری نظمیں انھیں حفظ ہیں۔ یہی نہیں وہ انھیں بخوبی سمجھتے بھی ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان میں امت گوسوامی میدان شاعری میں اتر آئے اور شروعات ہی میں زوردار ان کی نظمیں اور غزلیں ان کے پختہ ادبی ذوق اور تخلیقی ذہانت کی غماز ہیں۔ یہ شعر دیکھیں۔

کبھی نگاہوں میں کوئی سوال تھا ہی نہیں
جدا بھی ہوں گے کبھی، یہ خیال تھا ہی نہیں
جو تو نہیں تو تری یاد ساتھ تھی، کہ مجھے
یہ امتیاز فراق و وصال تھا ہی نہیں

راجندر سورن کار چھند کے ماہر انھیں جہاں ہندی چھندوں پر عبور حاصل ہے وہیں اردو اوزان پر ان کی مضبوط گرفت ہے۔ سنجے ورن اگرچہ ہندی کے کوی ہیں مگر ان کا مزاج اردو شاعری سے ہم آہنگ ہے اور انھیں یہ مزاج ان کے والد سے ملا ہے جو ہندی کے بہترین کوی اور شاعر تھے۔ انھیں غزل سے خاص محبت تھی ان کی غزلیات کا مجموعہ ان کے انتقال کے بعد سنجے نے شائع کیا۔ سنجے بھی غزل اور قطعات کہتے ہیں اور بہت سلیقے سے کہتے ہیں۔

کہنے کا مطلب یہ ہے کہ موجودہ دور میں بیکانیر میں ایک ایسی نسل سامنے آئی ہے جو اردو شاعری کو نئے امکانات سے روشناس کرانے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ ان میں سے کچھ نے اردو سے اپنی محبت سے مجبور ہو کر اردو رسم لخط بھی سیکھ لیا اور کچھ کوشش کر رہے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ ہمارے یہ شاعر نہ صرف بیکانیر بلکہ پوری اردو دنیا میں اپنی اہمیت منوانے میں کامیاب ہو سکیں گے۔

حواشی

1 راجستھان میں اردو زبان وادب کے لیے غیر مسلم حضرات کی خدمات ص 98-296
2 راجستھان میں اردو زبان وادب کے لیے غیر مسلم حضرات کی خدمات، ص 302
3 سوانح عمری رؤسا وشرفائے بیکانیر جلد اول ص نمبر 2، مطبع جیل صدر، بیکانیر
4 تاریخ ریاست بیکانیر ٹھاکر میگھ سنگھ، جیل پریس بیکانیر 1898
5 راجستھان میں غیر مسلم حضرات کی خدمات ڈاکٹر ابوالفیض عثمانی، ص 299
6 راجستھان میں غیر مسلم حضرات کی خدمات ڈاکٹر ابوالفیض عثمانی، ص 304
7 دیوان حزیں، بودھی پرکاشن، جے پور، 2017، ص 19
8 منقول از تذکرہ شعرائے بیکانیر، مرتبہ عزیز آزاد
9 مارواڑ میں اردو، ڈاکٹر ضیاء الحسن قادری 2016، ص 33-332

■

Dr. Shakila Bano
B.J.S. Rampuria Jain College
Dauji Road inside Kote Gate, Old Bikaner
Bikaner-334001 (Rajasthan)

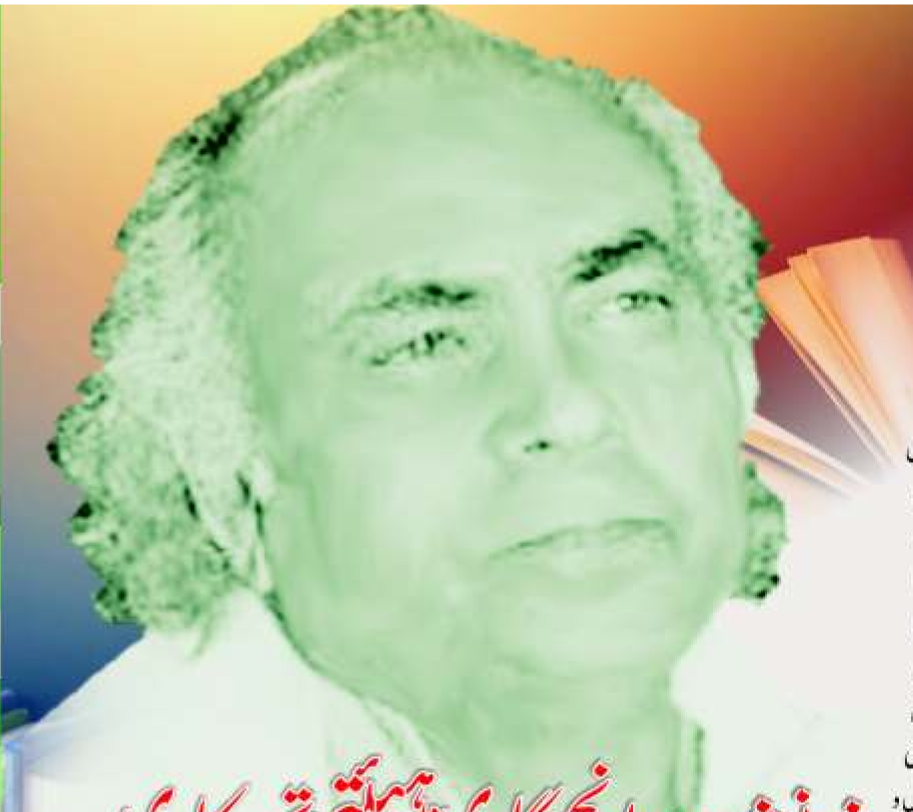

خودنوشت سوانح نگاری میں ہیئتی تجربہ کاری پیکرتراشی اور جمالیاتی اسلوبِ نگارش

('آشرم' از شکیل الرحمن کے حوالے سے)

سید وجاہت مظہر

ہرخودنوشت سوانح حیات کی اپنی ایک خاص ہیئت ہوتی ہے۔ مصنف اپنی داستانِ حیات مخصوص ترتیب وتسلسل کے ساتھ خودنوشت میں مربوط انداز میں رقم کرنے کی سعی کرتا ہے۔ عام طور سے ابتدا میں مصنف اپنے خاندانی منظرنامے کو پیش کرتا ہے۔ وہ اپنی ولادت، بچپن کے اہم واقعات، بنیادی تعلیم و تربیت، نوجوانی کے دلچسپ قصے کہانیاں اور دیگر ذاتی واجتماعی اہمیت کے حامل واقعات، اپنے عہد کے عمومی احوال و عصری افکارو رجحانات، اپنی معاشی تگ و دو سے متعلق اہم باتیں اور بعض دیگر ناقابل فراموش حقائق اور متعلقہ افراد و ہمعصر معاشرے سے جُڑی ہوئی بنیادی معلومات، اپنے جذبات وخیالات واحساسات کا بیان اور اپنی عمر عزیز کے ان ایام کا تذکرہ بھی صفحۂ قرطاس پر منقش کرتا ہے، جن ایام میں کہ وہ یہ آپ بیتی قلمبند کررہا ہوتا ہے۔ قاری کو آپ بیتی کے مطالعے سے مصنف کے خاندانی پس منظر سے لے کر اس کی زندگی کے تادمِ تحریر تمام اہم واقعات وکیفیات کا علم ہوجاتا ہے۔

اردو میں ہمیں ایسی بہت سی آپ بیتیاں ملتی ہیں جن میں مصنف نے اپنی زندگی کے کسی مخصوص دور کو ہی پیش کیا مثلاً جہدِ آزادی کے ضمن میں محض جیل میں قید و بند کی صعوبتوں ہی پر روشنی ڈالی گئی۔ ایسی محدود خودنوشتوں میں مولانا جعفر تھانیسری کی کتاب 'کالا پانی' اور حسرت موہانی کی آپ بیتی 'قیدِ فرنگ' کے نام نمایاں ہیں۔ ایسی خودنوشتیں بھی مرتب ہوئی ہیں جنھیں خود مصنف نے نہیں بلکہ کسی اور شخص نے ترتیب دیا ہو۔ مصنف کے مکتوبات، مضامین، دیباچوں یا مقدمات سے اخذ کرکے خودنوشت سوانح عمری کی شکل ترتیب دی گئی ہو، ایسی سوانح عمریاں نہ صرف اُردو ہی میں بلکہ انگریزی اور دنیا کی دیگر زبانوں میں بھی پائی جاتی ہیں۔ اُردو میں ایسی سوانح عمریوں کی مثالیں 'مرزا غالب کی آپ بیتی' مرتبہ حفیظ بنارسی، 'آپ بیتی: رشید احمد صدیقی' مرتبہ معین الرحمٰن اور 'آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی' مرتبہ عبدالرزاق ملیح آبادی وغیرہ ہیں۔

آپ بیتی لکھتے وقت مصنف کو بہت سی دشواریاں درپیش آتی ہیں جیسے خود اپنی انا کا احساس اور اپنے آپ سے محبت کا جذبہ۔ مصنف خوفِ خلق کے سبب کئی ایسے واقعات و حالات کو تحریر کرنے سے گریز کرتا ہے کہ جن کو پڑھنے کے بعد قارئین اُسے لعنت و ملامت کا نشانہ بنانے لگیں۔ یہ بات صحیح ہے کہ اپنا غم اوروں سے کہہ دینے سے ہلکا ہوجاتا ہے۔ مصنف اپنے تجربات ومحسوسات کو دوسروں کے سامنے پیش کرکے اپنے ذہنی تناؤ کو ہلکا کرنا چاہتا ہے۔ ہر انسان میں اپنی زندگی کے بُرے بھلے واقعات و تجربات دوسروں کے سامنے پیش کرنے کا جذبہ موجود ہوتا ہے۔ جب یہ جذبہ قلم کار کے پاس شدت پکڑتا ہے تو اُسے خودنوشت سوانح حیات لکھنے کے لیے اُکساتا ہے۔ مصنف اپنی ذات کا محاسبہ کرتا ہے اور اس طرح وہ خود اپنی ازسرِنو دریافت بھی کررہا ہوتا ہے۔ دیانت داری، خودشناسی، اظہار کی صلاحیت، انتخاب واقعات وہ عوامل ہیں جو کسی بھی خودنوشت کو اعتبار بخشتے ہیں اور قاری انھی عوامل کی کسوٹی پر آپ بیتی کی افہام وتفہیم کی سعی کرتا ہے۔ مصنف صداقت سے کتنا ہی کام لے اور خودشناسی کا جذبہ اُس میں کتنا بھی موجود ہو اُس کی تحریر بے اثر رہے گی اگر اُسے بیان پر قدرت حاصل نہ ہو۔ لہٰذا صداقت، خودشناسی اور انتخاب واقعات کے باوصف ایک خودنوشت سوانح نگار کے لیے اظہار و ابلاغ پر بھی مکمل قدرت حاصل ہونا چاہیے۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ خودنوشت نگار کے لیے اسلوب کی دلکشی بھی بنیادی شرط ہے۔ اردو میں ایسی خودنوشت سوانحی کتابیں بھی ملتی ہیں جن میں مصنف اپنے فن کی باریکیوں اور اسرار و رموز کو پیش کرتا ہے۔ وہ اپنے فن و فلسفے کی گہرائیوں اور گیرائیوں کی وضاحت بیان کرنے کے ساتھ ساتھ کسی مخصوص فن و ہنر کے حوالے سے یا شعبۂ حیات میں اپنے کارہائے نمایاں کا بیان شامل تحریر کرتا ہے۔ ایسی خودنوشتیں فنی خودنوشت سوانح عمریوں کے زمرے میں آتی ہیں۔

ہیئت کے نقطۂ نظر سے اردو کے اہل قلم نے منظوم خودنوشتیں بھی قلمبند کی ہیں جن میں نمایاں نام حمایت علی شاعر اور رشیدہ عیاں کے ہیں، جنھوں نے بالترتیب 'آئینہ در آئینہ' اور 'میری کہانی' جیسے شاہکار خودنوشت سوانحی فن پارے تخلیق کرکے فن خودنوشت سوانح نگاری کے لیے نئی کسوٹیاں قائم کیں۔ اُن کے علاوہ ادیب سہیل نے اپنی خودنوشت 'غم زمانہ بھی سہل گزرا' اور فضا اعظمی

نے 'تیری شباہت کے دائرے میں' لکھ کر اردو کی منظوم آپ بیتیوں میں اہم اضافہ کیا ہے۔ فضا اعظمی نے اپنی ایک اور تخلیق 'ڈوبتے جہاز کے عرشے پر' کو بھی منظوم خودنوشت کی شکل میں پیش کیا ہے۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ اختر الایمان نے بھی اپنی سوانح حیات منظوم لکھنا شروع کی تھی لیکن بعد میں انھوں نے نثر ہی میں لکھنا مناسب سمجھا جس کا ذکر انھوں نے اپنی منثور خودنوشت 'اس آباد خرابے میں' خاص طور پر کیا ہے۔

اُردو کے شعرا و ادبا نے اپنی داستان زیست بیان کرنے کے لیے کہیں قرۃ العین حیدر کی ناول نما سوانح حیات 'کارِ جہاں دراز ہے' کے طرز پر شعور کی رَو کی تکنیک کا استعمال کیا ہے۔ شعور کی رو کے مطابق تخلیقات میں ترتیب یا ربط کا ہونا ضروری نہیں بلکہ انسانی شعور ایک سیال شے ہے جو منطقی ربط و ضبط کے بغیر زندگی کے ساتھ رواں دواں رہتا ہے۔ اردو میں قرۃ العین حیدر نے اس تکنیک کو فنکارانہ مہارت کے ساتھ ناول 'آگ کا دریا' میں استعمال کرنے کی سعی کی ہے۔ ان کی خودنوشت 'کارِ جہاں دراز ہے' میں بھی انھوں نے اس ہیئت کو اپنایا ہے۔ آپ بیتی کے میدان میں ناول نما ہیئت اور فلسفیانہ و اساطیری لب و لہجے میں اپنا فسانۂ زندگی پیش کر کے خودنوشت نگاری میں منفرد پیکر تراشی، ہیئتی تجربہ کاری اور جمالیاتی اسلوب کا مظاہرہ جن دیگر اہل قلم نے کیا ان میں 'آشرم' کے مصنف پروفیسر شکیل الرحمٰن کا نام بھی نمایاں ہے۔ انھوں نے اس آپ بیتی میں استعاراتی اور داستانوی طرز نگارش اختیار کیا ہے۔ علم نفسیات میں انسانی افکار و اعمال کو شعور سے زیادہ لاشعور کی پیداوار تسلیم کیا جاتا ہے جس میں ترتیب و تہذیب اور ربط و ضبط نہیں پایا جاتا۔ علم نفسیات اور جمالیات کے ماہر پروفیسر شکیل الرحمٰن نے شعوری طور پر اپنی خودنوشت 'آشرم' میں اس تکنیک کا ہیئتی نظریے سے تجربہ کیا ہے۔ موصوف کی آپ بیتی 'آشرم'، قرۃ العین حیدر کی آپ بیتی 'کارِ جہاں دراز ہے' اور ندا فاضلی کی آپ بیتی 'دیواروں کے بیچ' کا شمار ایسی ہی ادبی خودنوشت سوانحی کتب میں کیا جا سکتا ہے جو عام نہج سے ہٹ کر لکھی گئیں اور جن میں ہیئتی تجربات واضح طور پر نظر آتے ہیں۔

خودنوشت سوانح حیات 'آشرم' معروف ادیب و فنکار اور ماہرِ جمالیات پروفیسر شکیل الرحمٰن کی داستانِ حیات ہے جو 1992 میں موڈرن پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی نے شائع کی ہے۔ شکیل الرحمٰن نے پٹنہ یونیورسٹی سے بی اے کیا۔ وہیں سے انھوں نے فرسٹ ڈویژن سے ایم اے کیا اور پھر اسی یونیورسٹی سے انھیں ڈی لٹ کی ڈگری تفویض کی گئی۔ ان کی پہلے اڑیسہ کے ضلع بھدرک میں لیکچرر کے عہدے پر تقرری ہوئی۔ اُس کے بعد آگے چل کر وہ کشمیر یونیورسٹی میں اردو کے پروفیسر اور پھر صدر شعبہ کے عہدے پر فائز ہوئے۔ وہ بہار کی متھلا یونیورسٹی کے وائس چانسلر بھی مقرر ہوئے۔ سیاسی میدان میں بھی مرکز میں وزیر کے عہدے پر فائز رہ چکے ہیں۔

بقول حقانی القاسمی 'شکیل الرحمٰن ان نقادوں میں سے ہیں جنھوں نے تنقید کی نئی زمینوں کو دریافت کر کے ادب کو وسیع ترین آفاق عطا کیے۔ انھوں نے اردو کو جمالیات کی اُس لہر سے آشنا کیا جس کی بدولت اردو کو نئے افکار، اسالیب، تصورات اور تخیلات نصیب ہوئے۔' آشرم کو نہ صرف ایک فرد کی داستان حیات، ایک خانوادے کا افسانہ اور ایک دور کی ادبی و ثقافتی فضا کا مرقع کہا جاتا ہے بلکہ اس خودنوشت سوانح عمری کی حیثیت غیر جانبداری اور دیانتداری سے تحریر کردہ دستاویز کی ہے۔

یادداشت نما کتاب 'آشرم' کو اُن کی خودنوشت سوانح بھی تسلیم کیا جا سکتا ہے، اگرچہ کہ اس کا انداز بیان عام سوانحی ادب کے نہج سے ہٹ کر ہے۔ مصنف اس کتاب میں اپنے وجود کو اپنی ذات سے الگ کر کے واقعات بیان کرتے ہیں۔ پروفیسر شکیل الرحمٰن نے اس خودنوشت میں بنیادی طور پر 1956 تک کے سوانحی حالات و کوائف کا محاسبہ کیا ہے، جبکہ اس کی اشاعت 1992 میں ہوئی۔ یہاں انھوں نے روایتی انداز تحریر نہیں اپنایا ہے۔ حتیٰ کہ کتاب میں نہ تو کوئی پیش لفظ ہے، نہ ہی کوئی دیباچہ یا عرض حال، مگر انھوں نے کتاب کی ابتدا میں مختصراً 'انتساب' ضرور شاملِ حال رکھا ہے۔ شکیل الرحمٰن کے تخلیقی و جذباتی انداز بیان اور استعاراتی لب و لہجے کا احساس مندرجہ ذیل اقتباس سے بھی لگایا جا سکتا ہے جو اس کتاب کے بلرب میں شامل ہے۔ کتاب کے انتساب ہی میں وہ لکھتے ہیں:

''اکثر چپکے سے نکل جاتا، اس درخت کو دیکھنے، اپنے پیارے دوست سے باتیں کرنے کسی نہ کسی بہانے جاتا رہا، یہی دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی کہ آم کے اس خوبصورت درخت نے میرے نام کے پہلے حرف 'ش' کو اسی طرح سنبھالے رکھا ہے۔

پھر باغ اُجڑنے لگا، درخت کٹنے لگے
اور ایک دن جب اس باغ میں گیا تو کانپ کر رہ گیا
میرا دوست کٹ کر زمین پر گرا ہوا تھا
میرے نام کے پہلے حرف پر زمین کی مٹی لگی ہوئی تھی
بے اختیار رو پڑا
جانے وہ درخت کتنے دن اُسی طرح پڑا رہا
اور ایک دن جب اسے دیکھنے گیا تو دیکھا
اس کے کئی حصے کٹ کر الگ الگ ہو گئے تھے
اور مزدور بیل گاڑی میں رکھ کر انھیں لیے جا رہے تھے
مجھے اچانک
اپنی امی کا جنازہ یاد آ گیا!''

(آشرم، شکیل الرحمٰن، موڈرن پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، 1992، صفحہ آخر (بلرب))

ان کی اس خودنوشت سوانح حیات میں انھوں نے اپنے احباب اور اساتذہ سے متعلق باتیں لکھی ہیں۔ اس میں انھوں نے مہاتما گاندھی، راجندر پرشاد، ڈاکٹر سید محمود، فراق گورکھپوری، احتشام حسین، جمیل مظہری، اختر اورینوی، ساحر لدھیانوی وغیرہ کے بارے میں بھی لکھا ہے۔ انھوں نے یہاں اپنے ملازم سکھاڑی اور دھوبی شکور تک کے احوال بیان کیے ہیں۔ یہ کتاب نہ صرف ایک فرد کی سوانح حیات اور فلسفۂ زندگی کی کہانی بیان کرتی ہے بلکہ اس میں اپنے عہد کی ثقافتی و ادبی اقدار اور ماضی کی حکایات و اساطیری نوعیت کے حوالے کی آمیزش و عکاسی بھی کی ہے۔ یہ خودنوشت سوانح حیات ہیئت کے لحاظ سے بڑی منفرد اور مختلف ہے۔ ابتداً میں انھوں نے زندگی سے متعلق مختلف افکار و خیالات اور فلسفوں پر اپنے تاثرات، نکات اور نوٹس کی شکل میں درج کر دیے ہیں۔ یہ افکار و خیالات اور فلسفیانہ نکات خالص ہندوستانی اساطیر کی افہام و تفہیم کے ساتھ عہد حاضر میں اُن کے اطلاق کی راہیں ہموار کرتے ہیں۔ مثلاً وہ اس کتاب کے صفحہ پانچ پر اپنشد سے 'عدم' کا تصور اس طرح نقل کرتے ہیں:

''باپ نے بیٹے سے کہا
''اس درخت سے ایک پھل توڑ کر لا''
بیٹا پھل لے آیا
''اسے توڑ کر دیکھو اس میں کیا ہے''
''اس میں بیج ہیں''
''ایک بیج توڑ کر بتاؤ اندر کیا ہے؟''
''کچھ بھی نہیں''
''یہی کچھ نہیں، سب کچھ ہے، کچھ نہیں، بیج ہے، حقیقت ہے سچائی ہے، بنیادی جوہر ہے، اسی سے
اس درخت کا وجود قائم ہے''

(اپنشد)

(آشرم، شکیل الرحمٰن، موڈرن پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، 1992، ص 5)

پروفیسر شکیل الرحمٰن نے مختلف مذاہب اور فلسفوں کا خوب مطالعہ کیا ہے۔ وہ مختلف فنونِ لطیفہ سے گہری

واقفیت رکھتے تھے۔ انھوں نے مختلف فنون لطیفہ کے جمالیاتی پہلو سے تشریح وتفسیر پیش کی۔ نروان کے فلسفے کو انھوں نے اپنی ذات کے اندر ہی جینے اور مرنے سے جوڑ دیا ہے۔ مسلسل سوچ وچار کرتے رہنے کے باعث اُن کا بنیادی مزاج تنہائی پسند بن چکا تھا۔ تنہائی پسندی کا بنیادی سبب، بچپن ہی میں ان کے والدین کی رحلت بھی رہا ہے۔ تین چار برس کی عمر میں والدہ کا اور آٹھ برس کی عمر میں والد کا انتقال ہوگیا تھا۔ والدین کی شفقت وسرپرستی سے محرومی، دیگر اہل خاندان کے خلوص ومحبت سے پر نہیں ہوسکتی تھی۔ لہٰذا ان کی حساس مزاجی وتنہائی پسندی، تخیل پرستی وکم آمیزی میں تبدیل ہوگئی۔ وہ لکھتے ہیں:

''تین چار سال کی عمر تھی کہ اچانک اُس کی امّی کا انتقال ہوگیا تھا۔ کچھ ہی دن پہلے وہ سخت بیمار ہوا تھا اور اس کی امی نے اس کے سرہانے بیٹھ کر یہ دعا مانگی تھی۔ 'اللہ میرے بچے کو زندگی دے دے۔ اس کے لیے چاہے مجھے اُٹھالے۔ یہ بات اسے خالہ اماں نے سنائی تھی۔ ہوا بھی یہی، مرنے کے لیے وہ زندہ رہا اور اس کی امی اسے چھوڑ کر اچانک چلی گئیں۔ تب سے اپنی زندگی میں ایک عجیب طرح کا خلا محسوس کرتا ہے۔ اس عمر میں بھی جیسے وہ ممتا کے آنچل کی تلاش میں ہے۔ وہ بچہ جو یتیم ہوا تھا غالباً آج بھی اس کے وجود میں کہیں چھپا بیٹھا ہے، جو کبھی کبھی اسے بے حد بے چین اور مضطرب کر دیتا ہے۔ ابو کے گزر جانے کے بعد تو وہ بالکل تنہا ہوگیا۔ دونوں کی یادیں طرح طرح سے آنے لگیں۔ اکثر دونوں کو بہت قریب محسوس کرتا اور تنہائی میں ان سے باتیں کرتا۔'' (ایضاً، ص48)

والدین کی رحلت کا درد ان کی رگ و پے میں تا حیات کے لیے سرایت کر گیا تھا اور اُن کے لاشعور کا حصہ بن چکا تھا۔ اُن کا انداز بیان تمثیلی ہے جس میں خودکلامی کا عنصر غالب ہے۔ وہ آم اور ہارسنگھار کے درختوں، برف کی چوٹیوں اور موتی جھیل کے نظاروں، چڑیلوں، جنوں، تصوراتی گھوڑوں اور اپنے استاد کے رسید کردہ تھپڑ کے گہرے نقوش اپنے دل ودماغ میں محفوظ پاتے ہیں۔ وہ ملی جلی تہذیب کے پروردہ ہیں۔ اسلام کے بنیادی اصولوں میں ان کی عقیدت مندی اور ہندو دیومالائی واقعات وکرداروں کے لیے تجسس واحترام انھیں ورثے میں ملا تھا۔ ان کی اس خودنوشت کو بجا طور پر وجودیت کی نئی لہر قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس کو پڑھنے کے بعد قاری ایک خاص قسم کے ادھورے پن کی کیفیت کو محسوس کرسکتا ہے۔ اس خالی پن کے گہرے احساس و پرتاثیر اظہار سے ہی اس خودنوشت کی قدر و منزلت کا تعین ہوتا ہے۔

پروفیسر شکیل الرحمٰن نے اپنی اس خودنوشت میں زندگی کے حقائق کو اشاراتی واستعاراتی پیکر عطا کیے ہیں۔ وہ مناظر فطرت کو انسانی وجود کے ساتھ ہم آہنگ پاتے ہیں۔ جیسے درخت کو وہ اپنی والدہ کے ساتھ مشابہت عطا کرتے ہیں اور قدیم تاریخی و مذہبی کرداروں مثلاً گوتم بدھ سے حضرت نظام الدین اولیا، بلکہ عہد حاضر تک کے سلسلۂ حیات کو ایک مسلسل شعور کی رو میں پرونے کی سعی کرتے ہیں۔

اسی طرح پوری سوانح حیات میں وہ زندگی کے مشاہدات وتجربات کو بیان کرتے ہوئے اکثر وبیشتر اپنے آپ کو 'وہ' کہہ کر واقعہ بیان کرتے ہیں نا کہ 'میں' کہہ کر حقائق و حالات قلمبند کرتے ہیں۔ اس طرح انھوں نے اپنی روداد حیات صیغۂ واحد غائب میں پیش کی ہے۔ یہ وطیرہ' نثر نگاری آگے چل کر ندا فاضلی نے بھی اپنی خودنوشت سوانح عمری 'دیواروں کے بیچ' میں اپنایا ہے۔ 'آشرم' میں ہمیں استعاراتی اور داستانوی طرز تحریر کی جھلک بھی ملتی ہے۔ پیشکش میں انھوں نے ڈرامائی تکنیک کا استعمال بھی خوب کیا ہے۔ یہ آپ بیتی اُن کے تخیل کی بلند پروازی کا مظہر ہے۔ ان کی تحریر میں شاعرانہ حلاوت نمایاں نظر آتی ہے۔ وہ کہیں بھی اپنے معیار ومرتبے اور حسن بیان سے غافل نہیں ہوتے۔ زندگی کے تجربات و احساسات کو انھوں نے جمالیاتی تقلیب سے گزارنے کی کامیاب سعی کی ہے۔ ہر جگہ انھوں نے آپ بیتی کی مروجہ ہئیت کے بجائے جدت وندرت طرازی اختیار کی ہے جس کے باعث یہ خودنوشت جدیدیت کی تحریک اور ادب برائے فن کے نظریے کا عجیب وغریب تجربہ کہی جاسکتی ہے۔ وہ اس خودنوشت کو ترتیب دیتے وقت اپنی ڈائری سے بہت سی باتیں جوں کی توں درج کر دیتے ہیں مثلاً وہ تیس مارچ 1974 کو اپنی ڈائری میں یوں لکھتے ہیں۔

''میری زندگی میں جانے کتنے ایسے لمحے آئے ہیں
جن لمحوں میں
میں نے خود کو بے حد اجنبی پایا ہے
بھلا اُن کو میں نے
کب خلق کیا؟
ایسے لمحے کہاں سے آتے ہیں
جو مجھے اچانک
اجنبی بنا دیتے ہیں؟

(ڈائری، 30/3/74، مطبوعہ)''

(آشرم، شکیل الرحمٰن، موڈرن پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، 1992، ص 13)

ان کی پیدائش 18 فروری 1931 کو ہوئی تھی اور انتقال 9 مئی 2016 کو ہوا۔ اس طرح انھوں نے 85 برس کی عمر پائی تھی۔ دیکھیے وہ کیسے اپنے آپ کے لیے تھرڈ پرسن کے جیسا رویہ روا رکھتے ہیں:

''اسی مٹی پر اُس کا جنم ہوا تھا
18 تاریخ تھی، فروری کا مہینہ تھا... اور سال 1931 کا!
صبح پانچ بجے!...
'موتی ہاری' اُس کے شہر کا نام ہے، ریاست بہار کے شمال میں، ضلع 'چمپارن' نیپال کی سرحد ہے۔ کہا جاتا ہے گوتم بدھ جب کپل وستو سے چلے تو اس مقام پر بھی رکے، کسی نے انہیں چمپا کا زرد خوشبودار پھول پیش کیا اور پھر سارا علاقہ چمپا کے مہکتے ہوئے زرد پھولوں سے لد گیا۔ اسی سے اس کا نام ''چمپا۔رن'' ہوا۔
یعنی چمپا کے پھولوں کی خوشبوؤں سے بھرا جنگل!
اسی مٹی نے اُسے دنیا کو دیکھنے کے لیے آنکھیں بخشیں...'' (ایضاً، ص18)

انھوں نے اپنے وسیع مطالعے اور علم کے بحر بیکراں سے منتخبہ خیالات وافکار سے آپ بیتی کو آراستہ وپیراستہ کر کے اسے ایک جمالیاتی طرز نگارش عطا کیا ہے۔ وہ مُلک میں تین یونیورسٹیوں کے وائس چانسلر رہ چکے تھے۔ جمالیات کے موضوع پر انھوں نے کئی کتابیں لکھیں۔ 32 ابواب اور 275 صفحات پر مشتمل اُن کی اس خودنوشت سوانح حیات میں جدید قسم کی ناول نما فضا پائی جاتی ہے۔ اس کتاب کے مطالعے کے دوران، ہمیں شکیل الرحمٰن اپنے مستحکم عزم وپیہم سعی کی قوت سے زندگی کی تلخیوں اور آزمائشوں کا بڑی حوصلہ مندی سے مقابلہ کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

شکیل الرحمٰن کے والد ایک معروف وکیل تھے۔ آزادیٔ وطن کی تحریک اور ملک کے دیگر مسائل سے خاطر خواہ واقف تھے۔ ڈاکٹر راجندر پرساد، ڈاکٹر شیاما کانت ورما اور بابو گنیشن وغیرہ سے اُن کے گہرے روابط تھے۔ خود شکیل الرحمٰن نے قومی جلسوں میں شرکت کرنا شروع کر دیا تھا اور ملک کے اتحاد اور سالمیت پر ولولہ انگیز تقریریں کرنے لگے تھے۔ آزادی کے قبل اور بعد میں فرقہ وارانہ فسادات ہر طرف ہونے لگے۔ لیکن موتی ہاری میں لوگوں کی شعوری کوششوں کی بدولت کوئی فساد برپا نہیں ہوا۔ علاقے کے لوگ اور عزیز واقارب جب ہجرت کرنے لگے اور اُن سے بھی چلنے کے لیے مُصر ہوئے تو انھوں نے اپنے اقربا کی جدائی کا غم برداشت کیا لیکن ملک چھوڑنے سے قطعیت کے ساتھ منع کر دیا۔ فساد زدہ لوگوں کی مدد کی

قدیم ہندوستانی اساطیراور مذہبی و روحانی اقدار اور جمالیاتی اسلوب نگارش کے ساتھ اپنے ذاتی حالات و کوائف اور اپنے عہد کے سماجی و سیاسی افکار و اوصاف کوہم آہنگ کرنے کی دلچسپ سعی کی ہے۔ انھوں نے آلودگی، فحاشی اور مبالغہ آرائی سے مکمل طور پر اجتناب کیا ہے۔شاعرانہ لب و لہجہ، مفکرانہ نکات اور فلسفیانہ رموز کے باوجود شکیل الرحمٰن کی خودنوشت 'آشرم' کو اپنی مخصوص ہئیتی تجربہ کاری، شفافیت اور تاثیر جیسے اوصاف کی بدولت اردو ادب کی قابل قدر تخلیق تسلیم کیا جاتا ہے اور اس لحاظ سے بنیادی طور پر یہ خود نوشت، ادبی آپ بیتی میں شمار کی جاتی ہے۔

غرض سے انھوں نے رفیوجی کیمپوں میں ٹھہرے لوگوں کے امدادی کاموں میں اپنے آپ کو وقف کر دیا تھا۔ اس کتاب میں وہ اپنے والدِ محترم سے متعلق اس طرح لکھتے ہیں:

''٥۔۔ اس کے والد'' خان بہادر مولوی محمد خان'' کا شمار ریاست بہار کے معروف ترین وکیلوں میں ہوتا تھا، چھپرہ سے موتی ہاری آ بسے تھے، جب تک زندہ رہے، اپنے اقبال کی بلندی سے ہی پہچانے گئے۔صوفیانہ مزاج رکھتے تھے، آخری زمانے میں، انتقال سے کچھ عرصہ قبل، پھلواری شریف کے ایک معروف صوفی بزرگ کے مرید ہو گئے تھے... وہ ایک پُر وقار شخصیت کے مالک تھے، بڑی کشش تھی اُن کی شخصیت میں، لوگ اُن کی جانب بس کھنچے چلے آتے، کم گو تھے، اپنی روشن چمکتی ہوئی آنکھوں اور اپنی مسکراہٹوں سے بہت سی باتیں کہہ جاتے تھے...''

(آشرم، شکیل الرحمٰن، موڈرن پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، 1992، ص 31)

وہ خودنوشت کے نویں باب کی ابتدا ان الفاظ کے ساتھ کرتے ہیں:

''٥ اُس کے گھر کا ماحول صوفیانہ رہا ہے۔ اُس کے والد پھلواری شریف کی خانقاہ سے وابستہ ہو گئے تھے، گھر پر عابدوں، بزرگوں اور اللہ والوں کو آتے جاتے دیکھا کرتا، صوفی شعراءٗ کی کتابیں پڑھی جاتیں، سماع کی محفلیں ہوتیں، جانے کہاں کہاں سے قوال آتے اور حق و مغفرت کے نغمے سناتے، قوالی کی محفلیں بھی مقدس محفلوں جیسی ہوتیں...'' (ایضاً، ص 80)

خودنوشت میں اپنے وطن عزیز 'موتی ہاری' کے ثقافتی، ادبی اور سیاسی منظر نامے کی تصویریں جھلکتی ہیں۔ اِس میں انھوں نے وہاں کی معروف حویلی'' محمد جان منزل'' کی ثقافتی، ادبی و مذہبی سرگرمیوں کا ذکر کیا ہے۔ یہاں داستانِ امیر حمزہ اور طلسم ہوش ربا پڑھائی جاتی تھی۔ حویلی میں بچوں کے لیے تعلیم و تربیت کا، میلاد شریف کی محفلوں کا، محرم کی مجلسوں کا اور دیگر ادبی و علمی سرگرمیوں کا انعقاد ہوا کرتا تھا۔ اُنھوں نے یہاں کے مسلم گھرانوں میں خواتین کے مخصوص اعتقادات اور گھریلو زندگی کا بھی مفصل حال بیان کیا ہے۔ آپ بیتی کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے قدیم داستانوں کو خوب پڑھا تھا۔ ساتھ ہی انھوں نے مولانا شبلی نعمانی، مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا ابوالکلام آزاد کی جملہ تصانیف کا گہرائی سے مطالعہ بھی کیا تھا۔ موصوف نے کمیونسٹ ادب اور ترقی پسند تحریک کا بھی بھرپور جائزہ لیا تھا۔ وہ اپنی زندگی کے واقعات کو کہیں داستان امیر حمزہ سے ملاتے ہیں تو کہیں سند باد جہازی کے سفر سے جوڑ دیتے ہیں۔ تو کہیں وہ الف لیلہٗ کے مافوق الفطرت کرداروں سے اپنی زندگی اور جذبات کو وابستہ کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ اس طرح مصنف فینٹاسی اور حقیقت کو ایک دوسرے میں باہم پیوست کرنے کے ہنر سے اپنی واقفیت کا بھرپور مظاہرہ بھی کرتے ہیں۔ اس بنا پر ان تحریروں میں پُر اسراریت کا سا ماحول اور داستانوی فضا جھلکتی ہے۔

پروفیسر شکیل الرحمٰن کی خودنوشت 'آشرم' میں بے ساختگی کا فقدان ہے۔ اُن کے وقیع افکار و خیالات کا پلڑا کتاب میں پیش کردہ زندگی کے سانحات اور حقائق پر بھاری پڑتا ہے۔ لیکن یہی وصف اُن کی آپ بیتی کو منفرد ادبی مقام و مرتبہ بھی عطا کرتا ہے۔ یہاں بچپن سے لڑکپن اور جوانی سے لے کر ساٹھ سال کی عمر تک کے واقعات ہی کا انھوں نے احاطہ کیا ہے۔ اس طرح مصنف نے بنیادی طور پر اس میں 1954 تک کے ادوار زندگی کو شامل تحریر کیا ہے۔ یعنی مصنف کی باقی زندگی کے طویل حصے کو جاننے کے لیے مزید ایک اور خودنوشت لکھی جانی چاہیے تھی۔ اس لحاظ سے اسے ایک نامکمل خودنوشت سوانح حیات مانا جا سکتا ہے۔

مختصراً یہ کہ پروفیسر شکیل الرحمٰن کی خودنوشت سوانح حیات 'آشرم' اپنی نوعیت کی ایک منفرد آپ بیتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ اُنھیں اپنی زندگی کی کہانی میں کوئی غیر معمولی بات محسوس نہیں ہوئی۔ یہ بات محض اُن کی فطرت کی انکساری کا پتہ دیتی ہے، جبکہ حقیقت یہ ہے کہ موصوف نے نہایت کامیاب و کامران زندگی گزاری اور تعلیم کے اعلیٰ ترین عہدوں پر بھی فائز رہے اور سیاسی میدان میں بھی مرکزی حکومت میں وزارت کے عہدے پر مامور رہے۔ اب تک اُن کی جمالیات، ادب، فنون لطیفہ، رقص و موسیقی وغیرہ جیسے موضوعات پر کم و بیش چالیس دقیق و عمیق اور بڑی معیاری کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں، جن میں 'ہندوستان کا نظام جمال، امیر خسرو کی جمالیات، مولانا رومی کی جمالیات، غالب کی جمالیات، منٹو شناسی، مرزا غالب اور ہند مغل جمالیات، فکشن کے فنکار پریم چند، ہمزاد، اختر الایمان: جمالیاتی لیجنڈ، بے نام سمندر کا سفر اور ابوالکلام آزاد' نہایت مقبول ہوئیں۔ وہ ایک سنجیدہ طبع اور پُر تکلف شخصیت کے حامل تھے۔ انھوں نے اس خودنوشت میں اکثر و بیشتر مقامات پر اپنی ڈائری کے علاوہ تحریر شدہ یادداشتی نوٹس سے بھی خوب کام لیا ہے۔ اس وجہ سے اس خودنوشت سوانحی کتاب میں ایک خاص قسم کا ربط و تسلسل محسوس کیا جا سکتا ہے۔ انھوں نے اپنی زندگی کے سانحات و واقعات کو کوئی خاص اہمیت نہیں دی بلکہ اپنی سعی پیہم، جذبات و احساسات کے فنکارانہ اظہار اور اساطیری انداز بیان ہی کو مرکز و محور بنایا۔ اسی لیے وہ اپنے آپ کو استعاراتی لہجے میں سند باد جہازی کہہ کر بھی مخاطب کرتے ہیں۔ اس میں انھوں نے جا بجا تشبیہات و استعارات کا موثر استعمال کیا ہے۔ انھوں نے اپنی زندگی کی کہانی بیک وقت جدیدیت و ماورائیت کی آمیزش کے ساتھ پیش کی ہے۔ قدیم ہندوستانی اساطیر اور مذہبی و روحانی اقدار اور جمالیاتی اسلوب نگارش کے ساتھ اپنے ذاتی حالات و کوائف اور اپنے عہد کے سماجی و سیاسی افکار و اوصاف کو ہم آہنگ کرنے کی دلچسپ سعی کی ہے۔ انھوں نے آلودگی، فحاشی اور مبالغہ آرائی سے مکمل طور پر اجتناب کیا ہے۔ شاعرانہ لب و لہجہ، مفکرانہ نکات اور فلسفیانہ رموز کے باوجود شکیل الرحمٰن کی خودنوشت 'آشرم' کو اپنی مخصوص ہئیتی تجربہ کاری، شفافیت اور تاثیر جیسے اوصاف کی بدولت اردو ادب کی قابل قدر تخلیق تسلیم کیا جاتا ہے اور اس لحاظ سے بنیادی طور پر یہ خودنوشت، ادبی آپ بیتی میں شمار کی جاتی ہے۔

حوالہ جاتی کتب

1. آشرم، شکیل الرحمٰن، موڈرن پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، 1992
2. اردو میں خودنوشت سوانح حیات، ڈاکٹر صبیحہ انور، نامی پریس لکھنؤ، 1982
3. دستاویز (کتابی سلسلہ 4)، دوحہ/دہلی، 2016
4. انداز بیاں (ایک موضوعی مجلہ)، مدیر: حقانی القاسمی، عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی، 2016

■

Syed Wajahat Mazhar
T-116/1,2nd Floor
Main Market, Okhla Village
New Delhi-110025
Mob.: 7217718943

علی جواد زیدی اور تعمیری ادب

عبداللہ اسلم

علی جواد زیدی صاحب ترقی پسند تحریک کے پرزور مبلغ تھے۔تحریک کے قیام کے ساتھ ہی اس سے نظریاتی وابستگی قائم کی اور عملی طور پر کچھ سالوں تک اس تحریک کا حصہ رہے اور اپنی شاعری کے ذریعے تحریک کے مشن کی نمائندگی کرتے رہے،لیکن دوسری جنگ عظیم کے دوران تحریک کی شدت پسندی نے زیدی صاحب کو بددل کر دیا۔نتیجتاً انھوں نے اپنی ایک آزاد اور خودمختار راہ اختیار کی، جسے بعد میں تعمیری ادب کے نام سے موسوم کیا گیا۔

زیدی صاحب کو ترقی پسند تحریک کے فلسفے اور اس کے نقطۂ نظر سے کوئی اختلاف نہ تھا اور نہ ہی وہ تحریک کے فلسفیانہ سماجی مشن سے دور رہے۔دراصل ان کا اختلاف تحریک کے ان نمائندوں سے تھا جو تحریک کو نام نہاد اور من مانے اصولوں سے محصور کر دینا چاہتے تھے،جس سے ترقی پسندی کی بنیادی فکر ہی مجروح ہو رہی تھی۔ترقی پسند تحریک سے ان کا اختلاف اس وقت رونما ہوا جب ترقی پسندوں نے ادب پر کڑی شرائط عائد کر دیں،یعنی ہر وہ ادب جو روس اور اس کے جنگی حلیفوں کی کارروائیوں سے متصادم ہوتا اسے غیر ترقی پسند ٹھہرایا جاتا۔تحریک کے ادبی علمبرداروں کا یہ رویہ ادبی آزادی اور ترقی پسندی کی روح کے خلاف تھا۔ اسی نقطے کی بنیاد پر زیدی صاحب نے تحریک سے دوری بنائی اور صحیح ترقی پسندی کا پرچار تعمیری نقطۂ نظر کے تحت کرنے لگے۔

تعمیری ادب کوئی آزاد اور قائم بالذات فلسفہ نہیں بلکہ اس کی نظریاتی بنیادیں ترقی پسند فلسفے ہی سے فراہم کی گئی ہیں، بلکہ بالواسطہ طور پر تعمیری ادب کا نظریہ فلسفہ مارکسزم کا خوشہ چیں ہے۔تعمیری ادب دراصل فلسفۂ ترقی پسندی کو انفرادی نقطۂ نظر سے پیش کرنے کا ایک رجحان ہے،جس کو ایک آزاد فلسفۂ ادب کی حیثیت نہ مل سکتی تھی اور نہ مل سکتی ہے۔

تعمیری ادب کے نقطۂ نظر کو بہتر طور پر سمجھنے کے لیے ترقی پسند تحریک کے فلسفے اور تحریک کے اغراض ومقاصد سے پوری آگہی ضروری ہے۔ترقی پسند تحریک دراصل ایک عالمی تحریک تھی۔اس فلسفے کے مطابق دنیا کی ساری پریشانیاں اور خوشحالیاں دولت کی تقسیم پر منحصر ہیں۔ جب تک دنیا میں دولت کی تقسیم منصفانہ طریقے سے نہ کی جائے گی تب تک نہ تو دنیا کی پریشانیاں ختم ہوں گی اور نہ ہی امن وامان اور انصاف قائم ہوگا۔ترقی پسند فلسفہ دیکھتے ہی دیکھتے دنیا کے ایک بڑے حصے میں پھیل گیا۔ ہندوستان میں بھی اس کا پرجوش استقبال کیا گیا۔ ہندوستان کے نوجوان ادیبوں اور شاعروں نے اس فلسفے کی ادبی نمائندگی کو اپنا فرض سمجھا اور تحریک کے سماجی مشن کی بھرپور تبلیغ کی۔

ترقی پسند تحریک کے دور عروج میں ہی انفرادی اختلاف شروع ہو گئے تھے،لیکن تقسیم ہند کے بعد نظریاتی اختلافات اور بڑھ گئے۔اس کی وجہ صرف تحریک کی شدت پسندی نہ تھی بلکہ تقسیم ہند کے بعد کی سیاسی اور سماجی صورت حال بھی تھی۔تعمیری ادب کے نقطۂ نظر کو سمجھنے کے لیے آزادیٔ ہند کے وقت بنتے بگڑتے حالات کو سمجھنے کی ضرورت ہے جس نے اس وقت کے ادیبوں اور ادبی رجحانوں پر گہرے اثرات ڈالے،جس وقت ترقی پسند تحریک کی بنیاد پڑی اس وقت کے سیاسی اور سماجی حالات کچھ اور تھے اور تقسیم کے بعد یہ یکسر بدل گئے۔ان بدلے ہوئے حالات میں ترقی پسند تحریک کی نظریاتی کامیابی مشکل ہو گئی۔ یہ ضرور ہے کہ اس مختصر عرصے میں تحریک نے فکروفن میں بڑی تبدیلیاں کیں اور ادب میں نئی طرح کی بحثیں شروع ہو گئیں۔زیدی صاحب نے تعمیر پسندی کا نعرہ بدلے ہوئے حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے دیا۔ان کا ماننا تھا کہ بدلے ہوئے حالات میں ترقی پسندی کے معنی بھی بدل گئے۔ایسے میں ادب اور ادیبوں کی ذمے داریوں کی نوعیت بھی بدل گئی۔

دراصل جنگ عظیم دوئم کے بعد بھاری تباہی کی وجہ سے انقلابی ولولوں کو گہری ٹھیس لگی تھی۔ اس عالمی جنگ نے انقلاب کی عوامی خواہشوں کو سرد کیا تھا اور پھر جنگ عظیم کے کچھ سالوں بعد تقسیم ہند کے واقعات نے ملکی پیمانے پر جو افراتفری پھیلائی اس نے باشعور انسان کو گہری نفسیاتی کشمکش میں مبتلا کر دیا۔جو کچھ بھی ہوا وہ ترقی پسند تحریک کی منشا کے خلاف تھا اس لیے ترقی پسندوں نے آزادی اور تقسیم سے یکسر اختلاف کیا۔اسی اختلاف سے زیدی صاحب کو اختلاف تھا۔ان کا ماننا تھا کہ ترقی پسندی کا مطلب عوامی فلاح و بہبود ہے۔ اگر قومی سیاست اہل ہند خصوصاً غریبوں اور مظلوموں کی آرزوؤں کی ترجمانی کر سکے تو کسی آئیڈیل سیاسی نظام کی ضرورت کوئی خاص معنی نہیں رکھتی۔اگر ادیب وشاعر قومی ترقی کی نمائندگی کرتے ہیں تو اسے ترقی پسندی ہی سمجھا جائے۔ایسے حالات میں جبکہ پوری انسانیت انسانی تباہی کے بھیانک منظر سے اوپر اٹھ رہی ہے اس کو پھر سے ایک انقلاب کی دعوت دینا اور ملکی ترقی کو منفی طریقے سے پیش کرنا دراصل ترقی پسندی کے عین مخالف ہے۔

دراصل زیدی صاحب نے ترقی پسندی کی نئی تشریح کی ہے ان کے مطابق ترقی پسندی کا مفہوم الگ الگ زمانے میں مختلف ہو سکتے ہیں۔ انھوں نے نہ تو کبھی ترقی پسندی کی مخالفت کی اور نہ ہی تحریک کو تنگ محاذ بنانے کی کوئی کوشش کی۔ اس کے برخلاف انھوں نے ہمیشہ ایک صالح اور ترقی پسند معاشرے کی وکالت کی۔ لکھتے ہیں:

''گویا تعمیری ادب کے نعرہ کا مقصد صرف اتنا تھا کہ ترقی پسندی کا نیا پہلو زیادہ اجاگر کر دیا جائے اور ادب کو موجودہ زندگی کا صحیح طور پر آئینہ دار بنانے کی کوشش کی جائے مجھے خوشی ہے کہ اس نعرہ کا خاطر خواہ نتیجہ برآمد ہوا اور اس کا اثر ہمارے ادب میں با قاعدہ طور پر محسوس کیا جانے لگا''

(تعمیری ادب، علی جواد زیدی، ادارہ انیس اردو الہ آباد 1959، ص 12)

ترقی پسند تحریک ایک انقلابی فلسفے کا شاخسانہ تھی جس میں ادب کا مطالعہ اور اس کی تفہیم ایک وسیع سیاسی سماجی اور معاشی پس منظر میں کرنے کی کوشش کی گئی۔ جیسے ادب کیا ہے؟ اس کی غرض وغایت، سماج سے اس کے تعلقات، ادیب کی سماجی اور اخلاقی ذمہ داریاں وغیرہ۔ زیدی صاحب نے اس طرح کی نظریاتی بحثوں پر کھل کر اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔ ان کی انفرادی رائے کم وبیش ترقی پسند نظریات سے مماثل ہے۔ اس طرح کی ساری نظریاتی بحثیں زیدی صاحب نے اپنی کتاب 'تعمیری ادب' (مجموعہ مضامین) میں اکٹھا کر دی ہیں، اس کتاب کے دوسرے مضمون 'تعمیری ادب' میں ادب کو مروجہ اور روایتی نقطۂ نظر کے تناظر میں رکھ کر تفصیلی گفتگو کی گئی ہے۔ مضمون کی ابتدا میں تعمیری ادب کے نقطۂ نظر کو سمجھنے سے پہلے ادب کے عمومی نقطۂ نظر کو سمجھنے کی ضرورت پر زور دیا گیا ہے اور اپنی بات کی تفہیم وترسیل کے لیے معتبر نقادوں خصوصا احتشام حسین اور آل احمد سرور کی تحریروں کا حوالہ بھی دیا گیا ہے۔ سب سے پہلے وہ گفتگو کرتے ہیں کہ ادب کیا ہے؟ اس کا وجود کیوں کر ہوا؟ اس کی تعریف کیا ہے؟ زیدی صاحب کا ماننا ہے کہ ادب کا وجود تہذیبی وجود کے مماثل ہے۔ زیدی صاحب کے مطابق جیسے تہذیب کے اور مظاہر اجتماعی کوششوں سے وجود میں آئے ہیں ویسے ہی بہت سا قدیم ادب بھی اجتماعی کوششوں سے وجود میں آیا ہے لیکن تحریر کی ایجاد نے اس کی نوعیت بدل دی۔ لوک گیت، لوک کتھائیں، ضرب الامثال، سماجی چٹکلے، مذہبی گیت، کہاوتیں، اپنی جگہ پر رہیں لیکن اب منظر سماج سے ہٹ کر کسی حد تک فرد کی جانب منتقل ہو گیا ہے۔ فرد اور ادب کے تعلق پر وہ کہتے ہیں ادب پر سماجی اثرات کی طرح افراد کی چھاپ بھی ہوتی ہے۔

ترقی پسند نظریے کی طرح تعمیر پسندی میں بھی ادب کے سماجی اور افادی پہلو پر زور دیا گیا ہے۔ ادب میں فکر وفن کی بحث بھی بہت سنجیدہ ہے۔ ادب کی روایتی تعریف میں عموماً فن وفکر کے بہترین امتزاج کو اچھا ادب مانا جاتا رہا ہے لیکن اس بہترین امتزاج کی تعریف دوٹوک لفظوں میں نہیں کی جا سکتی، کیونکہ ادب کوئی سائنسی چیز نہیں۔ ترقی پسندی کی طرح تعمیری ادب بھی ادب کے افادی پہلو اور اس کی سماجی حیثیت پر کافی زور دیتا ہے۔ جب ادب کی سماجی حیثیت پر بات ہوگی تو ادبی مواد اور اس کی ترسیل (پروپیگنڈا) کی بات بھی ضمناً ضرور آئے گی۔ ذیل کی عبارتوں سے زیدی صاحب کا نقطۂ نظر واضح ہو جائے گا۔

''فکر وفن کے اعتبار سے ہر ادب چند سیاسی، اقتصادی، سماجی اور جمالیاتی رجحانات کا حامل ضرور ہوگا، انھیں رجحانات سے اس کی افادیت مشخص ہوگی.......... ہر ادب کا مقصد ہوگا اور ادب کی افادیت یہی ہے کہ وہ حصول مقصد میں کامیاب ہو''

''کیا ادب کی افادیت کا مفہوم صرف پروپیگنڈا ہے۔ پروپیگنڈا سے مراد اگر وہ نشر واشاعت خیالات ہے جو اصلاح وتغیر کے مقصد سے کی جاتی ہے تو ادب کی افادیت کے مفہوم اور پروپیگنڈا میں کوئی فرق نہیں ہے''

(تعمیری ادب، علی جواد زیدی: ادارہ انیس اردو: الہ آباد 1959، ص 26،27،29،30)

جس طرح ترقی پسند تنقید ادب کو افادی نقطۂ نظر سے دیکھنے کی کوشش کرتی ہے بالکل اسی طرح تعمیر پسندی بھی۔ تنقید میں جن اقدار کی ناپ تول کی بات زیدی صاحب کرتے ہیں، دراصل یہی اقدار ترقی پسند تنقید کے بھی ہیں۔ ترقی پسندی کی طرح تعمیری ادب بھی زندگی کو معاشرتی و طبقاتی روابط کے ساتھ متحرک اور تغیر پذیر دیکھنا چاہتا ہے اور تنقید کو بھی ادب کی طرح سماجی مقاصد کے حصول کے لیے ایک آلۂ کار کے طور پر استعمال کرنا چاہتا ہے:

''عام ادب کی طرح تنقید بھی ایک موثر آلہ ہے اور پروپیگنڈا کے نقطۂ نظر سے دیگر اصناف ادب کے مقابلے میں زود اثر بھی ہے۔ تنقید اصل تصنیف کو ناظرین کے سامنے پیش ہی نہیں کرتی بلکہ اس پر ایک رائے دیتی ہے اور دوسروں کو متاثر کرنے کی غرض سے رائے دیتی ہے۔

(تعمیری ادب، علی جواد زیدی، ص 32)

ادب اور نظریے پر معقول اور مفصل بحث کا آغاز بھی ترقی پسندی کے زمانے سے ہوا۔ اردو میں پہلی بار روایت سے بغاوت کا اتنا سخت رجحان آیا تھا۔ ادب میں نظریے کے مدعین اور مخالفین کے مابین جو بحثیں اس وقت شروع ہوئی تھیں آج بھی وہ کسی انجام پر نہیں پہنچ سکی ہیں۔ ترقی پسند تحریک کی ناکامی کی بڑی وجہ ادب میں نظریے کی مبالغہ آرائی ہی کو بتایا جاتا ہے۔ ادب اور فن بڑی نازک چیزیں ہیں۔ اس میں ذرا سی بے احتیاطی مسائل کو افراط و تفریط سے دوچار کر سکتی ہے۔ زیدی صاحب کو ان نزاکتوں کا احساس تھا۔ وہ ادب کے افادی پہلو پر اصرار کے باوجود ادب وتنقید میں اپنی آرا کو متوازن بنائے رکھنے کی کوشش کرتے ہیں، اس لیے وہ سرور کی اس عارفانہ بات کا حوالہ دیتے ہیں جس میں وہ آل احمد تنقید کو تمام تر عقلی ہونے سے بچانے اور آداب عشق کو ملحوظ رکھنے کی بات کرتے ہیں۔ زیدی صاحب اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ ان تمام الزامات سے تعمیری ادب کو بچایا جائے جو ترقی پسند تحریک پر عائد ہوئے۔ وہ ادب کو ذاتی ملکیت بنانے کے بھی خلاف ہیں:

''ادیب کی نظر میں وسعت اور جامعیت ضرور ہونی چاہیے۔ ادبی دائرہ کو محدود کر دینا، ادب پاروں کو کسی مخصوص گروہ کے لیے وقف کر دینا یا اس کو انفرادی خواہشات کے تابع بنا دینا ادب کو جیتے جی مردہ بنا دینا ہے۔ ادب کا تعمیری رجحان یہی ہے اور ہمیشہ سے رہا ہے کہ ادب کو محدود ہونے سے بچایا جائے اور اس کو نئے حالات سے دوچار ہونے کے قابل بنایا جائے۔ یہ تعمیری رجحانات آج نہیں بلکہ ہمیشہ ہر دور میں، ہر ملک میں اور ہر زبان میں رونما ہوتے رہے ہیں۔''

(تعمیری ادب، علی جواد زیدی، ص 34)

تعمیری نقطۂ نظر کے پیچھے ایک ملکی اور قومی تصور بھی تھا اور شاید اسی وجہ سے زیدی صاحب ترقی پسند تحریک سے پوری طرح الگ ہو گئے۔ ایسا نہیں کہ ملکی اور قومی حد بندیوں

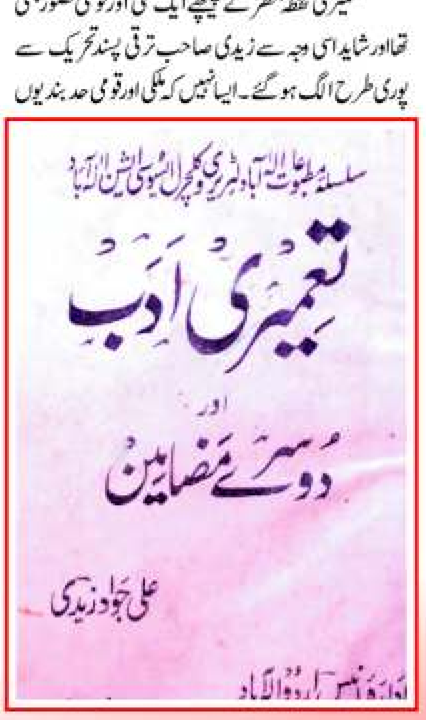

میں انسانی تقسیم کو وہ ضروری بھی مانتے ہوں۔ وہ ہندوستان کی سطح پر ملکی آزادی اور قومی سیاست کے بہت بڑے علمبردار تھے بلکہ ان کی ادبی اور سیاسی زندگی آزادی کے جذبات سے ہی شروع ہوئی۔ ان کی ابتدائی شاعری میں آزادی اور قومیت کے عناصر بھرے پڑے ہیں، لیکن جذبات قومی ان کے کلام میں تعصب کی بو نہیں بھر پاتے۔ تعمیری ادب کا نقطۂ نظر خاص قومی اور ملکی پہلو لیے ہوئے ہے لیکن یہ نقطۂ نظر اقدار انسانی کی انھیں قدروں کا حامل ہے جسے ترقی پسندی بین الاقوامی انسانیت کی میراث مانتی ہے۔ زیدی صاحب نے اپنی شاعری میں انھیں اقدار کی نمائندگی کی ہے جو بیک وقت قومی بھی ہے اور آفاقی بھی۔

ترقی پسند شاعری میں غزلوں سے زیادہ نظموں پر زور دیا گیا ہے۔ زیدی صاحب نے بھی بدلے حالات میں غزل کی تنگ دامانی کا شکوہ کیا ہے۔ بدلے ہوئے سیاسی اور معاشرتی حالات میں غزل کی فضیلت پر اصرار نہ کرنے کی صلاح دی ہے، جبکہ خود انھوں نے کثرت سے غزلیں کہی ہیں جن میں اپنے نقطۂ نظر کی نمائندگی کے علاوہ روایتی مضامین میں بھی اچھے اشعار کہے ہیں، لیکن شعری ضرورت کے تحت یا قومی ضرورت کے تحت نظم نگاری کو ترجیح دیتے ہیں بلکہ نظمیہ شاعری کی وکالت اور حوصلہ افزائی بھی کرتے ہیں۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ ان ہنگامی حالات میں غزل گوئی کے مقابلے نظم نگاری قدرے آسان تھی۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ اس زمانے میں عموماً ہر روایتی شے سے اعراض کرنے کی کوشش کی گئی۔ انقلابی خیالات نے جدت پسندی کی تبلیغ کی، اس لیے اکثر شاعروں نے شعوری طور پر غزلوں سے بے زاری برتی لیکن اس کے باوجود بھی غزل کبھی شجرِ ممنوعہ کے مرحلے میں نہ داخل ہو سکی، خود زیدی صاحب بڑے کامیاب طریقے سے غزلوں میں اپنے مافی الضمیر کی ادائیگی کرتے ہیں۔

مسکراتے ہوئے الفاظ کی تہ تک جاؤ
میرے اشعار میں ہے شورش ایام کی بات
شکستہ لاکھ تھی کشتی ہزار تھا طوفاں
کسی خیال کا دامن تو تھام لینا تھا
اک کرن پھوٹے گی اک شوخ ہوا سنکے گی
اسی امید میں جاگے ہیں سحر ہونے تک
تہ بہ تہ راز ہے کتاب حیات
ہر ورق کو پلٹ رہا ہوں میں
فیضِ جنوں سے خود ہی آپ انجمن ہوئے
تنہا رہا کیے تھے جو ہر انجمن میں ہم
گر نہ ہو فکر میں جہاں گیری
ذہن اک کاسۂ گدائی ہے

غزل کے فنی مطالبات اکثر آزادانہ اظہار خیال میں حارج ہوتے ہیں۔ لہٰذا غزلوں کے بالمقابل نظموں میں زیدی صاحب نے فن اور تعمیری نظریے دونوں کا مظاہرہ بہتر طریقے سے کیا ہے۔ صنف غزل اپنے آپ میں ایک مشکل فن ہے۔ زیدی صاحب نے 'نسیم دشت آرزو' کے مقدمے میں یہ اعتراف کیا ہے کہ انھوں نے اپنی ابتدائی غزلوں کو نذر آتش کر دیا تھا۔ اس لیے ان کے پہلے مجموعے 'رگ سنگ' میں صرف نظمیں ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ ان غزلوں کے مضامین روایتی اور رومانوی قسم کے رہے ہوں اور ان کی انقلابی پہچان کے سامنے یہ غزلیں بے ربط معلوم ہوتی ہوں یا ابتدائی کوششیں ہونے کے باعث فنی لحاظ سے کمزور معلوم ہوتی ہوں، لیکن نظم ان کے تعمیری مشن کے بالکل مناسب تھی۔ انھوں نے اس میں اپنے خیالات ونظریات کا اظہار آزادی کے ساتھ کیا ہے۔ ابتدائی نظموں میں ترقی پسند تحریک سے وابستگی کے باعث انقلابی اور جذباتی باتیں زیادہ ہیں بلکہ رومان اور انقلاب کے مابین کشمکش بھی ہے۔

1942 کی تحریک کے وقت ملکی اور بین الاقوامی سطح پر جو حالات برپا تھے، اس نے ادیبوں اور شاعروں سے بہت کچھ لکھوایا۔ 1942 سے زیدی صاحب کے فن اور رجحان میں کافی تبدیلیاں آئیں۔ ان کی اس وقت کی نظموں میں نہ صرف قومی مزاج کی ترجمانی ہے بلکہ قومی مزاج سازی کی کوشش بھی ہے۔ یہیں سے انھوں نے اپنے قومی خیالات اور سیاسی رجحانات کو ایک مستحکم سمت دینے کی کوشش کی۔ کیونکہ ان حالات نے سیاست کی بڑھتی ہوئی کشمکش اور ان کے خطرناک نتائج سے آگہی کا اشارہ بھی کیا اور ملکی سطح بھی سامراجی طاقتوں سے نجات حاصل کرنے، آزادی اور جمہوریت کے حصول کی خاطر ایک بے چینی بھی پیدا کی۔ 'اندیشہ ہائے دور دراز' اور 'ہولی' جیسی نظمیں اسی عہد میں لکھی گئیں۔ ملاحظہ ہو۔

ہاں یہیں عہد وفا ٹوٹ چکے ہیں اکثر
انھیں دیواروں سے سر پھوٹ چکے ہیں اکثر
اجنبی دوست ہمیں لوٹ چکے ہیں اکثر
دل میں جاگے ہوئے شبہات سے بے چین نگاہ
اجنبی قدموں کی آواز سے فطری اکراہ
اپنی خاموشی... مجبور یہ احساس گناہ

(نظم اندیشہ ہائے دور دراز)

اس وقت اس میخانے میں ساماں ہوں گے دوسرے
تیرے پرانے ذہن کے معیار توڑے جائیں گے
تعمیر نو کی جائے گی

لیکن ہمارے سال خوردہ، مہرباں، پیر مغاں!
تجھ کو برا لگتا ہے کیوں؟
غیروں کا کیا، تیرا بھی کیا
یہ میکدہ ہم سب کا ہے پنچایتی
تو کیا ہے، تیرا خوف کیا؟
کہہ تو دیا پیر مغاں! کل پھر پلٹ کر آئیں گے
ہرگز نہ ہم باز آئیں گے!

(نظم ہولی)

زیدی صاحب نے قومی تعمیر کے لیے ہر طرح سے فضا سازگار کرنے کی کوشش کی۔ جنگ آزادی کی پوری تحریک میں گاندھی جی کی شخصیت بہت اہم ہے، اس لیے تاریخ آزادیٔ ہند میں ان کا نام سر فہرست ہے۔ زیدی صاحب نے نہ صرف اپنے سماجی سیاسی اور معاشی نظریات کی تبلیغ کی بلکہ ایسی شخصیات پر نظمیں بھی لکھی ہیں جو اس پورے قومی تصور اور تعمیری رجحانات کو بڑھاوا دے سکے۔ آزادی کے بعد ہندو مسلم اتحاد کو ایک نئے سرے سے مستحکم کرنے محبت واتفاق کی فضا ہموار کرنے کی ضرورت تھی۔ زیدی صاحب نے گاندھی جی کی شخصیت سے اسی نقطۂ نظر سے گہری عقیدت پیش کی۔ ''شمع امن'' کے نام سے ایک نظم میں گاندھی جی کی کرشماتی شخصیت، ان کے قومی کردار اور ان کی قربانیوں کو یاد کیا ہے۔

مولانا ابو الکلام آزاد پر ان کا طویل مقالہ 'کمال ابو الکلام' بھی اسی تعمیری نقطۂ نظر کے تحت لکھا گیا ہے۔ مولانا آزاد نے متحدہ ہندوستان کے حق میں اپنی ساری سیاسی اور سماجی کوششوں کو صرف کیا لیکن بدقسمتی سے ان کی یہ کوششیں رائیگاں ہو گئیں، لیکن ایک قومی ہیرو کی طرح آزاد کی شخصیت تاریخ میں یاد رکھی جائے گی۔ مولانا آزاد کی شخصیت ایک ادبی شان اور پہچان بھی رکھتی ہے، اس لیے تعمیری ادب کے نقطۂ نظر سے مولانا ادبی حلقوں میں مثبت سوچ کی ترویج واشاعت میں معاون ہو سکتے ہیں۔

زیدی صاحب کا یہ نظریہ دراصل مقامی اور قومی حیثیت رکھتا ہے جسے ترقی پسند نظریہ کے مقابل رکھ کر نہیں دیکھا جا سکتا۔ دراصل یہ نقطۂ نظر ان کے ذہن کی اپج تھی، جسے وقتی طور پر حمایت بھی حاصل رہی لیکن کسی ٹھوس بنیادی فلسفیانہ تصور کے بغیر اس نقطہ نظر کا کوئی مستقبل نہیں ہو سکتا تھا۔

■

Abdullah Aslam
Room No:148(Old)
Brahamputra Hostel
JNU, New Delhi- 110067
Mob: 9968616464

ارشاد قمر

اردو میں ادبی تاریخ نگاری

ایک جائزہ

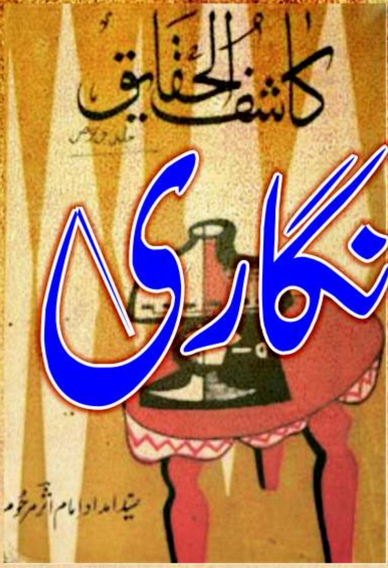

ادبی تاریخ وہ آئینہ ہے، جس میں ہم زبان اور اس کے بولنے اور لکھنے والوں کی اجتماعی و تہذیبی روح کا عکس دیکھ سکتے ہیں۔ ادب میں منجملہ فکری، تہذیبی، سیاسی، معاشرتی اور لسانی عوامل ایک دوسرے میں پیوست ہو کر ایک وحدت کی شکل میں نمودار ہوتے ہیں اور ادبی تاریخ ان سارے اثرات، روایات، محرکات اور خیالات و رجحانات کا آئینہ ہوتی ہے۔ نیز ادبی تاریخ ایک ایسی یونٹ (اکائی) ہے جسے ٹکڑے ٹکڑے کر کے نہیں دیکھا جا سکتا جس طرح جدید ادب کو سمجھنے کے لیے قدیم ادب کا سمجھنا ضروری ہے۔ اس طرح ادبی تاریخ ادب اور سماج دونوں کو مکمل یونٹ کی شکل میں دیکھتی ہے۔ ادب سماج کی تخلیق اور ادب پر سماج کے اثرات دونوں کے ربط و تعلق سے بحث کرتا ہے۔ عربی و فارسی میں، جن سے اردو کی بیش تر کلاسیکی شعری و نثری اصناف مستعار و ماخوذ ہیں۔ ادبی تاریخ نگاری سے پہلے تذکرہ نگاری کا رواج تھا۔ ٹھیک اسی طرح اردو میں بھی ادبی تاریخ نگاری سے پہلے تذکرہ نگاری کا ہی چلن تھا۔ چنانچہ عربی و فارسی کی طرح اردو میں بھی ادبی تاریخ نگاری کا رواج بعد میں شروع ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ اردو شعر و ادب کی دنیا میں تذکرے تاریخوں کے پیش رو ثابت ہوئے۔ ان تذکروں میں شعرا کا ذکر عام طور پر حروف تہجی کے اعتبار سے ملتا ہے۔ تاریخ میں ادوار کا التزام سب سے پہلے ’آب حیات‘ میں ملتا ہے۔ مگر مکمل ادبی تاریخ دراصل بیسویں صدی عیسوی کی پیداوار ہے۔ بیسویں صدی عیسوی میں اردو ادب نے ہر لحاظ و اعتبار سے ترقی کی ہے۔ اس کی تیسری اور چوتھی دہائی میں تخلیق و تنقید کے ساتھ تحقیق و جستجو کا ذوق بڑھنے لگا تھا۔ مغربی معیاروں اور اسالیب سے اسے بڑی مدد ملی تھی۔ چنانچہ تذکرہ نگاروں اور نقادوں کے خیالات کو آنکھ بند کر کے تسلیم کرنے کے بجائے تصانیف و تالیفات کے براہ راست مطالعے کے بعد ان کی قدر و منزلت متعین کرنے کی کوشش شروع ہوئی۔ فن کے اسرار و رموز کے عرفان کے لیے فن کاروں کے مفصل حالات کی تلاش و تفتیش اور ان کی شخصیت کے پیچ و خم کی تحقیق و جستجو عام ہونے لگی۔ بیاضوں، مخطوطات اور دوسرے درجے کے شعرا اور ادیبوں کی تصانیف کے مطالعے سے بہت سا نیا مواد سامنے آیا۔ مختلف نسخوں کا مطالعہ کر کے صحیح اور مستند حقائق کی تلاش اور اسے تیار کرنے کا شوق پیدا ہوا۔ ادبی تاریخ قوموں کی روایات اور تہذیبوں کی نشو و نما کی داستان بن گئی۔ اس میں اس ماضی کی تلاش و جستجو ہونے لگی جو حال کو جنم دیتی ہے۔ جس کے بغیر حال معنی خیز نہیں ہو پاتا۔ جدید ہندوستانی زبانوں اور ان کے ادب کی اہمیت کا اعتراف ہونے لگا اور اپنے ادبی سرمائے کو مغرب کی ذہنی غلامی سے آزاد ہو کر ایک طرف عالمی معیاروں کی روشنی میں اور دوسری طرف اپنی تاریخ اور اپنے ماحول کی روشنی میں پرکھا اور برتا جانے لگا۔

تذکروں سے قطع نظر ادبی تاریخ کی داغ بیل ڈالنے کا فخر و امتیاز محمد حسین آزاد کی ’آب حیات‘ کو حاصل ہے۔ انھوں نے ’آب حیات‘ کو 1880 میں ترتیب دیا۔ اور وہ کلاسیکی انداز کی ایک تاریخ ادب ہے۔ اس میں شعرا کے حالات بیان کیے گئے ہیں۔ آزاد نے جن شعرا کے مفصل حالات لکھے ہیں ان کے جیتے جاگتے مرقعے بھی پیش کیے ہیں۔ یہی ان کا نمایاں اور ممتاز کارنامہ ہے۔

آب حیات کے کئی سالوں بعد تک کوئی دوسری ادبی تاریخ نہیں لکھی گئی۔ امداد امام اثر کی تصنیف ’کاشف الحقائق‘ 1897 میں لکھی گئی لیکن یہ ادبی تاریخ نہیں بلکہ ایک تنقیدی کتاب ہے۔ اس کے بعد بیسویں صدی عیسوی کی تیسری دہائی 30-1921 تک بعض ادبی تاریخیں منظر عام پر آئیں۔ جن میں گل رعنا، شعرالہند، سیر المصنفین، اردوئے قدیم اور تاریخ نثر اردو وغیرہ شامل ہیں۔ ان کے علاوہ محدود و علاقائی تاریخوں میں ’دکن میں اردو‘ ’پنجاب میں اردو، ارباب نثر اردو، اور ’اردو شہ پارے‘ وغیرہ جیسی عہد ساز کتابیں لکھی گئیں۔ مولانا عبدالسلام ندوی کی ’شعرالہند‘ ادبی تاریخ سے زیادہ اردو شعر کی تنقیدی تاریخ ہے۔

آب حیات کے ردعمل میں نثر کی تاریخ لکھنے کا خیال سب سے پہلے محمد یحییٰ تنہا کو آیا۔ انھوں نے 'سیر المصنفین' دو حصوں میں تصنیف کی۔ سیر المصنفین کی پہلی جلد 1924 میں تصنیف ہوئی۔ وہ بنیادی طور پر محقق یا مورخ نہیں تھے۔ انھوں نے قدیم مآخذ سے استفادہ نہیں کیا ہے۔ جو کچھ میسر آیا اسی پر اکتفا کر کے نثر نگاروں کے حالات بیان کر دیے۔ جب دوسری تاریخوں کے بعد سیر المصنفین کا دوسرا اضافہ شدہ ایڈیشن قدرے غنیمت تھا۔ سیر المصنفین کی دوسری جلد عہد سرسید کے نثر نگاروں کے بارے میں ہے۔ یہ جلد 1928 میں شائع ہوئی۔ اس میں مصنفوں کے حالات تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں۔

شمس اللہ قادری کی 'اردوئے قدیم' 1925 کی دین ہے۔ اس کا دوسرا ایڈیشن مزید اضافوں کے بعد 1929 میں شائع ہوا۔ یہ کوئی عمومی تاریخ نہیں بلکہ زیادہ تر دکنی تاریخ سے متعلق ہے۔ لیکن اس میں شمالی ہند کی ابتدائی اردو نظم ونثر کا بیان ہے۔ جس کے سبب یہ ادبی تاریخ کے زمرے میں آجاتی ہے۔ اس سے پہلے 1923 میں نصیر الدین ہاشمی کی علاقائی ادبی تاریخ دکن میں اردو منظر عام پر آچکی تھی، تاہم 1925 کے تحقیقی معیار کے اعتبار سے یہ تصنیف قابل قدر ہے۔

آب حیات کے بعد اردو کی ادبی تاریخ کا دوسرا پائدار سنگ میل رام بابو سکسینہ کی انگریزی میں لکھی ہوئی کتاب A History of Urdu Literature ہے۔ یہ تصنیف 1927 کی ہے۔ اس کتاب کا تکملہ اس کے اضافہ شدہ اردو ترجمے سے ہوا۔ 1929 میں مرزا محمد عسکری نے اس کتاب کا ترجمہ اردو میں 'تاریخ ادب اردو' کے نام سے کیا۔

نظر ثانی شدہ یہ تاریخ محض طلبا کے لیے نہیں بلکہ ادبی تحقیق اور ادبی تاریخ کے مطالعے کے لیے نہایت مفید اور کارآمد ہے۔ وہیں دوسری طرف مرزا محمد عسکری نے اصل کتاب میں کثرت سے اضافے کیے ہیں۔

رام بابو سکسینہ کی تاریخ جدید انداز کی مثالی تاریخ ہے جو اپنے زمانے میں تو روشنی کا مینار تھی ہی، اب بھی کسی مصنف، کسی علاقے، کسی دور اور کسی صنف کے بارے میں ابتدائی معلومات حاصل کرنی ہو تو اس سے استفادہ کیے بغیر نہیں رہا جا سکتا نیز اس کتاب میں دکنی ادب، نیز بیسویں صدی کے نثری ادب کے بارے میں بہتر معلومات بہم پہنچائی گئی ہیں۔ اردو کے ابتدائی ڈراما نگاروں اور مستشرقین وغیرہ کے کارناموں کے بارے میں یہ تاریخ مفید معلومات کا خزانہ ہے۔

احسن مارہروی کی ادبی تاریخ 'تاریخ نثر اردو' موسوم بہ نمونۂ منثورات 1930 میں لکھی گئی اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے شائع ہوئی۔ یہ کتاب تاریخ نثر اردو سے زیادہ نمونۂ منثورات ہے اور اس میں ایسے متعدد قلم کاروں کو بھی شامل کیا گیا ہے جن کا ادب میں کوئی مقام نہیں۔

ڈاکٹر سید اعجاز حسین نے اپنی کتاب 'مختصر تاریخ ادب اردو' کا پہلا ایڈیشن 1934 میں شائع کیا۔ طالب علموں کے لیے یہ پہلی مختصر ادبی تاریخ تھی اس لیے اس کا معیار وہی تھا۔ جو 1934 میں ہو سکتا تھا۔ بعد کے ایڈیشن میں انھوں نے اس میں ترمیم اور اضافے کیے، اس کے باوجود اردو کی ادبی تاریخوں میں اس کا کوئی نمایاں مقام نہ بن سکا۔

حامد حسن قادری کی 'داستان تاریخ اردو' کا پہلا ایڈیشن 1941 میں اور دوسرا اضافہ شدہ ایڈیشن 1957 میں آیا۔ جب کہ تیسرا، چوتھا اور پانچواں ایڈیشن بالترتیب 1988,1966 اور 1995 میں آیا۔ یہ تاریخ خالص نثر نگاروں تک محدود ہے۔ اور انیسویں صدی کے اختتام تک ہی کے مصنفوں کا احاطہ کرتی ہے۔ لیکن تاحال یہ اردو نثر نگاروں کی بہترین تاریخ ہے اور محمد یحییٰ تنہا کی 'سیر المصنفین' سے کہیں زیادہ مفید ہے۔

عبدالقیوم پہلے شخص ہیں جنھوں نے کئی حضرات سے مضامین لکھوا کر 'تاریخ ادب اردو' تیار کرنے کا منصوبہ بنایا۔ ان کا ارادہ پورے اردو ادب کو چار جلدوں میں سمیٹنے کا تھا لیکن ان میں صرف پہلی جلد لکھی گئی اور 1961 میں کراچی سے شائع ہوئی۔ عبدالقیوم کی تاریخ کے اگلے سال 1962 میں دوسری اجتماعی تاریخ علی گڑھ سے شائع ہوئی۔ اتفاق کی بات تو یہ ہے کہ عبدالقیوم کی تاریخ ادب اردو اور علی گڑھ تاریخ ادب اردو یہ دونوں تاریخیں پہلی یعنی دکنی ادب کے بیان پر ڈھیر ہوگئی۔ علی گڑھ تاریخ ادب اردو پر رشید حسن خان کا شدید معترضانہ تبصرہ رسالہ 'تحریک' میں شائع ہوا۔ اس کے بعد تاریخ کی یہ جلد بھی بازار سے اٹھا لی گئی اور بعد کی جلدیں آج تک مرتب نہ ہو سکیں۔

سید احتشام حسین کی 'اردو ادب کی تنقیدی تاریخ' اپنی نوعیت کی تاریخوں میں بہترین اور عمدہ ہے۔ یہ احتشام حسین کی ہندی کتاب 'اردو ساہتیہ کا آلوچناتمک اتہاس' کا اردو ترجمہ ہے۔ اسے تحقیق کے نقطۂ نظر سے زیادہ تنقیدی اعتبار سے دیکھا جائے تو نہایت کارآمد کتاب ہے۔

'تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند' اجتماعی تاریخوں میں سب سے ضخیم، سب سے جامع اور مکمل ہے۔ اس کی پانچویں جلد 72-1971 میں شائع ہوئی۔ اس اجتماعی تاریخ کا سب سے زریں پہلو اس کا مکمل ہو جانا ہے۔ علی گڑھ تاریخ ادب اردو کے مقابلے میں یہ اردو ادب کی سب سے بڑی اور مکمل تاریخ ہے۔ اس کے مضمون نگاروں میں بیش تر ہندوستان میں متعارف نہیں۔ اگر لکھنے والوں کا حلقہ زیادہ وسیع ہوتا تو بہتر نتائج سامنے آسکتے۔ مجلس ادارت نے اپنے فرائض کی طرف توجہ نہیں کی جس کی وجہ سے یہ تاریخ منتشر مضامین کا مجموعہ بن کر رہ گئی۔ اس میں کتاب کی وحدت نہیں آنے پائی۔ مختلف مضامین کا معیار علاحدہ اور جداگانہ ہے۔ بعض بہت اچھے ہیں۔ بعض خاصے سرسری مضمون نگاروں نے عام طور پر تحقیقی احتیاط سے کام نہیں لیا ہے۔ بہر حال اب بھی جو کچھ ہے وہ غنیمت ہے۔

ڈاکٹر انصار اللہ نے طالب علموں کے لیے اردو ادب کی ایک مختصر تاریخ لکھنے کا ارادہ کیا، لیکن محقق ہونے کی وجہ سے ایک تحقیقی تاریخ لکھ گئے۔ ان کی تاریخ 'اقلیم ادب' کا پہلا حصہ 1979 میں اور دوسرا 1980 میں شائع ہوا۔ اس میں دہلی کے بادشاہ احمد شاہ کے عہد کے خاتمہ تک کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ان کی تاریخ میں کئی دلچسپ

تحقیقی کاوشیں ہیں۔ لیکن ان کا سب سے زیادہ نمایاں پہلوان کی پورب پرستی ہے۔ ان کے نزدیک اردو مشرقی یوپی میں پیدا ہوئی۔ اس کا ماخذ پوربی زبان ہے۔ وہ پوربی یعنی اودھی بلکہ بھوج پوری تک کے ہندی شعرا کو اردو میں شامل کر لینا چاہتے ہیں لیکن اس سے اردو زبان وادب کی انفرادیت ختم ہو جائے گی۔

رام بابو سکسینہ کے بعد انگریزی میں اردو ادب کی دوسری اہم تاریخ محمد صادق نے A History of Urdu Literature کے نام سے 1964 میں لکھی۔ اس کا پہلا ایڈیشن آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، لندن سے 1964 میں اور دوسرا اضافہ شدہ ایڈیشن 1984 میں دہلی سے شائع ہوا۔ انھوں نے دیباچے میں لکھا ہے کہ ان کی تاریخ عام باذوق قاری کے واسطے اردو ادب کا تنقیدی جائزہ پیش کرتی ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کتاب تحقیقی انداز سے نہیں لکھی گئی ہے۔ وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ ادیبوں اور ان کے کاموں کی فہرست اور تاریخیں درج کرنا ادبی تاریخوں کا کام نہیں یہ کتابیات کے ذیل میں آتا ہے۔ ان کی اس بات سے اتفاق نہیں کیا جا سکتا۔ ان کی کتاب تحقیقی نہیں۔ انھوں نے سنین درج کرنے کا التزام نہیں کیا ہے۔ جہاں سنین درج ہیں ان کے مستند ہونے کی کوئی ضمانت نہیں۔

اردو کی ادبی تاریخ نگاری کا نقطۂ عروج ڈاکٹر جمیل جالبی کی 'تاریخ ادب اردو' ہے۔ یہ تاریخ ادب اردو چار جلدوں پر مشتمل ہے۔ جلد اول کا صرف ایک حصہ ہے اور یہ جلد 1975 میں شائع ہوئی۔ دو حصوں پر مشتمل جلد دوم 1984 میں شائع ہوئی جب کہ تیسری جلد 2007 میں اور چوتھی جلد 2012 میں شائع ہوئی۔ یہ چار جلدیں گیارہویں صدی عیسوی سے لے کر انیسویں صدی کے نصف آخر تک اردو ادب پر محیط ہیں۔ پہلی جلد اردو زبان و ادب کے آغاز سے لے کر ولی گجراتی اور ان کے معاصرین کے عہد تک کا احاطہ کرتی ہے۔ دوسری جلد سترہویں صدی عیسوی کے آخری تین چار عشروں سے لے کر تقریباً پوری اٹھارہویں صدی کے نصف آخر تک کو محیط ہے۔ تیسری جلد انیسویں صدی کے آغاز سے لے کر نصف اول پر مشتمل ہے۔ جب کہ چوتھی جلد انیسویں صدی کے نصف آخر تک کا احاطہ کرتی ہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی کی 'تاریخ ادب اردو' تحقیق اور تنقید دونوں کے اعتبار سے خوب سے خوب تر ہے۔ مصنف نے ادبی تاریخ کے نظریے پر شعوری طور سے توجہ کی ہے۔ انھوں نے اپنی تاریخ کو ادبی روایات کے نقطۂ نظر سے ترتیب دیا ہے۔ انھوں نے پورے اردو ادب کے جتنے زیادہ مخطوطوں اور اصل ماخذ سے رجوع کیا ہے اتنا شاید کسی اور مورخ نے نہ کیا ہو۔

اردو کی ادبی تاریخ نگاری کے ارتقاء و روایت کے سلسلے میں گیان چند جین اور سیدہ جعفر کی مشترکہ کوشش قابل ذکر ہے۔ گیان چند جین اور سیدہ جعفر نے مشترکہ طور پر 'تاریخ ادب اردو' 1700 تک پانچ جلدوں میں لکھی۔ پانچ جلدوں پر مشتمل یہ تاریخ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی نے 1998 میں شائع کی۔ اس تاریخ میں کل گیارہ ابواب ہیں جو ترتیب وار لکھے گئے ہیں۔ کتابیات وغیرہ آخری جلد کے ضمیمہ سے پہلے درج ہے۔

اردو کی ادبی تاریخوں میں بڑا تنوع ملتا ہے بعض تاریخیں صرف نظم کی ہیں، بعض محض نثر کی، بعض پورے اردو ادب کا احاطہ کرتی ہیں، بعض کسی ایک علاقے یا دور کا احاطہ کرتی ہیں۔ مثلاً:

1 آب حیات از محمد حسین آزاد، گل رعنا، از عبدالحی، شعر الہند از عبدالسلام ندوی، مراۃ الشعرا از محمد یحیٰ تنہا وغیرہ صرف شاعری کی تاریخیں ہیں۔

2 دکن میں اردو از نصیر الدین ہاشمی، پنجاب میں اردو از حافظ محمود شیرانی، کشمیر میں اردو از عبدالقادر سروری، بنگال میں اردو نثر کی تاریخ از سالک لکھنوی، بہار میں اردو زبان وادب کا ارتقا، از اختر اورینوی وغیرہ اور اس قبیل کی متعدد تاریخیں ہیں۔ جو علاقائی اردو ادب تک محدود ہیں۔

3 شمس اللہ قادری کی اردوئے قدیم اور ڈاکٹر محی الدین قادری زور کی اردو شہ پارے اپنے دور کی مشہور و معروف تاریخیں ہیں۔

4 محمد یحیٰ تنہا کی سیر المصنفین، احسن مارہروی کی تاریخ نثر اردو عرف نمونہ منثورات اور حامد حسن قادری کی داستان تاریخ اردو صرف نثری تاریخیں ہیں۔

5 اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک از خلیل الرحمٰن اعظمی، ترقی پسند ادب از سردار جعفری، علی گڑھ تحریک از وسیم قریشی، اردو نثر میں ادب لطیف از ڈاکٹر عبدالودود، اردو ادب کے ارتقا میں ادبی تحریکوں اور رجحانوں کا حصہ از منظر اعظمی وغیرہ تاریخوں، تحریکوں اور رجحانوں سے متعلق ہیں۔

اس کے علاوہ تاریخوں کی ایک قسم اور ہے جو زیادہ تر نصابی ضرورت کے تحت طالب علموں کے لیے لکھی گئی ہیں۔ یہ بات مسلم ہے کہ ڈاکٹر انصار اللہ کی تاریخ اقلیم ادب اور ڈاکٹر اعجاز حسین و محمد عقیل رضوی کی مختصر تاریخ ادب اردو بھی صرف طلبا کے مطالعے کے لیے لکھی گئی ہیں۔ لیکن ڈاکٹر انصار اللہ نے اپنی کتاب میں تحقیقی بحثیں بھی کی ہیں اور ڈاکٹر عقیل نے اعجاز حسین کی تاریخ میں اضافے کر کے اسے اتنا جامع بنا دیا ہے کہ اب انہیں محض طلبا کی ضرورت تک محدود نہیں سمجھا جا سکتا۔

بہر حال ادبی تاریخ نگاری کے سلسلے میں جو بات سامنے آتی ہے، اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اب تک کی ادبی تاریخوں میں رام بابو سکسینہ اور مرزا محمد عسکری کی 'تاریخ ادب اردو' حامد حسن قادری کی 'داستان تاریخ اردو'، 'علی گڑھ تاریخ ادب اردو' جمیل جالبی کی 'تاریخ ادب اردو' گیان چند جین اور سیدہ جعفر کی 'تاریخ ادب اردو' قابل قدر ہیں۔ اس ضمن میں یہ بات مسلم ہے کہ اردو کی ادبی تاریخ نگاری کی روایت نہایت صحت مند ہے، اس کا ارتقا حوصلہ افزا ہے اور ہنوز یہ سلسلہ جاری ہے۔

■

Mohd Irshad
Room No-404 Mansarovar Hostel,
University of Delhi, Delhi-110007
Email-notepad198824@gmail.com
Mob:8826933018

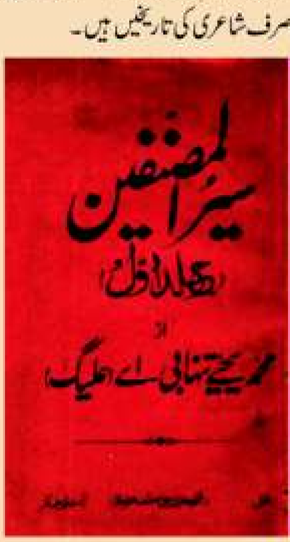

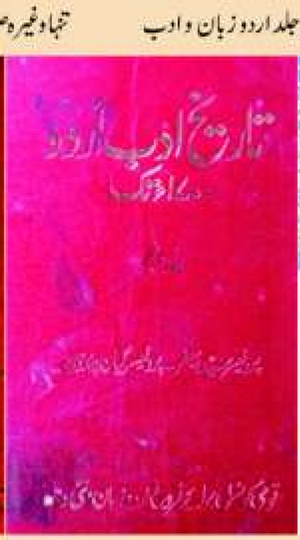

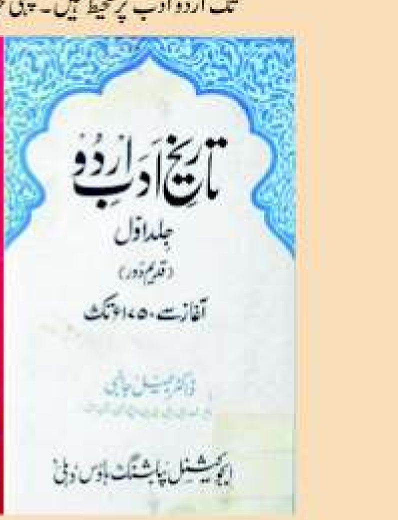

محمد اسرار عالم

کورونا بحران

اور متعلقہ پسماندگی سے نمٹنے میں پیشہ ورانہ سوشل ورک کی اہمیت اور ممکن مداخلت

نوول کورونا وائرس، کورونا وائرس کی نسل سے تعلق رکھنے والا ایک ایسا وائرس ہے جسے طبی اصطلاحات کے مطابق SARS COV-2 (Sever Acute Respiratory Syndrome Coronavirus-2) کے نام سے جانا جاتا ہے اور اس خطرناک وائرس سے ہونے والے مرض کو COVID-19 کہتے ہیں۔ عالمی ادارہ صحت (World Health Organization) اور دیگر میڈیکل سائنس کی تحقیق کے مطابق یہ وائرس پھیپھڑوں کو متاثر کرتا ہے۔ بخار اور خشک کھانسی اس جان لیوا بیماری کی دو بنیادی علامات ہیں۔ اس کے علاوہ گلے کی خرابی، سردرد اور اسہال بھی دیگر علامات میں شامل ہیں جبکہ کچھ مریضوں میں ذائقے اور سونگھنے کی حس بھی متاثر ہوتی پائی گئی ہے۔ عالمی ادارہ صحت کے مطابق اس مرض کی صفات محسوس ہونے سے لے کر علامات ظاہر ہونے میں عموماً 14 دنوں کا وقت لگتا ہے لیکن کچھ محققین کا کہنا ہے کی یہ 24 دن تک بھی ہوسکتا ہے۔ دنیا کے اعلیٰ ترین قومی و بین الاقوامی ادارے اور سائنسدانوں کی ٹیم اس وقت ہر اس کوشش میں لگی ہے کہ کیسے اس وبائی مرض کو مات دینے والا ٹیکہ تیار کیا جائے حالانکہ ابھی تک کامیابی ہاتھ نہیں لگی ہے اور نہ ہی اس کا کوئی مخصوص علاج سامنے آ پایا ہے۔ ورلڈ ہیلتھ آرگنائزیشن کے مطابق 21 اکتوبر 2020 تک دنیا کے 216 ممالک اب تک اس بحرانی وبا کی چپیٹ میں آ چکے ہیں اور اس مرض سے متاثرہ افراد کی تعداد چار کروڑ کے پار ہے جب کہ مرنے والے افراد کی تعداد اب تک ایک لاکھ سے زیادہ ہو گئی ہے۔

ویسے تو کووڈ-19 بحرانی وبا ہے مگر آنے والے وقت میں یہ ایک خطرناک انسانی اور ترقیاتی مسائل کی علامت بھی ہے۔ دنیا بھر کے دانشوروں کا یہ ماننا ہے کہ آنے والے کئی سالوں تک کورونا کی وجہ سے شدید سماجی و معاشی دشواریاں پیش آنے والی ہیں جس کے بدترین اثرات مرتب ہونے کے امکانات ہیں بالخصوص ان ممالک پر جو پہلے سے ہی غربت، غیر برابری، امتیاز پرستی، عدم اعتمادی اور تشدد کا شکار ہیں۔ اس وقت ہمارے اردگرد جو کچھ بھی ہو رہا ہے اس نے نہ صرف ہمارے سکون کو درہم برہم کیا ہے بلکہ ہمیں شرم، بے یقینی اور احساس جرم میں بھی مبتلا کر دیا ہے۔ کسے پتہ تھا کہ جہاں سال 2020 کے آغاز کو پائیدار ترقی کے عالمی مقاصد (Sustainable Development Goals-2030) کو حقیقی بنانے کی سمت میں 'ڈیکیڈ آف ایکشن' کے طور پر دیکھا جا رہا تھا وہیں اس سال کے شروع ہوتے ہی ایک عالمی وبا ترقی کے بنیادی تناظر کو ہی بدل کر رکھ دے گی۔ ایسے وقت میں جب دنیا کے کئی ممالک پہلے سے ہی سماجی، معاشی اور سیاسی اُتھل پتھل کے نازک دور سے گزر رہے تھے اور عالمی سطح پر ایک بڑا طبقہ کئی قسم کی پسماندگی کا شکار تھا (جس میں غربت اور تنازع سرفہرست ہیں) ایسے میں کورونا وبا کا کہرام، ایس۔ڈی۔جیز کے عہد 'Leaving No One Behind' کے حصول میں ایک بڑا چیلنج بن گیا۔ 18 جولائی 2020 کو اقوام متحدہ کی جانب سے اٹھارہویں نیلسن منڈیلا لیکچر کا انعقاد کیا گیا جس میں جنرل سیکرٹری، انٹونیو گوتیرس نے اپنے خطاب 'Tackling the Inequality Pandemic: A new Social Contract for a new Era' میں ناانصافی کی تاریخی حقیقتوں اور موجودہ رجحانات پر روشنی ڈالتے ہوئے بتایا کہ نوآبادیاتی سے لے کر پدرسری روایت اور نسل پرستی سے لے کر ڈیجیٹل ڈیوائڈ، عوامی خوش حالی اور بہتر مستقبل کے راستے میں ایک بڑی رکاوٹ ہے۔ انھوں نے یہ بھی واضح کیا کہ ایسے وقت میں کووڈ-19 نے ہمارے سماج میں پھیلی غیر برابری، تعصب پرستی اور پسماندگی کی مختلف سطحوں کو بے نقاب کیا ہے (اقوام متحدہ، 2020)۔ کورونا بحران کی وجہ سے صحت عامہ کی لاچاری، ذریعۂ معاش کی تنگی، سماجی تحفظ کی فراہمی میں خلا ساختی عدم مساوات، ماحولیاتی بدنظمی وغیرہ کڑوی سچائی کے طور پر ہماری نظروں کے سامنے ہیں۔

ان حالات کے جواب (Response) بطور حکومتی محکموں سے لے کر پولیس فورس اور صحت گاری کے اداروں سے لے کر سماجی فلاح کی تنظیموں کے کارکنان اپنا کردار ادا کر رہے ہیں۔ اس ضمن میں ایک اہم کردار سوشل ورکرز کا بھی ہے جن کا بنیادی مقصد ایسی حالت میں پسماندگی کا شکار ہوئے طبقات کو ضروری اور معیاری سہولیات فراہم کرانا ہے تاکہ متاثرہ افراد کو پسماندگی اور اس سے ہونے والے خطرات کی زد سے باہر نکالا جا سکے۔ کورونا بحران سے پیدا ہوئی صورت میں سماجی و معاشی اعتبار سے ان طبقات کے تحفظ اور فلاح سے جڑے مسائل کو مخصوص توجہ دینے کی اشد ضرورت ہے تاکہ سماجی انصاف اور انسانی حقوق کے تقاضوں کو یقینی بنایا جا سکے۔ اس اعتبار سے یہ مضمون پسماندگی کے تناظر (Vulnerability Context) میں کورونا وائرس سے ہونے والے غیر متوقع نقصانات پر روشنی ڈالتا ہے جس کے ذریعے حاشیائی اور

غریب طبقات سے جڑے متعدد مسائل کو سمجھانے میں مدد ملتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ یہ مضمون خصوصی طور پر سوشل ورک کی اخلاقیات واستعداد کی روشنی میں سوشل ورک کی ان ممکنہ مداخلت کا بھی تبصرہ کرتا ہے جو کورونا سے جنگ میں سماجی فلاح و بہبود کی حکمت عملی اور مداخلت کو ہموار بنانے میں کارآمد ثابت ہوسکتے ہیں۔

پسماندگی کا تناظر

سماجی علوم کے ڈسکورس میں پسماندگی (Vulnerability) سے مراد ویسی قدرتی یا بشری نوعیت کے غیر متوقع اور ناگوار رجحانات سے (کارڈونا، 2004؛ ایمریچ اور کٹز، 2011) ہے جس میں ایک طرف ماحولیات یا سماجی بدلاؤ کی وجہ سے مختلف خطرات کے پیدا ہونے کے امکانات ہوتے ہیں اوردوسری طرف ان ممکنہ صلاحیتوں کی غیر موجودگی ہوتی ہے جو ان خطرات کا سامنا کرنے میں مدد کرسکیں (اوگر، 268: 2006)۔ جب کوئی فرد، جماعت یا معاشرہ کسی بیرونی کشیدگی (External Stressor) اور اس سے منسلک پریشانیوں کا سامنا کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا ہے تو یہ ان کے پسماندہ ہونے کا اشارہ ہے۔ دراصل سماجی علوم میں پسماندگی کو بطور اکیڈمک نظریہ اور تھیوری، اس وقت زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی جب امرتیہ سین کی بنگال قحط پر ہوئی تحقیق سے متعلقہ کتاب 'Poverty and Famine: An Essay on Entitlement and Deprivation' شائع ہوئی جس میں انھوں نے غربت اور محرومیت کے بدستور قائم رہنے والے رشتے کا تصور بیان کرتے ہوئے پسماندگی کا ذکر کیا (سین، 1981)۔ پھر اس کے بعد رابرٹ چمبرس جو غربت اور پائیدار ذریعۂ معاش کے بڑے مفکر اور پریکٹیشنر تسلیم کیے جاتے ہیں، انھوں نے غریبی اور محرومیت کے بدستور چلتے رہنے والے رشتے کو سمجھنے کے لیے پسماندگی کے متعلقہ کوائف کو زیر غور کرنے کی تجویز پیش کی۔ پسماندگی کے حوالے سے چمبرس نے بتایا کہ:

پسماندگی کے دو پہلو ہوتے ہیں: بیرونی اعتبار سے جھٹکے، دباؤ اور خدشات سے نمایاں (Exposure) ہونا اور ذاتی اعتبار سے بے اختیار اور لاچار (Defenseless) ہونا۔ ایسی کیفیت ان صلاحیتوں کی غیر موجودگی کی وجہ بنتی ہے جو نقصانات اور خدشات کا سامنا کرنے میں مدد کرتے ہیں۔ نقصان کی مختلف قسمیں ہوسکتی ہیں۔ جسمانی اعتبار سے کمزور ہوجانا، معاشی اعتبار سے غریب ہوجانا، سماجی اعتبار سے دوسروں پر منحصر ہوجانا، ذلت یا نفسیاتی نقصان سے دوچار ہونا، وغیرہ۔ (چمبرس، 189: 1995)

قابل غور بات یہ ہے پسماندگی کا یہ نظریہ، ہمیں ایک موثر تجزیاتی ٹول فراہم کرتا ہے جو کسی بھی قسم کے خدشے سے ہونے والے ممکنہ نقصانات کا اندازہ لگانے اور ان سے جڑی جسمانی، ذہنی اور سماجی بے بسی وکمزوری کی وضاحت کرنے میں معاون ہے۔ خدشات کو کم کرنے اور مکمل خوشحالی کو بحال کرنے کے مداخلتی منصوبہ بنانے میں بھی یہ نظریہ اہم کردار ادا کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پسماندگی کے تناظر کو جیوگرافی، اکنامکس، ڈیزاسٹر مینجمنٹ، ہیلتھ، نیوٹریشن، انوائرمنٹل سائنس، سوشل ورک، سماجیات، نفسیات، صحت عامہ اور کئی دیگر علوم میں مقبولیت حاصل ہے (الوانگ، سیگل اور جوگنسین، 2016؛ وائزنر، 2001)۔

کورونا وبا اور متعلقہ پسماندگی

اس وبائی مرض نے روز مرہ کی لگ بھگ سبھی سرگرمیوں پر مکمل پابندی لگادی جس سے عوام کو بے شمار پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ کورونا بحران سے نمٹنے اور اس کے پھیلاؤ پر روک لگانے کی غرض سے معاشرتی دوری کے قواعد کو سختی سے عمل میں لایا گیا لیکن کچھ ہی وقت میں اس کے مختلف منفی نتائج دیکھنے کو ملے۔ سماج کا ایک بڑا حصہ جو پچھڑے، غریب اور مزدور طبقے سے تعلق رکھتا ہے، اسے اپنے ہاتھ سے روزی اور سر سے چھت گنوانی پڑ گئی کہ زندگی گزارنے کی بنیادی اشیا یعنی معاش کے فقدان میں مجبوراً انہیں اپنے اپنے گاؤں لوٹنے کا فیصلہ لینا پڑا جس کے سبب انہیں ہر دن الگ الگ قسم کے خطرات اور نقصانات سے دوچار ہونا پڑا جس میں معاشی تنگی، فاقہ کشی، جسمانی کمزوری، طبی سہولیات کی غیر موجودگی، ذہنی کشیدگی، حادثوں میں موت اور خودکشی وغیرہ افسوسناک مثال شامل ہیں۔

نیشنل سیمپل سروے آفس (NSSO) کی لیبر فورس رپورٹ (2017-18) کے مطابق ہندوستان میں کل ورکرز کی تعداد 46.1 کروڑ ہے جن میں سے 80 فیصد یعنی تقریباً 36.9 کروڑ انفورمل سیکٹر یعنی کھیتی باڑی اور مائکرو، چھوٹے یا درمیانی کاروباری اداروں (MSMEs) سے منسلک دہاڑی مزدور کی طرح کام کرتے ہیں۔ منسٹری آف لیبر اینڈ ایمپلائمنٹ کے ذریعے شائع 2019 کی رپورٹ کے مطابق تقریباً 41.8 کروڑ مزدور ایسے ہیں جو بنیادی اجرت کی در سے بھی کم اجرت پر کام کرتے ہیں۔ ایسے مزدور طبقے کے روزگار سے متعلق منفرد چیلنجز ہوتے ہیں جس میں ان کے ذریعہ معاش کا محفوظ نہ ہونا اور آمدنی کا انتہائی کم ہونا سب سے بڑا چیلنج ہے۔ کورونا وبا کی وجہ سے ایک ہی جھٹکے میں ایسے لاکھوں مزدور بے روزگار ہوگئے۔ ایسی صورت حال کے حوالے سے رابرٹ چیمبرس نے اپنے مضمون 'پاورٹی اینڈ لائیولیہوڈ: ہوز ریالٹی کاؤنٹس' میں غربت، ذریعۂ معاش اور پسماندگی کے بیچ ایک گہرا تعلق بتایا ہے (چیمبرس، 1995) اور اگر موجودہ صورت حال کی روشنی میں دیکھا جائے تو یہ رشتہ صاف ظاہر ہو رہا ہے، پہلے سے غربت کی مار جھیل رہے متعدد مزدور، کورونا وبا کی وجہ سے مزید خطرات کے زد میں آگئے جس کے سبب وہ ناقابل برداشت پریشانیوں میں مبتلا ہوگئے۔

دراصل یہ وقت اصل امتحان کی گھڑی ہے جس میں کمزور، پسماندہ اور حاشیائی طبقات کے تحفظ وبقا پر خصوصی توجہ دینے کی ضرورت ہے تاکہ حقیقی معنوں میں ایس جی ڈیز کے اہداف کی تائید ہوسکے اور سماجی انصاف کی بحالی بھی۔ اس ضمن میں پیشہ ورانہ سوشل ورک کی شرکت اور کردار بے حد معاون ہے کیونکہ سوشل ورک پریکٹس عوام کی فلاح و بہبود اور بااختیاری سے متعلق ایک ایسا پیشہ ورانہ عمل ہے جس کی بنیاد انسانی حقوق اور سماجی انصاف کے اصولوں پر مبنی ہے۔

پیشہ ورانہ سوشل ورک کی تفہیم

سوشل ورک ایک ایسا پیشہ ور عمل ہے جس کے تحت سماجی کارکنان زمینی سطح پر لوگوں کے ساتھ مل کر ان کی زندگی میں درپیش مسائل کے حل کے لیے مثبت راہیں تلاش کرتے ہیں۔ سوشل ورک پیشہ وران کی یہ کوشش رہتی ہے کہ وہ لوگوں میں خودارادیت (Self Determination) کے جذبے کو فروغ دیں اور انھیں بااختیار (Empower) بنائیں۔ سوشل ورک کی عظیم بین الاقوامی تنظیم انٹرنیشنل فیڈریشن آف سوشل ورکرز کے مطابق پیشہ ورانہ سوشل ورک اس امر کو تسلیم کرتا ہے کہ تاریخی، سماجی، معاشی، ثقافتی، علاقائی، سیاسی اور انفرادی عناصر عوامی خوشحالی و آسودگی کو بحال کرنے میں جہاں ایک طرف موثر مواقع دستیاب کرتے ہیں وہیں دوسری طرف ان کی راہ میں رکاوٹ کا سبب بھی بنتے ہیں۔ دراصل ساختیاتی رکاوٹوں اور اڑچنوں کی وجہ سے غیر برابری، امتیازی سلوک، استحصال اور جبر کو ترجیح ملتی ہے جو کچھ سماجی طبقات کی پسماندگی کی بڑی وجہ بنتے ہیں۔ لہٰذا اس سمت میں غربت اور اس کی وجہ سے مرتب ہونے والی پسماندگی سے غریب اور کمزور طبقے کی حفاظت، ان کی فلاح و بہبود اور آزادی کو فروغ دینا سوشل ورک پروفیشن کی شناخت اور تفہیم کا خصوصی حصہ ہے۔ چنانچہ سوشل ورک کا اخلاقی منڈیٹ، انسانی حقوق اور سماجی انصاف کے تصورات پر مشتمل ہے جو نہ صرف اس پیشے کے مرکزی اقدار ہیں بلکہ ہر سوشل ورک کارکن کے لیے اس کی تائید کرنا لازمی شرط بھی ہے۔ حقوق اور انصاف کی

متحرکہ اور توانائی فطرت، سوشل ورک پریکٹس کے دائرۂ کار کو کافی وسیع بناتی ہے۔ سماجی انصاف، سماجی خدمات اور عوامی خوش حالی کو حقیقی بنانے کے مدنظر، انسانی لیاقت اور استعداد میں اضافہ کرنا، لوگوں کو خود مختار بنانا، لوگوں کے اندر مثبت بدلاؤ کی جستجو پیدا کرنا اور ضرورت مند طبقات کے لیے ذرائع اور وسائل کی رسائی، سوشل ورک پروفیشن کے اغراض ومقاصد کی عکاسی کرتے ہیں۔ سوشل ورک کی تعلیم اور تربیت اس پیشے سے وابستہ کارکنان کو مخصوص علم، مہارت اور رویے سے آراستہ کرتے ہیں جو انہیں سماجی مسائل کے حل اور عوامی خوش حالی کی بحالی کے عزم کو پورا کرنے میں مددگار ثابت ہوتے ہیں۔

پسماندگی کے تناظر کا ذکر کرتے وقت ہم نے دیکھا کہ کورونا بحران کی وجہ سے عوامی زندگی سے جڑا سارا انظام درہم برہم ہوگیا۔ آبادی کا ایک بڑا حصہ جس میں بیشتر مزدور اور غریب عوام شامل ہیں، ان کا ذریعہ معاش چھن گیا، وہ بے گھر ہو گئے، ان میں سے بہت سے لوگوں نے حادثوں میں جان گنوا دی، کچھ نے تنگ آ کر خودکشی تک کر لی۔ سوشل ورک کے مخالف جبر نظریہ (Anti Oppressive Social Work) کے تحت ساختیاتی عدم مساوات اور امتیازی سلوک ایسے وقت میں غریب اور کمزور طبقے کو سب سے زیادہ اثر انداز کرتے ہیں۔ اس نظریہ کی علمبردار اور معروف مفکر، لینا ڈومنیلی کا ماننا ہے کہ کورونا وبا کی وجہ سے نمودار دشواریوں کے مدنظر کمزور اور مظلوم طبقات کے تحفظ اور سماجی انصاف کے اقدار کو برقرار رکھنے کے لیے اس نظریے کی پشت پناہی بہت ضروری ہے۔ ڈومنیلی اور ان کے دیگر ساتھیوں کے ذریعے مرتب کردہ رپورٹ 'کوڈ-19 اینڈ سوشل ورک: کلیکشن آف کنٹری رپورٹ' میں اس بات پر خاصا زور دیا گیا ہے کہ اگرچہ سماجی فلاح و بہبود معاشرے میں پوری آبادی کو انتظامی سطح پر معاونت فراہم کرتی ہے، سوشل ورک کا ایک خاص کردار آبادی کے انتہائی کمزور طبقات کے ساتھ کام کرنا، ان کی حمایت کرنا اور ان کا خیال رکھنا ہے (ڈومنیلی اور دیگر، 2020)۔ اس کے ساتھ ہی سوشل ورک پیشہ وران کی ذمے داری ہے کہ وہ اس بات کو یقینی بنائیں کہ سروس ڈلیوری کا ایک مساوی نظم بحال ہو اور سماج کا کوئی بھی طبقہ وسائل کی رسائی سے محروم نہ رہے۔

کورونا سے بچاؤ میں سوشل ورک کا ممکنہ کردار

نیشنل ایسوسی ایشن آف سوشل ورکرز کے اخلاقی ضابطے (Code of Ethics) کی دفعہ 6.03 عوامی زندگی کو اثر انداز کرنے والی ہنگامی صورتِ حال کے دوران سوشل ورکرز کی ذمے داریوں کی نشان دہی کرتی ہے اور ضرورت مند افراد کو مناسب خدمات مہیا کرانے کے فریضے پر روشنی ڈالتی ہے۔ ہم نے دیکھا کہ کس طرح کورونا وبا کی وجہ سے سماج میں بحرانی اور ہنگامی کیفیت نے جنم لیا اور اس مسئلے کی وجہ سے غریب اور پسماندہ طبقات کو غذا، طبی مدد، ادویات اور جذباتی مدد جیسی اہم سہولیات سے محروم ہونا پڑا۔ لہٰذا سوشل ورکرز ایسے طبقات کے لیے ضروری وسائل کی رسائی اور پالیسیز کی تشکیل کی وکالت کرنے میں کافی حد تک تعاون کر سکتے ہیں۔ کورونا بحران سے نمٹنے اور متاثرہ طبقات کے لیے خدمات کی فراہمی میں سوشل ورک کے مندرجہ ذیل مداخلتی اقدار خصوصی اہمیت کے حامل ہیں:

(i) عزتِ نفس اور وقار کی قدر کرنا سوشل ورک کے بنیادی اقدار میں شامل ہیں۔ ہر انسان کی عزت و وقار کی قدر کرنا اور اس کے لیے معاون پالیسیز کی وکالت کرنا سوشل ورک پیشہ کا اہم فریضہ ہے۔

(ii) کورونا وبا اور متعلقہ بحران سے پیدا ہونے والے مسائل کی شناخت، روک تھام اور خاتمے لیے مداخلتی حکمت عملی بنانا اور ضرورت مند افراد کو خصوصی مدد فراہم کرنا۔ احتیاطی نقطوں کو عمل میں لاتے ہوئے ہیلتھ پروفیشنلز کی طرح محتاج افراد کے لیے خدمات کی فراہمی۔

(iii) دیگر تنظیموں کے ساتھ نیٹ ورکنگ کر کے یہ متعین کرنا کہ پسماندہ اور محروم طبقات تک ضروری وسائل کی رسائی ہو سکے اور اگر کسی قسم کی ناانصافی یا حق تلفی ہوتی ہے تو اس کے خلاف آواز بلند کرنا۔

(iv) سماجی دوری اور الگ تھلگ رہنے کے ماحول میں بھی انسانوں کے بیچ باہمی رشتوں کی اہمیت کو ترجیح دینا اور معاشرے و عوام میں اس بات کی حساسیت پیدا کرنا کہ لوگ ایک دوسرے کی مدد اور حمایت کے لیے آگے آئیں تا کہ سماجی، اجتماعی اور انفرادی سطحوں پر مجموعی ذمے داری (Collective responsibility) کے جذبے کو فروغ دیا جا سکے۔

شک و شبہات، ڈر، غلط فہمی اور عدم مساوات کے اس ہنگامی ماحول میں یہ اقدار سوشل ورک پیشہ وران کی حوصلہ افزائی اور رہنمائی کرتے ہیں تا کہ وہ حقوق انسانی اور سماجی انصاف کے اصولوں کے تئیں حساس رہتے ہوئے اس لڑائی میں خدمات کو انجام دے سکیں۔ ڈیوبولیس اور میلے (1992) نے اپنی کتاب 'سوشل ورک: این امپاورینگ پروفیشن' میں سوشل ورک کے افعال کو تفصیل میں بیان کیا ہے جس کی مدد سے ہم دیکھ سکتے ہیں کی کورونا سے لڑائی میں سوشل ورک کارکنان کس طرح مختلف سطحوں پر مداخلت کر سکتے ہیں۔ ڈیوبولیس اور میلے نے سوشل ورک کے تین اہم افعال - Consultancy، Resource Management اور Education کا ذکر کیا۔ کورونا بحران کے تناظر میں مددی خدمات کی فراہمی کے تحت ان تین افعال کی اہمیت کو ہم مندرجہ ذیل طریقے سے سمجھ سکتے ہیں:

☆ Consultancy یعنی مشاورت کی سرگرمیوں کے ذریعے سوشل ورک پیشہ وران متاثرہ افراد کے ساتھ مل کر انفرادی، فیملی اور معاشرتی سطحوں پر ہونے والی پریشانیوں اور نقصانات کی سمجھ بناتے ہیں اور انہیں حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہم نے دیکھا کہ کورونا وبا کی وجہ سے کووڈ-19 کی بیماری کے علاوہ بہت سارے مسائل سامنے آئے جیسے مہاجر مزدوروں کا در بہ در ہو جانا، بے روزگاری، فاقہ کشی، حاملہ خواتین اور بچوں کو صحیح وقت پر طبی مدد نہ مل پانا، اکیلے رہنے والے بزرگان کی دیکھ بھال اور طبی مسائل، ذہنی کشیدگی وغیرہ۔ اس تناظر میں دیکھا جائے تو سوشل ورکرز کو چاہیے کہ وہ کمیونٹی کے لیڈران و دیگر مقامی افراد سے رابطہ کر کے ویسے لوگوں کی شناخت کریں جو اس وبائی مرض کی وجہ سے یا تو سب سے زیادہ خطرے میں ہیں یا سب سے زیادہ متاثر ہوئے ہیں۔ جب سوشل ورک کارکنان مقامی لوگوں کے ساتھ مل کر مشورہ کریں گے اور ایک دوسرے سے معلومات، تجربات اور وسائل کو ساجھا کریں گے تو حالات کی بہتر سمجھ بن پائے گی اور موثر حکمت عملی بنانا آسان ہوگا۔ سوشل ورکرز ہر ممکن کوشش کریں کہ لوگوں کی اس طرح سے اختیار سازی (Empowerment) کی جائے کہ وہ خود کو اس خطرناک بیماری کی زد میں آنے سے محفوظ رکھ سکیں اور حفاظتی انتظامات کے ساتھ اپنی روزمرہ کی ضرورتوں کو پورا کر سکیں۔ مزید اس کے سوشل ورکرز مقامی سطح پر لوگوں کی ایسی جماعت کو تیار کریں اور ان کی تربیت کریں جو اپنے پڑوس، محلے اور معاشرے میں ضرورتمند لوگوں کی مدد کے لیے ہمیشہ تیار رہیں۔

اس کے علاوہ کنسلٹنسی کے تحت سوشل ورک کارکنان تجرباتی تحقیق (Empirical Researches) کے ذریعے لوگوں کو درپیش پریشانیوں کی صحیح وجوہات کا پتا لگا سکتے ہیں اور ان پالیسیز اور مداخلتی حکمت عملی کی تشکیل کی وکالت کر سکتے ہیں جس سے غریب اور محتاج طبقوں کو مالی مدد، غذا، وقت پر لازمی طبی سہولت اور سماجی و نفسیاتی مدد یعنی سائکو سوشل سپورٹ کی فراہمی ہو سکے اور عوامی زندگی میں مثبت تبدیلی لائی جا سکے۔

☆ Resource Management کا تعلق ضرورت مند، غریب اور کمزور افراد کے لیے ان اہم ذرائع اور وسائل کی رسائی کو ہموار بنانے سے ہے جو ان کی دسترس سے باہر ہیں۔ کورونا بحران سے متعلق پسماندگی پر بحث کرتے وقت ہم نے دیکھا کہ اس وبا کی وجہ سے ہنگامی حالات پیدا ہوئے اور کثیر تعداد میں لوگ ضروری سہولیات و وسائل سے محروم ہو گئے جس سے ان کی زندگی انتہائی دشوار ہو گئی۔ ان حالات سے نمٹنے اور ضروری خدمات کی فراہمی کی رسائی کے لیے سوشل ورکرز مناسب اداروں اور تنظیموں کی شناخت کر کے ضرورت مند لوگوں کا ان اداروں کے ساتھ ایک مضبوط ربط قائم کر سکتے ہیں تاکہ لوگوں کی ضرورتوں کو پورا کرنے اور بیماری سے بچاؤ کے لازمی انتظامات کیے جا سکیں۔ اس سمت میں سوشل ورکرز، سرکاری دفاتر، رضا کار اور مقامی اداروں (پنچایت یا میونسپلٹی) کے درمیان ایک موثر نیٹ ورک اور تال میل قائم کرنے میں ایک کیٹالسٹ کا کردار ادا کر سکتے ہیں تاکہ محرومین اور ضرورت مند افراد کو ضروری سروسز مہیا کرائی جا سکیں اور ان کی دشواریوں کو کم کیا جا سکے۔ یہاں غور کرنے والی بات یہ ہے کی کورونا وبا کے مد نظر ان بنیادی سروسز یعنی Primary Preventive Services پر سب سے زیادہ توجہ دینے کی ضرورت ہے جو اس مرض کے روک تھام میں مدد کر سکے۔ مزید اس کی ہر ممکن کوشش یہ ہونی چاہیے کی لوگوں کو صحیح وقت پر درکار طبی مدد مل سکے۔ اس ضمن میں مشرقی ممالک کے سوشل ورک کارکنان نے عمدہ مثال قائم کرتے ہوئے ٹیلی ہیلتھ خدمات کا ایک ایسا نظام تیار کیا ہے جس کی مدد سے کورونا و صحت عامہ سے متعلق دیگر مسائل کی نشاندہی کو آسان بنایا گیا ہے اور لوگوں کو بروقت خدمات فراہم کرائی جا رہی ہے (ڈومنیلی اور دیگر، 2020)۔ ہندوستان میں بھی اس قسم کے ماڈل ڈیولپ کیے جا سکتے ہیں تاکہ سہولیات سے متعلق گیپ کو ختم کیا جا سکے۔ کنسلٹنسی کے تحت جن مقامی گروپس کی تشکیل کی بات کی گئی ان کے ذریعے غریب اور محتاج گھروں کی پروفائل تیار کرنا اور کورونا سیفٹی کٹ کے علاوہ کھانے پینے و دیگر سہولیات مہیا کرانا کارگر پہل ہو سکتے ہیں۔ اس عزم میں سیلف ہیلپ گروپس (SHGs) کی شمولیت کو بھی یقینی بنانا ضروری ہے۔ مالی تنگی اور وسائل کی قلت سے نمٹنے میں SGHs مالی رسائی کا بہت اہم ذریعہ تو ہیں ہی ساتھ ہی یہ پریشر گروپ کی طرح بھی کام کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں جس کی مدد سے لوگوں کو خدمات فراہم کرنا آسان بنایا جا سکتا ہے۔

پسماندہ طبقات کے تحفظ اور ان کے لیے وسائل کی رسائی کو مساوی بنانے کے غرض سے سوشل ورکرز پالیسیز میں ضروری بدلاؤ یا نئی پالیسیز کی تشکیل کی وکالت یعنی advocacy کر سکتے ہیں۔

☆ Education یعنی تعلیمی سرگرمیوں کا تعلق مصدقہ معلومات کی فراہمی اور اختیار سازی سے ہے جو کورونا سے نمٹنے کے لیے بے حد ضروری ہے۔ سوشل ورکرز عوام کو کورونا وبا سے متعلق بیش قیمتی معلومات سے روشناس کرنے میں بڑا کردار ادا کر سکتے ہیں تاکہ لوگوں کو اس وبا سے محفوظ کرنے اور غیر ضروری خوف سے پیدا افراتفری کو روکنے میں مدد مل سکے۔ اس وقت 'روک تھام ہی بچاؤ ہے' کی حکمت عملی کو سب سے زیادہ اثر دار تسلیم کیا گیا ہے لہٰذا اس سمت میں سوشل ورکر لوگوں کو بیدار کرنے کے لیے سیکھنے سکھانے، تربیت سازی اور کمیونٹی موبلائزیشن کے طریق کار کا استعمال کر سکتے ہیں۔ تعلیمی سرگرمی کے تحت سوشل ورک کارکنان UNICEF اور WHO کی جانب سے فراہم کردہ رسک کمیونیکشن کی ہدایات کو عمل میں لاتے ہوئے تین سطحوں پر کام کر سکتے ہیں:

1. سوشل ورک پیشہ وران بالخصوص کورونا وائرس اور اس ہونے والی بیماری کووڈ-19 کے بارے تفصیلی اور مصدقہ معلومات کو جتنا زیادہ ممکن ہے لوگوں تک پہنچائیں۔ خاص طور پر اس مرض کی علامت اور پھیلنے کی صحیح وجوہات کے بارے میں لوگوں کو بیدار کریں۔ یہ امر واضح رہے کی معلومات مہیا کرانے کے ساتھ ساتھ حفاظتی قواعد کو صحیح طریقے سے عمل کا حصہ بنانے کے لیے لوگوں کی مسلسل تربیت کرنا بھی لازمی ہے۔ کورونا وبا، اس کی علامات، اس کے پھیلاؤ اور علاج کے حوالے سے کئی افواہیں اور غلط فہمیاں بھی عام ہوئیں جس کی وجہ سے لوگوں میں غیر ضروری خوف اور امتیازی سلوک میں اضافہ پایا گیا۔ ایک مرض سماجی دوری کا سبب اور غیر سائنسی طریقے کسی کے لیے جان لیوا نہ ثابت ہوں اس کے لیے یہ بہت ضروری ہے کہ لوگوں کو افواہوں سے بچایا جائے اور غلط فہمیوں کو دور کیا جائے۔ مذکورہ صورت حال کے مد نظر دنیا کے کئی ممالک میں سوشل ورکرز نے سماجی بیداری کو ان کی سب سے بڑی مہم تسلیم کیا اور مسلسل طور پر لوگوں کو کورونا کے حفاظتی قواعد کے تئیں بیدار کرنے میں جٹ گئے۔

2. ان حالات میں سوشل ورک کارکنان پسماندہ طبقات کو ذرائع و وسائل سے جڑی دشواریوں اور چیلنجز سے آگاہ کر سکتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی ان اہم معلومات کی فراہمی بھی کر سکتے ہیں جس کے ذریعے چیلنجز کا سامنا کیا جا سکے۔ مثال کے طور پر جو مہاجر مزدور اپنے گھروں کو واپس لوٹے اور روزی کمانے کا ذریعہ ختم ہو گیا ان کے لیے ضروری معلومات کی فراہمی جاب کارڈ کو حاصل کرنا آسان بنائے گی اور لوگ MANREGA جیسی اسکیم سے مستفید ہو پائیں گے۔ ایسی کئی فائدے مند معلومات لوگوں کو فوری طور پر مدد کرنے میں بے حد کارآمد ثابت ہو سکتی ہیں۔

3. کورونا وبا کی وجہ سے ذاتی، اجتماعی، معاشرتی، قومی اور عالمی سطح پر بیشمار مسائل مرتب ہوئے جن پر سنجیدہ تحقیق کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ تحقیق کئی اعتبار سے اہمیت رکھتی ہے۔ غریب، کمزور اور محتاج طبقے کی پسماندگی، حکومتی پالیسیز اور حکمت عملی، بچوں، بزرگوں، معذورین، خواتین خاص کر حاملہ عورتیں، پچھڑے سماجی طبقات، سیکس ورکرز وغیرہ سے متعلق مسائل، ذاتی، فیملی اور سماجی تعلقات، ایسے اہم پہلو ہیں جن پر سوشل ورک تحقیق، چینڈ مک اور اس سے متعلقہ عوامل کی سمجھ میں اضافہ کر سکتا ہے جو مستقبل میں ایسے حالات سے نمٹنے کے لیے پالیسی سازی اور حکمت عملی کو تیار کرنے میں بے حد موثر ثابت ہو سکتے ہیں۔

خلاصہ

بلاشبہ اس وبائی بحران نے اب تک عالمی سطح پر بہت تباہی مچائی ہے جو آج بھی جاری ہے۔ ایسے مشکل اور منفی ماحول میں سوشل ورک پریکٹس کے فلسفے اور اس کے اہداف سے مثبت سوچ اور مضبوط حوصلے کی ترغیب ملتی ہے۔ اس پیشہ کے اقدار اور اخلاقی ضابطے سماجی انصاف اور انسانی حقوق کے بنیادی مفہوم سے منسلک ہیں جو سوشل ورک پیشہ وران میں تنقیدی شعور کو بیدار کرتے ہیں۔ ہر صورت میں لوگوں کی عزت نفس اور وقار کی قدر کرنا سوشل ورک تربیت کا اہم جز ہے جس سے کسی بھی حال میں سمجھوتہ گوارا نہیں اور یہی فطرت کورونا بحران سے نمٹنے میں سوشل ورک مداخلت کو اہم بنا دیتی ہے۔ سوشل ورک پیشہ وران ہر ممکن کوشش کرتے ہیں کہ ضرورت مند لوگوں کو مناسب خدمات کی فراہمی ہموار ہو سکے۔ کورونا بحران کے دوران سوشل ورک پریکٹس کی اہمیت اس وجہ سے بھی قابل ذکر ہے کیونکہ یہ پسماندہ اور کمزور طبقے کے تحفظ و بقا اور فلاح میں بڑھ چڑھ کر حمایت اور وکالت کرتا ہے جس سے امتیازی سلوک پر پابندی لگانے اور خدمات کی فراہمی کو مساوی بنانے میں مدد ملے گی۔

■

Mohd Asrar Alam
Asst Professor, Dept of Social Work
Maulana Azad National Urdu University
Hyderabad- 500032 (Telangana)

ورک شیٹ کو سجانا

Enhancing Worksheet

مشمولات کو ایلائن کرنا(Aligning Contents)

آپ کسی بھی سیل یا رینج میں بھرے گئے مشمولات (مواد) کو اپنی آسانی کے مطابق کسی بھی سیدھ میں لا سکتے ہیں۔ General فارمیٹ میں عام متن(Text) ڈاٹا کو بائیں طرف سے اور اعداد کو دائیں طرف سے لگا کر دکھایا جاتا ہے۔ آپ چاہیں، تو اسے بدل سکتے ہیں۔ اس کے لیے Home ٹیب کے Alignment حصہ میں متعدد بٹن دستیاب ہیں۔ آپ سیلوں کو چن کر اپنی خواہش کے مطابق ان بٹنوں کو کلک کرکے لاگو کر سکتے ہیں۔

ان کے علاوہ دیگر کئی آپشن Format Cells ڈائیلاگ باکس کی 'Alignment' ٹیب شیٹ میں موجود ہیں۔ ان آپشنز کی مشق خود کیجیے۔

متن یا ٹیکسٹ کو کئی کالموں کے درمیان لگانا (Centering Text Across Columns)

کئی بار ہم چاہتے ہیں کہ ٹیکسٹ یا سرخی کئی کالموں میں اس طرح قائم ہو کہ وہ متن کے بیچوں بیچ دکھائی دے۔ یہ کام کالم چوڑائیاں گھٹا- بڑھا کر بھی اچھی طرح نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے لیے خاص ہدایت کا استعمال کرنا پڑتا ہے۔ یہ ہدایت 'Merge and Center' بٹن کے طور پر Home ٹیب کے Alignment حصہ میں موجود ہے۔ آپ کسی رینج کو چن کر اس کے سب سے پہلے، یعنی ایکٹو سیل میں بھرے گئے ٹیکسٹ کو اس بٹن کے ذریعے رینج کے بیچوں بیچ یا بائیں طرف سیٹ کر سکتے ہیں۔ یہ ہدایت 'Format Cells' کے ڈائیلاگ باکس کی 'Alignement' ٹیب شیٹ میں بھی دستیاب ہے۔

اس سہولت کا ٹھیک ٹھیک استعمال کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ ٹیکسٹ چنی ہوئی رینج کے ایکٹو سیل میں بھرا ہو اور دیگر سبھی سیل خالی ہوں۔ اگر باقی سیل خالی نہیں ہوں گے، تو ان کا ڈاٹا ختم ہو جائے گا۔

مشق E-4 (Exereise E-)

مشق E-3 میں بنائی گئی تصویر E-4.8 کی ورک شیٹ کو کھولیے۔ ہم اس میں اوپر کی قطاروں میں دی گئی سرخیوں کو کالموں A سے F کے درمیان سیٹ کریں گے، کیونکہ ہماری ٹیبل انھیں کالموں میں ہے۔ اس کے لیے درج ذیل کام کیجیے۔

Print_Titles

	A	B	C	D	E	F	G	H
1	Last Name	Sales	Country	Quarter				
2	Smith	$16,753.00	UK	Qtr 3				
3	Johnson	$14,808.00	USA	Qtr 4				
4	Williams	$10,644.00	UK	Qtr 2				
5	Jones	$1,390.00	USA	Qtr 3				
6	Brown	$4,865.00	USA	Qtr 4				
7	Williams	$12,438.00	UK	Qtr 1				
8	Johnson	$9,339.00	UK	Qtr 2				
9	Smith	$18,919.00	USA	Qtr 3				
10	Jones	$9,213.00	USA	Qtr 4				
11	Jones	$7,433.00	UK	Qtr 1				
12	Brown	$3,255.00	USA	Qtr 2				

تصویر E-4.9: فونٹ ٹھیک کرنے کے بعد ورک شیٹ

1. رینج A1:F1 کو چنیے، جس میں A1 ایکٹو سیل ہوگا۔ (اسی سیل میں ڈاٹا بھرا ہے)
2. Alignment حصہ کے Merge & Center بٹن کے تیر کے نشان کو کلک کیجیے۔ اس سے ایک پل-ڈاؤن مینو کھلے گا۔ مینو میں Merge & Center آپشن چنیے۔ ایسا کرتے ہی آپ دیکھیں گے کہ وہ ٹیکسٹ سیلوں A1 سے F1 تک کے بیچوں بیچ سیٹ ہوگیا ہے۔
3. اگر آپ Merge Across ہدایت دیتے، تو ٹیکسٹ بائیں طرف سیٹ ہو جاتا۔ Merge Cells ہدایت دینے پر چنے ہوئے سیل ضم ہو جاتے ہیں اور Unmerge Cells ہدایت دینے پر ضم سیل پرانی حالت میں آجاتے ہیں۔
4. اب سیل C2 میں بھرے New Delhi ٹیکسٹ کو رینج A2: F2 کے درمیان سیٹ کیجیے اور سیل B4 کے ڈاٹا کو رینج A4: B4 کے درمیان سیٹ کیجیے۔

اس وقت آپ کی ورک شیٹ تصویر E-4.9 کی طرح دکھائی دے رہی ہوگی، جس میں سبھی سرخیاں ٹیبل کے ٹھیک اوپر بیچوں بیچ دکھائی دے رہی ہیں۔

بارڈر لائن کھینچنا (Drawing Borders)

ورک شیٹ کے کسی حصہ کو ابھارنے، دوسرے حصوں سے الگ دکھانے، اجماع (Totals) اور ذیلی اجماع (Subtotals) کو خاص طور پر دکھانے یا صرف ورک شیٹ میں بنائی گئی کسی ٹیبل کی خوبصورتی بڑھانے کے لیے آپ سیلوں کے اوپر- نیچے، دائیں- بائیں بارڈر لائن بھی کھینچ سکتے ہیں۔ اس کام کے لیے ہم Home ٹیب کے Font حصہ میں Bottom Border بٹن کا استعمال کرتے ہیں۔ اس کا طریقہ یوں ہے:

تصویر E-4.10 بارڈر لائنوں کی پٹی

1. اس سیل یا رینج کو چن لیجیے، جس کی بارڈر لائن آپ کھینچنا چاہتے ہیں۔
2. فارمیٹنگ ٹول بار میں Bottom Border بٹن کے تیر کر کلک کیجیے۔ اس سے آپ کی اسکرین پر تصویر E-4.10 کی طرح بارڈر لائنوں کی پٹی (Borders Palette) کھل جائے گی، جس میں سبھی دستیاب بٹن دیے گئے ہوتے ہیں۔
3. بارڈر لائن پٹی میں اپنی مطلوبہ بارڈر لائن اسٹائل کے بٹن کو کلک کیجیے۔

آپ چاہیں، تو انھیں سیلوں پر ایک سے زیادہ اسٹائلوں کو بھی لاگو کر سکتے ہیں، جس سے ان سیلوں پر دونوں اسٹائلوں کا مجموعی اثر پڑے گا۔ اگر آپ بارڈر لائن پٹی میں دستیاب اسٹائلوں سے مطمئن نہیں ہیں، تو آپ اپنا الگ اسٹائل بھی بنا سکتے ہیں اور من چاہی بارڈر لائن کھینچ سکتے ہیں۔ اس میں 'Format Cells' ڈائیلاگ باکس کی 'Border' ٹیب شیٹ کا استعمال کیا جاتا ہے، جو

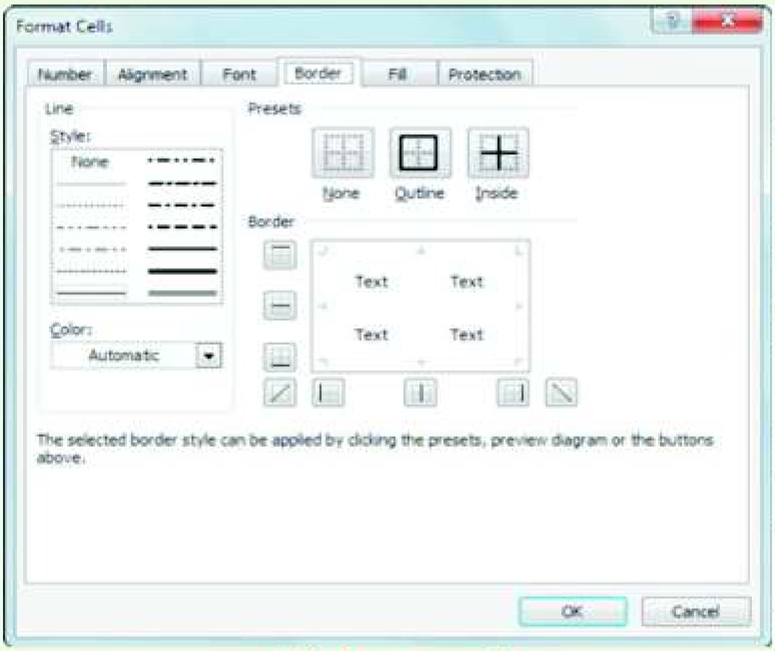

تصویر E-4.10 بارڈر لائنوں کی پٹی

تصویر E-4.11 میں دکھائی گئی ہے۔

جن سیلوں کی بارڈر لائنیں آپ بنانا چاہتے ہیں، انھیں چن کر اس ڈائیلاگ باکس کو کھولیے اور Border ٹیب شیٹ میں آئیے۔ اس ٹیب شیٹ میں دیگر کئی قسم کی بارڈر لائنوں کے ساتھ ترچھی (Diagonal) لائنیں کھینچنے کی سہولت بھی دستیاب ہے۔ اتنا ہی نہیں Style باکس میں آپ لائنوں کی شکل اور موٹائی بھی چن سکتے ہیں۔ آپ کے ذریعے بنائی گئی بارڈر لائنیں بیچ کے باکس میں دکھائی دیتی ہیں۔ مطمئن ہونے پر 'OK' بٹن کو کلک کیجیے۔ اس سے وہ اسٹائل چنے ہوئے سیلوں پر لاگو ہو جائے گا۔

مشق E-5 (Exereise E-5):

بارڈر لائنوں کی مشق کرنے کے لیے مشق E-4 میں بنائی گئی تصویر E-4.9 کی ورک شیٹ کو کھولیے۔ اس میں ہم حاصل کیے گئے نمبرات کی جدول میں بارڈر لائنیں بنائیں گے۔ اس کے لیے درج ذیل کام کیجیے۔

1. پوری جدول (رینج A9:F16) کو چن کر اس کی چاروں باہری بارڈر لائن کھینچیے۔
2. رینج A9:F9، یعنی سرخی قطار (Header) کو چن کر اس کے نیچے کی بارڈر لائن بھی کھینچ دیجیے۔ اس سے وہ قطار اوپر نیچے دونوں طرف سے بارڈر لائن میں بندھ جائے گی۔ اس قطار کو بولڈ بھی کر دیجیے۔
3. اس طرح 'Total' والی قطار کی اوپری بارڈر لائن کھینچیے اور اسے بھی بولڈ کیجیے۔
4. رینج A9:F9 میں کالموں کی کھڑی بارڈر لائنیں بنانے کے لیے اس رینج کو چن کر 'Format' مینو میں 'Format Cells' ہدایت دیجیے۔ اس سے Format Cells کا ڈائیلاگ باکس کھلے گا۔ اس ڈائیلاگ باکس کی 'Border' ٹیب شیٹ کو کھولیے۔ اس ٹیب شیٹ میں صرف بیچ کی کھڑی بارڈر لائن کے اسٹائل کو کلک کیجیے، جیسا کہ تصویر E-4.13 میں دکھایا گیا ہے۔ اب OK بٹن کو کلک کرتے ہی ٹیبل میں سبھی کالموں کے درمیان لائنیں بن جائیں گی۔ اس وقت آپ کی ورک شیٹ تصویر E-4.13 کی طرح دکھائی دے رہی ہوگی۔

■

بہ شکریہ: ریپڈیکس کمپیوٹر کورس (ونڈوز 7 اور 8 / آفس 2007)، سنہ اشاعت: 2015، ناشر: یونی کورن بکس F-2/16، انصاری روڈ، دریا گنج، نئی دہلی 2
فون نمبر: 011-23275434,23262683

تبصرہ و تعارف

راسخ عظیم آبادی

مصنف: ثاقب فریدی

صفحات: 422، قیمت: 200 روپے، سنہ اشاعت: 2020

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

مبصر: حقانی القاسمی، شاہین باغ، نئی دہلی

کسی بھی علمی و ادبی اشاعتی ادارے کے معیار اور وقار کا اندازہ اس کی مطبوعات سے بھی لگایا جاتا ہے۔ موضوعات کا انتخاب اس میں خاص اہمیت کا حامل ہوتا ہے کہ جن موضوعات پر کتابیں شائع کی گئی ہیں۔ موجودہ دور میں اہمیت اور معنویت کیا ہے اور ان کتابوں کی علمی معتبریت اور حوالہ جاتی حیثیت ہے یا نہیں۔ مقام شکر ہے کہ قومی اردو کونسل نے موضوعاتی اعتبار سے بہت سی اہم کتابیں شائع کی ہیں جن کی دستاویزی، حوالہ جاتی اور علمی و ادبی حیثیت بھی ہے۔ قومی اردو کونسل کا اشاعتی کردار قابل ستائش ہے کہ بہت سی نئی جہتوں پر مبنی کتابیں اس ادارے سے شائع ہوئی ہیں۔ راسخ عظیم آبادی پر یہ کتاب بھی اسی نوعیت کی ہے۔

راسخ عظیم آبادی کی شخصیت بہت عظیم ہے مگر المیہ یہ ہے کہ ان کے حوالے سے کوئی ایسا مبسوط اور مربوط تنقیدی یا تحقیقی مقالہ شائع نہیں ہوا ہے جس میں ان کی شخصیت و فن کے تمام پہلوؤں کا بالاستیعاب احاطہ کیا گیا ہو۔ راسخ عظیم آبادی پر پروفیسر لطف الرحمٰن، حمید عظیم آبادی، ڈاکٹر ممتاز احمد، ڈاکٹر شکیب ایاز کی کتابیں موجود ہیں اور کچھ مقالے بھی اشاعت پذیر ہو چکے ہیں۔ اس کے باوجود راسخ عظیم آبادی جیسی متنوع شخصیت پر ایک کتاب کی ضرورت تھی جس کی تکمیل ثاقب فریدی جیسے نوجوان ناقد اور محقق نے کی ہے۔

'راسخ عظیم آبادی کلاسکیت، شعریت اور انفرادیت' کے عنوان سے شائع یہ کتاب 11 ابواب پر محیط ہے۔ پہلے باب میں 'راسخ کے سوانحی حالات' پر مبسوط گفتگو کی گئی ہے اور اس ذیل میں پیدائش، خاندان، اساتذہ، اسفار اور تلامذہ کا ذکر کیا گیا ہے۔

یہ باب اس اعتبار سے اہم ہے کہ اس میں تذکروں کے حوالے سے ان کی شخصیت کے کچھ نقوش پیش کیے گئے ہیں جن کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اتنی عظیم شخصیت کے تعلق سے تذکروں میں بھی عدم توجہی برتی گئی ہے۔ حتیٰ کہ ان کے معاصرین نے جو تذکرے مرتب کیے ان میں بھی راسخ کو نظر انداز کیا گیا۔ نواب علی ابراہیم خاں نے 'گلزار ابراہیم' میں ہم وطن معاصر ہونے کے باوجود ان کا ذکر نہیں کیا۔ اسی طرح شورش جو راسخ کے ہم وطن ہیں انھوں نے بھی اپنے تذکرے میں اتنا لکھا کہ وہ نو مشق شاعر ہیں۔ 'تذکرہ گلشن ہند' میں بھی راسخ کا ذکر موجود نہیں ہے مگر گلشن بے خزاں (قطب الدین باطن)، گلشن بے خار (نواب مصطفی خاں شیفتہ)، تذکرہ خوش معرکہ زیبا (سعادت خاں ناصر)، تذکرہ عشقی (شیخ محمد وجیہ الدین عشقی عظیم آبادی)، مدائح الشعرا (عنایت حسین خان بہادر مجبور)، تذکرہ سخن شعرا (عبدالغفور نساخ)، خمخانہ جاوید (لالہ سری رام)، گل رعنا (مولوی عبدالحی)، آب حیات (مولانا محمد حسین آزاد)، جواہر سخن (مبین کیفی چریا کوٹی)، یادگار شعرا (طفیل احمد) میں ان کا اجمالی ذکر ہے۔ بہار میں شعر و ادب سے متعلق لکھی گئی کچھ کتابوں میں ان کا ذکر ضرور شامل ہے مگر راسخ کی زندگی کے بارے میں مکمل معلومات نہیں مل پاتی ہے۔ ثاقب فریدی نے اس باب میں ان کے سوانحی کوائف کے ساتھ ساتھ ان کے اساتذہ اور تلامذہ کا بطور خاص ذکر کیا ہے۔ اساتذہ میں شاہ رکن الدین عشق، مرزا شرر، نور الحق طپاں پھلواروی، مرزا سودا وغیرہ کے نام ملتے ہیں لیکن ثاقب فریدی نے لکھا ہے کہ صرف مرزا فدوی اور میر ہی راسخ کے اساتذہ ہیں۔ تلامذہ کے ذیل میں انھوں نے 8 نام لکھے ہیں جن سے شاید زیادہ لوگ واقف نہیں ہیں۔

دوسرے باب کا عنوان 'راسخ کے عہد میں عظیم آباد' ہے۔ اس میں انھوں نے ایسے 28 حضرات کا ذکر کیا ہے جو راسخ کی پیدائش کے وقت زندہ تھے یا جنھوں نے راسخ کی وفات کے وقت تک شعر گوئی کا آغاز کر دیا تھا۔ ان میں میر محمد باقر حزیں، مہاراجہ

رام نرائن موزوں، اشرف علی خاں فغاں، ہیبت قلی خاں حسرت، محمد روشن جوشش، نواب علی خاں ابراہیم خلیل، مہاراجہ کلیان سنگھ عاشق وغیرہ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ انھوں نے ان تمام افراد کے شخصی اور فنی امتیازات پر بھی اختصار سے گفتگو کی ہے جس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ عظیم آباد میں اس وقت شعروادب کی ایک خوبصورت کہکشاں تھی جن میں کئی بڑے اہم نام تھے مگر ایک بڑا طبقہ ان کے کارناموں سے ابھی بھی ناواقف ہے۔

تیسرا باب 'راسخ کی غزل میں تصوف' ہے جس میں ثاقب فریدی نے لکھا ہے کہ کہ راسخ کی غزل میں عشق حقیقی اور عشق مجازی کے مضامین ہیں لیکن عشق مجازی کے بالمقابل عشق حقیقی کے مضامین کی کثرت ہے۔ انھوں نے اس ذیل میں ان کے کلام کے نمونے دیے ہیں اور ان کی تشریحات بھی پیش کی ہیں جن سے ثاقب کی شعرفہمی کا بھی اندازہ ہوتا ہے مگر اس طرح کی تشریحات کبھی کبھی قاری پر گراں گزرتی ہیں اور براہِ راست شاعری سے لطف حاصل کرنے سے قاری محروم رہ جاتا ہے۔ وہ انھی معنیاتی جہتوں میں الجھ جاتا ہے جو ایک شارح کے ذہن کی زائیدہ ہوتی ہیں۔

چوتھے باب 'راسخ کی غزل میں یاس اور قنوطیت' کے حوالے سے ثاقب نے مبسوط گفتگو کی ہے اور یہ واضح کیا ہے کہ راسخ کے پیش روشعرا کے یہاں بھی قنوطیت کے مضامین ملتے ہیں اور خاص طور پر میر تو ایک قنوطی شاعر کی حیثیت سے ہی مشہور ہیں۔ اس باب میں انھوں نے مختلف ذیلی عنوانات کے تحت کلام راسخ سے ایسے اشعار کا انتخاب کیا ہے جس سے یاس اور قنوطیت کی تصویریں سامنے آتی ہیں اور یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس مضمون کو راسخ نے عمدہ انداز میں پیش کیا ہے۔ یہاں بھی انھوں نے کلامِ راسخ کی تشریح کی ہے اور ان کے شعری محاسن پر نظر بھی ڈالی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ثاقب فریدی کو علم بیان و بدیع سے گہری دلچسپی ہے۔ اس لیے اس زاویے سے بھی انھوں نے شاعری کو پرکھنے کی کوشش کی ہے۔

پانچواں باب 'راسخ کی غزل میں عشق' کے عنوان سے ہے۔ اس میں مصنف نے پہلے ہی جملے میں یہ واضح کردیا ہے کہ راسخ عظیم آبادی کی غزل کا عاشق میر کی غزل کے عاشق سے مشابہ ہے اور یہ بھی تحریر کیا ہے کہ مضمون آفرینی اور معنی آفرینی کی سطح پر میر اور راسخ میں فرق کیا جاسکتا ہے لیکن دونوں کی شعریات ایک ہے۔ تصورِ عشق کے حوالے سے ثاقب فریدی نے راسخ کے کلام کا انتخاب بھی پیش کیا ہے اور ان کی تشریح بھی کی ہے۔ خاص طور پر عشق کے جو اہم موضوعات ہیں مثلاً سوزشِ عشق، ہجر و فراق، آہ و نالہ، گریہ وزاری، ضعف و ناتوانی ان عنوانات کے تحت بھی انھوں نے کلامِ راسخ سے مثالیں پیش کی ہیں۔ 'تصورِ عشق' کے تعلق سے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

گرمی سے تپِ دل کی نہ ہم جل بجھے اک بار
اس آگ نے رہ رہ کے ہمیں آہ جلایا

ہوتی جو جسم و جاں میں جدائی تو سہل تھی
اس رشکِ مہ سے ہم کو فلک کیوں جدا کیا

صبح تک رات اس قیامت کا سا ہنگامہ رہا
میرے نالوں سے بہت رنجیدہ ہمسائے ہوئے

گزرا تھا واں سے گریہ کناں میں برنگ ابر
دامان دشت قیس کا اک عمر نم رہا

باب ششم 'راسخ کی غزل کا معشوق' کے تحت مصنف نے معشوق کے حسن، معشوق کے چشم و ابرو، معشوق کے گیسو، معشوق کی نزاکت، معشوق کی نگاہ، معشوق کا خرام، معشوق کی ادا، معشوق کی بے التفاتی، معشوق کا ظلم، رقیب وغیرہ ذیلی عنوانات کے تحت بہت اچھی گفتگو کی ہے اور کلام راسخ سے ان تمام عنوانات پر شعری شواہد بھی پیش کیے ہیں۔ یہ باب بہت اہم ہے کہ غزل کے معشوق کے حوالے سے ان سے قبل اور ان کے بعد بھی لکھا جاتا رہا ہے مگر راسخ کی غزل کا معشوق دوسرے شاعروں سے الگ ہے۔ معشوق کے سراپے پر یہ شعر دیکھیے۔

دیوانہ اب ایسے ہی پری چہرے کا ہوں میں
جس کی کفِ پا چہرہ زیبائے پری ہے

گیسو سے متعلق ایک شعر ملاحظہ فرمائیں۔

ہر شکن پر اس کے گیسو کا ہے اک عالم جدا
جان دیتے ہیں ہزاروں مرغِ دل اس دام کا

باب ہفتم کا عنوان ہے 'راسخ کی غزل کی صنعتیں'۔ یہ باب اس اعتبار سے اہمیت کا حامل ہے کہ اس میں ثاقب فریدی نے راسخ کی غزل میں تلمیحات، تعلی، تشبیہ، مبالغہ، استعارہ، زبان و بیان کے تعلق سے معروضی گفتگو کی ہے اور یہ واضح کیا ہے کہ راسخ کی غزل میں جو تلمیحات ہیں ان کا رشتہ بنیادی طور پر تصوف سے ہے۔ شیریں وکوہ کن، قیس و لیلیٰ، حضرت آدم، گریہ یعقوب، قارون، دارا، سکندر، فریدوں، جمشید وغیرہ جیسی تلمیحات ان کے یہاں موجود ہیں۔ تلمیح کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

کہتے ہیں مور نے وہ بار اٹھایا جس کو
دوش پر عرش کے رکھتے تو نہ حامل ہوتا

عاشقی میں گریہ یعقوب تب تھا معتبر
ڈوب جاتا اس کا جب بیت حزن کنعاں سمیت

اسی طرح انھوں نے تعلی کے مضامین بھی باندھے ہیں اور اس طرح کے شعر بھی کہے ہیں۔

سخن سنجان صاحب دل ہی قدر اس کی سمجھتے ہیں
بدل ہے یہ میرا دیوان نظیری کا

وہ بزم شعر کیا جس میں نہ آویں حضرت راسخ
کہ آنا ان کا آنا ہے شفائی کا نظیری کا

اور اس طرح دوسرے عنوانات کے تحت بھی انھوں نے بڑی اچھی گفتگو کی ہے۔

باب ہشتم 'راسخ اور میر' اس اعتبار سے قیمتی ہے کہ میر کو راسخ کا استاد بھی کہا جاتا ہے اور ان کی شاعری پر ان کے اثرات بھی بہت زیادہ ہیں۔ میر کی استادی کے تعلق سے کئی روایتیں ہیں۔ میر سے شرف تلمذ حاصل ہے یا نہیں۔ یہ بھی ایک بحث طلب موضوع ہے مگر اتنا طے ہے کہ راسخ نے کلام میر سے استفادہ کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ راسخ کی غزلوں میں میر کا رنگ نظر آتا ہے۔ ثاقب فریدی نے اس باب میں زمین میر میں راسخ کی غزلیہ شاعری کے بہت عمدہ نمونے پیش کیے ہیں جن سے یہ اندازہ لگانا آسان ہو جاتا ہے کہ میر سے راسخ بہت قریب ہیں۔

باب نہم 'راسخ کی قصیدہ نگاری' میں راسخ عظیم آبادی کے قصائد کا ذکر ہے۔ گو کہ راسخ کی بنیادی شناخت غزل گو اور مثنوی نگار کی حیثیت سے ہے، مگر قصیدوں میں بھی انھوں نے طبع آزمائی کی ہے خاص طور پر ان کے دیوان میں کئی مذہبی قصیدے ہیں اور کچھ درباری قصیدے بھی اور ان کے قصیدوں میں بھی غزل کی طرح روانی ہے مگر کہیں کہیں قصیدے کی زمین کی وجہ سے زبان ثقیل ہوگئی ہے۔

باب دہم 'راسخ کی مثنویاں' میں ثاقب فریدی نے راسخ عظیم آبادی کی مثنویوں

کے حوالے سے گفتگو کی ہے اور ان کی مثنویوں کے موضوعات کو چار حصوں میں تقسیم کیا ہے: عشقیہ، ماحول و معاشرت، مدحیہ، پند و نصائح۔ ثاقب نے راسخ اور میر کی مثنویوں میں مماثلت کے ساتھ ساتھ بنیادی فرق کی بھی وضاحت کی ہے۔ جہاں تک راسخ کی مثنویوں کا سوال ہے تو ان کی مثنویوں کے حوالے سے بہت اہم تحقیقی کام ہو چکے ہیں۔ خاص طور پر ڈاکٹر ممتاز احمد نے 'مثنویات راسخ' کے عنوان سے ڈاکٹریٹ کا مقالہ لکھا جس میں انھوں نے ان کی مثنویوں کا جائزہ لیا ہے۔ راسخ کی جو مثنویاں بہت مشہور ہیں ان میں سبیل نجات، کشش عشق، نیرنگ محبت، جذب عشق، شرح حال، عابد کہ دو زوجہ داشت، حسن و عشق، ناز و نیاز، اعجاز عشق، نور الانظار، گنجینۂ حسن، مرأت الجمال، مکتوب الشوق شامل ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے مدحیہ مثنویاں بھی لکھی ہیں جن پر ثاقب فریدی نے مبسوط نظر ڈالی ہے اور ان مثنویوں کے فنی اور اسلوبی امتیازات وغیرہ بھی بیان کیے ہیں۔

باب یازدہم 'راسخ کی مرثیہ نگاری' ہے۔ ان کے دیوان میں بقول 'ثاقب فریدی' چار مرثیے شامل ہیں جن میں تین مرثیے مسدس کے فارم میں ہیں اور ایک مرثیہ مثنوی کی ہیئت میں لکھا گیا ہے۔ مصنف نے ان کی مرثیہ نگاری پر بھی عمدہ گفتگو کی ہے۔

راسخ عظیم آبادی جیسی شخصیت پر ثاقب فریدی کی یہ کتاب اس لحاظ سے بہت اہم قرار پائے گی کہ یہ متن اساس مطالعے پر مرکوز ہے۔ انھوں نے راسخ عظیم آبادی کے تخلیقی متون سے براہِ راست رشتہ قائم کرکے راسخ کی شاعری کی انفرادیت و امتیازات کے نقوش تلاش کیے ہیں اور اس تنقیدی اور تحقیقی مطالعے میں انھوں نے تجزیاتی طریقہ کار اختیار کیا ہے۔ راسخ عظیم آبادی پر یہ قیمتی اور مفید کتاب جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی کے ایک نوجوان اسکالر کی علمی اور تحقیقی ریاضت کی ایک عمدہ مثال ہے۔

حیاتیاتی تنوع اور ماحولیات کے مسائل

مصنف: پروفیسر حافظ شائق احمد یحییٰ

صفحات: 150، قیمت: 90 روپے، سنہ اشاعت: 2020

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

مبصر: انوری خاتون

N-139/B1، قادری مسجد گلی، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی

دنیا کے تمام مذاہب کے بنیادی اصول میں نہ صرف انسانوں کے درمیان ہم آہنگی اور بقائے باہم کا درس دیا گیا ہے، بلکہ خدا کی تمام مخلوقات بشمول نباتات، حیوانات، طیور، جمادات، یہاں تک کہ حشرات الارض کے ساتھ بھی حسن سلوک اور رواداری کا حکم ہے۔ 'جیو اور جینے دو' کا بنیادی تصور ہی اس دنیا کی بقا اور فلاح کا ضامن ہے۔ اس فطرت سے پورے طور پر لطف اندوز ہونے کے لیے اس کی موزونیت کے محور کے گرد ہی رقص کرنا ہوگا۔ اگر قدرت کے عطیات اور ہمارے اسراف کے درمیان اعتدال قائم نہیں رہ سکا تو خدا کی یہ عظیم دنیا قابل رہائش نہیں رہ سکے گی۔

پروفیسر یحییٰ نے تعلیم کے میدان میں اپنے لیے بنیادی طور پر Ornithology یعنی 'علم طیور' و دیگر حیوانات کا مطالعہ خصوصی طور پر کیا اور اس بارے میں 1980 میں بمبئی یونیورسٹی کے ڈاکٹر سالم علی مرحوم کی نگرانی میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ اس کے بعد انھوں نے بمبئی نیچرل ہسٹری سوسائٹی (BNHS) کے مختلف پروجیکٹ کے تحت فیلڈ بایولوجسٹ کی حیثیت سے کام کیا۔

پروفیسر یحییٰ اے ایم یو کے شعبۂ وائلڈ لائف سائنس کے بانی اساتذہ میں سے ہیں۔ ان کی انگریزی اور اردو زبانوں میں متعدد کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ 'اسلامی تناظر میں وائلڈ لائف تحفظ کی اہمیت' ایک نہایت اہم کتاب ہے جس میں قرآن پاک کی 80 آیتوں اور بے شمار احادیث نبویؐ کے حوالے سے ماحولیات اور فطرت کی رنگارنگی کا احاطہ کیا گیا ہے۔ اس کی افادیت اور مقبولیت کے بعد ہی پروفیسر یحییٰ نے دنیا کے اہم مذاہب میں حیاتیاتی تنوع کے موضوع کی چھان پھٹک کرکے اس کتاب کو قارئین کے حوالے کیا ہے۔ اس میں مذہب اسلام کے علاوہ دیگر اہم مذاہب میں ماحولیات و حیاتیاتی تنوع کے مطالعے سے عالمی صورت حال کا جائزہ لیا گیا ہے جو آج کی اہم ترین ضرورت ہے۔ اس کی ہمہ گیر افادیت سے انکار کی کوئی گنجائش نہیں۔

دنیا کے تمام مذاہب پر امن اور اعتدال پسند طریقۂ حیات اختیار کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔ ظاہری طور سے اسلامی تعلیمات اور فلسفۂ فطرت کے تحفظ کے تصور سے گہرائی تک مربوط و مبسوط ہیں۔ قرآن پاک میں مختلف آیات کے ذریعے فطرت کے توازن کو برقرار رکھنے پر بار بار زور دیا گیا ہے۔ تضییع وسائل سے باز رہنے، نیز انسانوں کے علاوہ دوسرے حیوانات کے ساتھ بھی رواداری بحال کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔

ہمارے سیارے زمین کا پائیدار وجود بڑی حد تک متوازن نظام اور صحت مند ماحول پر منحصر ہے۔ تاہم قدرتی وسائل کے مسلسل استحصال کے دوران ماحولیاتی تباہی ہوتی رہی ہے۔ جس کی وجہ سے تمام دنیا میں حیاتیاتی تنوع متاثر ہوا ہے اس طرح کے نقصانات کی کچھ واضح وجوہات جینیاتی آلودگی، ہابریڈائزیشن گلوبل وارمنگ، اوزون پرت میں شگاف، گرین ہاؤس اثر کی کمی وغیرہ ہیں۔ لہٰذا ان حالات کو بہتر بنانے کی سخت ضرورت ہے۔ بہت سے افراد اور تنظیموں نے حیاتیاتی تنوع کے تحفظ کی اہمیت کو محسوس کیا ہے۔ عام لوگ حیاتیاتی تنوع کے تحفظ کی اہمیت فوری طور پر نہیں سمجھیں گے اور موثر پالیسیوں پر دھیان نہیں دیں گے تو شاید بعد میں ایسی کوششیں کامیاب نہیں ہوسکتی ہیں۔ اگر حیاتیاتی تنوع کے استحصال کا موجودہ رجحان جاری رہا تو اس سیارے سے زمین کا مستقبل بہت جلد خطرے میں پڑ جائے گا۔ اس لیے ہماری بڑی ذمے داری ہے کہ اپنا احتساب بھی کرتے رہیں تاکہ قدرتی وسائل کے بے جا استعمال سے ماحولیاتی بحران کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ یہ کتاب خاص طور پر ایکولوجی کے طلبا، محققین وغیرہ کے لیے مفید ثابت ہوگی۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے ادبیات، انسائیکلوپیڈیا لغات، تاریخ، تعلیم و تدریس، زبان و لسانیات، سائنس، تکنیک اور جغرافیہ، سیاست، صحافت، طب و معالجات، فلسفہ، فنون لطیفہ، قانون، کتب خانہ داری، معاشیات، تجارت، نفسیات، بچوں کا ادب اور دیگر موضوعات پر بڑی اہم کتابیں شائع کی ہیں. کونسل کی تمام مطبوعات درج ذیل پتہ پر حاصل کی جاسکتی ہیں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی–110066

NCPUL, West Block -8, Wing No. 7, R.K. Puram, New Delhi 110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

تحقیق و تنقید

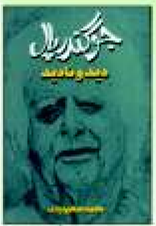

جوگندر پال دید و نادید

مصنف: حمید سہروردی
صفحات: 260، قیمت: 300 روپے، سنہ اشاعت: 2020
ناشر: اپلائڈ بکس، نئی دہلی
مبصر: محمد شہاب الدین رحمانی قاسمی، ہلمہ ہاؤس، دہلی

اردو ادب میں جوگندر پال ایک جانا پہچانا نام ہے۔ انہوں نے اردو ادب کو بہت کچھ دیا ہے۔ وہ ایک ایسے تخلیق کار تھے۔ جو ادب کو نئے نئے زاویے سے دیکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ جوگندر پال نے افسانے، افسانچے، ناول، ناولٹ، ڈرامے یہاں تک کہ غیر افسانوی نثر میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ ان کے یہاں بے شمار موضوعات فسادات اور ہجرت وغیرہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ پال نے افسانے میں ہندوستانی تہذیب و ثقافت، قدیم اور جدید دنیا کو شعوری، لاشعوری اور تحت الشعوری انداز میں پیش کیا ہے۔ پال کے افسانوں، ناولوں، ناولٹوں، افسانچوں اور دیگر تحریروں کے تراجم نہ صرف ہندوستانی زبان بلکہ عربی، روسی، انگریزی، نارویجین اور ہسپانوی زبانوں میں بھی ہو چکے ہیں۔

زیر تبصرہ کتاب ''جوگندر پال دید و نادید'' اردو کے بزرگ ادیب پروفیسر حمید سہروردی کی ہے۔ کتاب کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلا جو انہوں نے جوگندر پال کے حوالے سے 158 صفحے تک ان کی تحریروں پر اپنی قیمتی آرا ظاہر کی ہے۔ دوسرا حصہ ان کی تصانیف کا انتخاب جو 259 صفحے تک ہے۔ کتاب کے شروع میں ''جوگندر پال کی یاد میں'' کا عنوان دے کر ایک نثری نظم صاحب کتاب نے کہی ہے۔ پہلے حصے میں پال کی تصانیف کا جائزہ پروفیسر حمید سہروردی نے لیا ہے اور اس کے لیے انہوں نے دو عنوان دیے ہیں: 1 جوگندر پال: سفر حیات، 2 جوگندر پال سفر ادب

سفر حیات میں مندرجہ ذیل عنوانات پیدائش، مقام اور نام، افراد خاندان، لیاقت تعلیمی، ملازمت، عائلی زندگی، تخلیقی سفر، مطبوعات، پال شناسی، اعزازات، یادیں باتیں اور وفات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

پرفیسر حمید سہروردی نے لکھا ہے کہ جوگندر پال 5 ستمبر 1925 کو سیال کوٹ پاکستان میں پیدا ہوئے تھے۔ جبکہ اسکول کالج اور ملازمت کے ریکارڈ میں ان کی تاریخ پیدائش 2 اپریل 1925 درج ہے۔ مطبوعات کے عنوان میں افسانوں کے مجموعے، افسانچوں کے مجموعے، ناول، ناولٹ، نثر، جوگندر پال کے اپنے افسانوں کی مرتب کردہ کتابیں، دیگر مرتب کردہ کتابیں، پال شناسی کے تحت تقریباً 13 عدد کتابوں کے نام ہیں جنہوں نے ان پر مختلف حوالے سے تحریر کیا ہے۔ حمید سہروردی نے اپنی اس کتاب میں 13 اعزازات کو درج کیا ہے جو انھیں مختلف اداروں سے ملے تھے۔ بے شمار کتابوں کے مصنف اردو ادب کو ایک نئے زاویے سے نوازنے والا شخص 23 اپریل 2016 کو اس دار فانی سے کوچ کر گیا اور اسی کے ساتھ اردو ادب ایک بڑے نام سے محروم ہو گیا۔

سفر ادب میں مندرجہ ذیل موضوعات افسانہ، افسانچہ، ناول، ناولٹ، ڈراما، تنقید، سفرنامہ، آپ بیتی، مصاحبہ، مباحثہ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

پروفیسر حمید نے افسانہ کے تحت ان کے 10 افسانوی مجموعوں دھرتی کا کال، میں کیوں سوچوں، رسائی، مٹی کا ادراک، لیکن، بے محاورہ، بے ارادہ، کھلا، کھودو بابا کا مقبرہ، بستیاں کا جائزہ لیا ہے۔ ان کے افسانے کے بارے میں لکھتے ہیں:

''جوگندر پال کی ذات ایک ایسی افسانوی کائنات تھی جس میں افسانہ کی لغوی تعریف معدوم ہو کر نئی تعریف کی عمدہ مثال پیش کرتی تھی۔ ان کی فکر اور افسانوی فن بصیرت و بصارت کو تحیر اور چونکانے والا ہوتا تھا'' (ص 39)

پروفیسر حمید نے افسانچہ کے تحت 4 افسانچوں کے مجموعوں سلوٹیں، کتھا نگر، پرندے، نہیں رحمان بابو پر اظہار خیال کیا ہے اور ناولوں میں ایک بوند لہو کی، نادید، خواب رو، پار پرے اور ناولٹ بچھوا، بیانات، آمد و رفت کے بارے میں اظہار خیال کیا ہے۔

پروفیسر حمید سہروردی نے ان کے دو ڈرامے قومی ورثہ، پرانا پاپی کے اجمالی تعارف کے علاوہ ان کی دو تنقیدیں رابطہ اور بے اصطلاح کا مبسوط تجزیہ کیا ہے۔ ان کی تنقید کے بارے میں لکھتے ہیں:

''جوگندر پال کی دو تنقیدی کتابیں ہیں۔ دونوں کتابوں میں موضوعاتی اور شخصی تنقید پر مضامین ملتے ہیں۔ رابطہ اور بے اصطلاح کے علاوہ بھی جوگندر پال کے مضامین موجود ہیں جو کتابی شکل میں نہیں آسکے ہیں۔'' (ص 127)

پروفیسر حمید نے ان کے سفرنامہ 'پاکستان یاترا' اور ان کی آپ بیتی اور ان کے انٹرویوز کے حوالے سے بھی تفصیلی گفتگو کی ہے۔

پروفیسر حمید نے جوگندر پال کے مباحثہ کے عنوان کے تحت 'گجرال کمیٹی کی سفارشات'، 'مختصر افسانہ اور اس کی تنقید' اور 'افسانے پر ایک بحث پاکستان میں' کا جائزہ لیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں ''جوگندر پال کے مباحثے اردو ادب کا سرمایہ ہیں۔ ان مباحثوں میں وسعت و گہرائی موجود ہے۔ جو پال صاحب کا روشن اثاثہ ہے۔'' (ص 153)

جیسا کہ یہ بتایا جا چکا ہے کہ کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے کا ذکر ہو چکا ہے اب دوسرے حصے کا ذکر جو جوگندر پال کی تحریر کا انتخاب ہے۔ جس کے تحت صاحب کتاب نے پال کے 5 افسانوں معجزہ، دومنٹ کی خاموشی، بھائی بند، مہاجر، گرین ہاؤس اور افسانچے 25 افسانچے نیز دو ڈرامے 'قومی ورثہ' اور 'پرانا پاپی' کا انتخاب کیا ہے۔

پروفیسر حمید سہروردی نے بڑی جانفشانی کے ساتھ اس کتاب کی تصنیف کی ہے اور عمیق گہرائیوں کے ساتھ جوگندر پال کی تحریروں کا جائزہ لیا ہے اور اپنی تنقیدی نگاہ اس پر ڈال کر اردو ادب کے قارئین کے سامنے مفید باتیں رکھی ہے۔ جوگندر پال پر تحقیق کرنے والے قاری کے لیے ایک کارآمد کتاب ہے۔ ورق کافی عمدہ اور طباعت خوشنما ہے۔

نقوش شبلی

مصنف: ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی
صفحات: 320، قیمت: 400 روپے، سنہ اشاعت: 2020
ناشر: دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ
مبصر: ڈاکٹر عبدالناصر: C-24، اوکھلا وہار، جامعہ نگر، نئی دہلی 25

'نقوش شبلی' ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی کے 18 مقالے پر مشتمل ایک مجموعہ ہے۔ شبلی نعمانی یقینی طور پر نابغہ روزگار شخصیت تھے۔ خدا نے انھیں روشن قلب و جگر کے ساتھ پیدا کیا تھا جس کا انھوں نے بخوبی استعمال کیا۔ یہی وجہ ہے کہ شبلی نعمانی کا کارنامہ ان کی حیات میں بھی رونما ہوا اور آج بھی مطالعات شبلی کا دائرہ وسیع تر ہوتا چلا جا رہا ہے۔

اس مجموعے میں شامل چند مضامین کافی اہم ہیں جن میں علامہ شبلی کا علمی ادبی اور فکری سرمایہ، علامہ شبلی، ڈپٹی نذیر احمد اور اعظم گڑھ، علامہ شبلی اور نواب محسن الملک، علامہ اقبال شبلی کی انجمن میں، نیشنل اسکول اعظم گڑھ کی تاریخ کا ایک ورق، انجمن شبلی اور انجمن حمایت اسلام لاہور اور تصانیف شبلی کے دو دہلوی ناشرین وغیرہ کافی عرق ریزی سے لکھے گئے ہیں۔

'علامہ شبلی کا علمی، ادبی اور فکری سرمایہ' میں مصنف نے ان کے متعلق کیا خوب تجزیہ کیا ہے:

''علامہ شبلی جیسے جامع کمال مدتوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ 57 سال کی عمر میں انھوں نے علم تحقیق اور تصنیف وتالیف کے میدان میں جو کچھ کر دکھایا اسے ایک معجزے سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔'' (ص 29)

آگے چل کر مصنف نے اس حقیقت سے بھی پردہ اٹھایا ہے کہ:

''بلاشبہ سرسید علیہ الرحمہ نے انھیں جوہر قابل بنایا لیکن خود ان کی ذات میں جوہر قابل بننے کی صلاحیت فطرت نے ودیعت کی تھی۔'' (ص 30)

شبلی نے علی گڑھ میں سرسید کی مصاحبت میں 16 سال گزارے جہاں سے ان کے تخلیقی وتحقیقی مقالے سامنے آئے۔ تحقیقات کے ضمن میں انھوں نے دلائل و براہین کو پیش کرنے کا احسن طریقہ اختیار کیا جو بعد میں محققین کے لیے مشعل راہ بنے۔ اردو کو ایک قابل فخر زبان بنانے میں شبلی کا کارنامہ ان کا اسلوب نگارش ہے جس نے ان کے عہد میں اور مستقبل میں کافی مقبولیت حاصل کی جس کی وجہ سے علمی و ادبی تحقیقی وتنقیدی موضوعات میں دلکشی اور ادبی حسن برقرار رہتا ہے۔

اگر بہ نظر انصاف دیکھا جائے تو شبلی کا علمی وتحقیقی سرمایہ قرآن و حدیث، فقہ و فلسفہ، کلام وعقائد، تاریخ وتذکرہ، سیرت وسوانح، تعلیم وتربیت، اردو، عربی اور فارسی شعر وادب، شاعری، سیاسیات، املا اور صحت زبان، تحقیق وتنقید پر مشتمل ہے۔

ایک دوسرے مقالے 'علامہ شبلی اور نواب محسن الملک' میں اس بات کی صراحت کی گئی ہے کہ واقعی نواب محسن الملک جانشین سرسید تھے اور انھوں نے سرسید کی وفات کے بعد جب ایم اے یو کالج کے سکریٹری منتخب ہوئے تو انھوں نے کالج کو ترقی دینے میں کوئی دقیقہ نہیں چھوڑا۔ نواب محسن الملک اور علامہ شبلی میں ہمیشہ گہرے مراسم وتعلقات قائم رہے اور دونوں ایک دوسرے کے دکھ درد میں ہمیشہ شریک اور خیر خواہ رہے۔

'علامہ اقبال شبلی کی انجمن میں' نامی مقالے میں اس راز سے پردہ اٹھایا ہے کہ اقبال عمر میں شبلی سے بیس برس چھوٹے تھے لیکن شبلی نے ان کے پوشیدہ جوہر قابل کو نہ صرف دیکھا تھا بلکہ اس کا برملا اظہار دہلی کے ایک مجمع عام میں بھی کیا تھا۔ ان کے درمیان جو رشتہ استوار ہوا وہ تاحیات باقی رہا۔

مصنف نے 'علامہ شبلی اور عطیہ چند حقائق' کے عنوان سے پیش کردہ مقالے میں اسے ایک من گھڑت داستان بتایا ہے جسے کم نظر لوگوں نے طول دینے کی خاطر بار بار دہرایا تھا۔

'شبلی نیشنل اسکول کی تاریخ کا ایک ورق' بھی اہم مضمون ہے۔

'تصانیف شبلی کے دو دہلوی ناشرین' نامی مقالے میں اس بات کی صراحت ہے کہ عہد شبلی میں ہی ان کی تصانیف علی گڑھ، لاہور، لکھنؤ، امرتسر اور دہلی سے شائع ہونے لگے تھے لیکن شبلی ان اشاعتی سرگرمیوں سے سدا بے نیاز رہے۔ کچھ پبلشروں نے اجازت لے کر خوب منافع کمایا۔ ان میں دہلی کے دو پبلشرز مولوی سید ظہور الحسن موسوی اور مولوی سید قربان علی بسمل ایڈیٹر اردوئے معلی دہلی میں ہیں۔

بہ حیثیت مجموعی ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی نے 'نقوش شبلی' میں اپنا علمی وتحقیقی حق بہ حسن خوبی ادا کیا ہے۔ مجموعے کو اول تا آخر پڑھتے چلے جائیے کہیں کسی قسم کی رکاوٹ پیش نہیں آتی ہے۔ زبان و بیان بھی علمی اور ادبی نزاکت سے معمور ہے۔ اس لحاظ سے یہ اردو کے عظیم کارنامے میں شمار کی جانے والی کتاب ہے۔ ایک پختہ کار مصنف کے قلم سے ہمیں جیسی امید تھی اس کا انھوں نے کما حقہ حق ادا کر دیا ہے۔

میرے تعلق سے، میں ایک مبصر

مصنف ومرتب: کندن لعل کندن

صفحات: 339، قیمت: 200 روپے، سنہ اشاعت: 2019

ناشر: ڈاکٹر منور حسن کمال

N-93، ٹاپ فلور، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی 25

کندن لعل کندن ان افراد میں سے ہیں جو اردو شعر و ادب کا گہرا ذوق رکھتے ہیں۔ انھوں نے اپنی طالب علمی اور پھر ریسرچ کرنے کے زمانے میں کلاسیکی شاعری کا مطالعہ بڑے انہماک سے کیا ہے۔ اس کا ان پر اتنا اثر ہوا ہے کہ قدیم شاعری کے مضامین اور اس کی تخلیقی فضا ان کے مزاج کا حصہ بن گئی ہے۔ جیسے ان کا ایک شعر ہے۔

ہم لڑکپن سے جوانی میں جو ہوں گے داخل
دل میں مچ جائے گا کہرام یہ معلوم نہ تھا

پیش نظر کتاب 'میرے تعلق سے، میں ایک مبصر' ان پر لکھے گئے ان مضامین اور تبصروں پر مشتمل ہے، جو لائق وفائق ادیبوں، شاعروں اور ناقدوں نے ان کی کتابوں پر رقم کیے ہیں۔

آخر میں چند صفحات ان کی اپنی تحریروں پر مبنی ہیں جو انھوں نے دوسری کتابوں پر تبصروں کی شکل میں پیش کی ہیں۔

اس کتاب میں 'ارمغانِ کندن' پر گوپی چند نارنگ، بخشی اختر امرتسری، قمر رئیس، شریف احمد اور کریمی الاحسانی وغیرہ کے دعائیہ کلمات اور تبصرے شامل ہیں۔ ارمغانِ کندن پر کریمی الاحسانی نے لکھا ہے! غزلوں کا تو وہی رنگ ہے، جو قدیمی، روایتی، فنی اور اصولی چلا آرہا ہے۔ وہ اس ڈگر سے ہٹتے نہیں اور اس کے لب ولہجے میں سر مو فرق نہیں آتا۔ اگر وہ اس رنگ سے ہٹتے بھی ہیں تو یقیناً وہ اب بھٹک جائیں گے۔ ان کی شاعری کی موت واقع ہو جائے گی۔

یہ حقیقت ہے کہ کئی شاعر برسوں کی مشق ومزاولت کے بعد کوئی رنگ اختیار کرتا ہے، وہی رنگ اس کی شاعری کا جزو اعظم ہوتا ہے، وگرنہ اس کے بھٹکنے کے جن امکانات کی جانب کریمی الاحسانی نے اشارہ کیا ہے ایسا ہونا فطری ہے۔ یہ بات اپنی جگہ بالکل درست ہے کہ کندن لعل کندن نے اپنے لیے جس راہ پرخار کو منتخب کیا، ان کی زندگی کا حصہ بن گئی اور اس میں وہ بڑی حد تک کامیاب بھی ہیں۔

'جنوبی وشمالی ہند کی تاریخی مثنویاں' پر تنویر احمد علوی، ظہیر احمد صدیقی اور چراغ چنوٹی وغیرہ کے تبصرے شامل ہیں۔ اس کتاب میں خود کندن لعل کندن کا مقدمہ بھی شامل ہے۔ کندن لعل کندن نے مثنوی کی تحقیق وتنقید سے متعلق اشارتاً لکھا ہے کہ صنفِ مثنوی کی طرف ایک عرصے تک تحقیق وتنقید کا خیال نہ جانے کی کئی وجوہات ہو سکتی ہیں، مگر میرے خیال میں سب سے بڑی وجہ نقادوں کے ذہنوں پر غزل کے جادو کا اس طرح رہنا ہے کہ دوسری اصناف سخن کو وہ تحقیقی وتنقیدی حق نہیں مل پایا، جس کی وہ مستحق تھیں۔

'ارمغانِ عروض' پر رام پرکاش راہی اور فاروق جائسی کے تبصرے شامل ہیں۔ خود مصنف کا مقدمہ بھی کتاب کی زینت بنا ہوا ہے۔ مقدمہ میں کندن لعل کندن نے مشاعروں کی ابتر صورت حال پر بڑا تلخ تجربہ بیان کیا ہے'' اساتذۂ شعر وفن مشاعروں میں شریک ہونے سے کتراتے ہیں، نوخیز شعرا ہوں یا نامور شاعر، شاعری کے حصول کے لیے استاد فن وعلم عروض کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ کچھ شعرا اپنے خوش گلوکی بدولت ناموزوں شعر پڑھ کر داد سخن لیتے ہیں۔ تہذیب اور غرض شاعری عنقا ہو گئی ہے۔ شاعری کی انتہا صرف سامعین کو خوش کرنے تک محدود رہ گئی ہے۔ آج کل کے شعرا فن عروض جاننا نہیں چاہتے، نہ شاعری کے لیے اس فن کو ضروری قرار دیتے ہیں۔''

'چوتھی کتاب چون آہنگوں میں رباعیات کندن' پر ڈاکٹر قمر رئیس، ڈاکٹر شریف

احمد، کمال احمد صدیقی اور پروفیسر ساحل احمد وغیرہ نے گفتگو کی ہے۔ کمال احمد صدیقی نے شخنے چند میں رباعیات سے متعلق اپنی پرمغز گفتگو میں رباعی کے آہنگ و اوزان کو بڑے مؤثر انداز میں سمجھایا ہے۔ ساتھ ہی کندن لعل کندن کو یہ مشورہ بھی دیا ہے کہ ''اچھا ہوتا کہ اخرم الصدور اور اخرب الصدور رباعیاں ایک حصے میں اور اشتر الصدور رباعیاں ایک حصے میں رکھی ہوتیں تاکہ پڑھنے میں ذہن کو دھچکے نہ لگتے کیونکہ ذہن عاری ہو گئے ہیں اور آہنگ سے اغراض انحراف کی وجہ سے مضمون کی تفہیم/ تاثر پر خوشگوار اثر نہیں پڑتا۔

'رباعیات وماہیے ہیئت' پر گوپی چند نارنگ، قمر رئیس، عراق رضا زیدی وغیرہ نے تبصرے کیے ہیں۔ پروفیسر قمر رئیس نے بتایا ہے کہ ان کے یہاں عشقیہ واردات اور ہجر و وصال کے تجربات بھی ہیں اور حیات و کائنات کے لطیف ادراکات بھی۔ اس سے بھی بڑھ کر کندن لعل اپنے عہد کے آشوب جہاں کا جو شعور رکھتے ہیں، اس کی ترجمانی بھی بعض رباعیوں میں بڑی بے ساختگی سے ہوئی ہے۔

'معراج فن' جو علم عروض پر مشتمل مضامین کا مجموعہ ہے، اس پر بھی گوپی چند نارنگ، عراق رضا زیدی وغیرہ نے روشنی ڈالی ہے۔ عراق رضا زیدی کے مطابق معراج فن میں صنائع معنوی اور عیوب شعر پر بھی بحث کی گئی ہے، جس میں خصوصاً شکست ناروا کی مثالوں کے ذریعے اس سے بچنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ صنعتِ متلون کا جادو بھی جگایا گیا ہے۔

'مثل ومحاوراتی رباعیات کندن'، 'کندن پارے'، 'عروض و پنگل و خلیل'، 'رباعیات کندن' اور 'ہندی چھند'، 'عربی، فارسی عروض: ایک مطالعہ' پر ڈاکٹر شریف احمد، ڈاکٹر عبدالحق، کامل آفریدی، ناوک حمزہ پوری، ڈاکٹر ذاکر عثمانی، ڈاکٹر راشد عزیز، ڈاکٹر احمد محفوظ اور ڈاکٹر ایس اے مجید بیدار وغیرہ نے ان کتابوں کے مالہ وماعلیہ پر گفتگو کرتے ہوئے کندن لعل کندن کی شاعری اور رباعیات وعروض میں ان کی دلچسپی کے پیش نظر نہ صرف ان کی ستائش کی ہے، بلکہ اسے سبق آموز بھی قرار دیا ہے۔

کتاب کے آخر میں کندن لعل کندن نے چند کتابوں پر جو تبصرے کیے ہیں وہ پیش کیے گئے ہیں جن میں دکنی ادب کے مطالعے کی جہتیں، کتاب دل، فلک دریچہ، غزل ہمالہ، آواز کا پیرہن اور متاع سوز ونشاط وغیرہ پر کندن لعل کندن نے گفتگو کی ہے اور مصنفین کی تعریف وتوصیف کے ساتھ ان کے فن کو سراہا ہے۔

کتاب کا نام 'میرے تعلق سے، میں ایک مبصر' اگرچہ سماعت پر بار ہے، لیکن کتاب کے اوراق اس بات کے شاہد ہیں کہ اس میں علم وفن کے شیدائیوں کے لیے بہت سا سامان موجود ہے۔

فکشن

نیا حمام

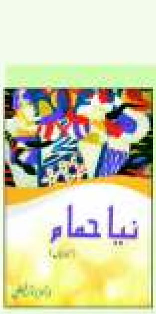

مصنف: ڈاکٹر ذاکر فیضی

صفحات: 203، قیمت: 250 روپے، سنہ اشاعت: 2020

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی -110002

مبصر: ابراہیم افسر

وارڈ نمبر 1، مہپا چوراہا، نگر پنچایت سوال خاص، میرٹھ 250501

ڈاکٹر ذاکر فیضی کا شمار نئی نسل کے نمایندہ افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ زیر تبصرہ کتاب 'نیا حمام' ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ہے۔ اس مجموعے میں انھوں نے 25 کہانیاں نیا حمام، ٹوٹے گملے کا پودا، فنکار، ٹی او ڈی، وائرس، اسٹوری میں دم نہیں ہے، ایک چھوٹی کہانی، ہریا کی حیرانیاں، میں آدمی وہ انسان، اتفاق، میرا کمرہ، جنگ جاری ہے، ہم دھرتی پر بوجھ ہیں، عجوبے کا عجائب گھر، گیتا اور قرآن، آدمی مانو، مردوں کی الف لیلہ، کوڑا گھر، ورثے میں ملی بارود، ہٹ بے، کلا نگس، اخبار کی اولاد، بدری، لرزتی کھڑکی اور دعوتِ نون ونج، 5 افسانچوں جھٹکے کا گوشت، اکیسویں صدی کی داستان، دلہن، انسان کی موت، کپڑوں میں پیشاب کرنے والے کو شامل کیا ہے۔ اس مجموعے میں شامل زیادہ تر کہانیاں ہندوستان کے موقر ادبی رسائل وجرائد میں شائع ہو کر قارئین سے داد وتحسین وصول کر چکی ہیں۔ ڈاکٹر ذاکر فیضی نے اپنی کہانیوں میں صحافت، کالج لائف، سائنسی تجربات، بچوں کی نفسیات، سیاسی ومعاشی مسائل وغیرہ سے متعلق موضوعات کو منظرِ عام پر لانے کی کوشش کی ہے۔ اس کوشش میں وہ کافی حد تک کامیاب بھی ہوئے ہیں۔ ان کی کہانیوں کا بیانیہ سحر انگیز ہے۔ کہانیوں کو ایک بار پڑھنا شروع کیجیے تو اختتام کیے بغیر کتاب ہاتھ سے نہیں چھوٹتی۔

'نیا حمام' کہانی کا موضوع منفرد ہے۔ اس کہانی میں ڈاکٹر ذاکر فیضی نے میڈیا کے کالے سچ کو عوام کے سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔ الیکٹرانک میڈیا اپنی ٹی آر پی بڑھانے کے لیے کس طرح سے ایک معصوم، اندھی، گونگی اور بہری لڑکی کو قتل کرنے کے لیے اسکرپٹ پہ اسکرپٹ تیار کرتی ہے۔ آخر کار چلتی ٹرین سے معصوم بچی کو نیچے گرا کر اس کا قتل کرنے کی اسکرپٹ پر سب رضامند ہو جاتے ہیں۔ اس کہانی میں صحافیوں کے کردار، ٹی وی چینلوں کے مالکوں اور این جی او کے سرکردہ کارکنان کی گھناؤنی اور کالی کرتوتوں کو ایک ایک کر کے سامنے لایا گیا ہے۔

'ٹوٹے گملے کا پودا' ایک جذباتی کہانی ہے۔ حنا کے ذریعے موصوف نے اس گھر کی کہانی کو بیان کیا جو اپنے اسلاف کی وراثت کو برباد کرنے پر تلی ہوئی ہے۔ لیکن حنا، جو اس وراثت کی حصے دار ہے، اس کی حیثیت ٹوٹے ہوئے گملے کے پودے کی مانند ہے۔ ٹوٹا ہوا گملا، مظلومیت اور بے بسی کی علامت بن چکا ہے۔ حنا کی حالت بھی اس گملے جیسی ہے جس کے نصیب میں در در کی ٹھوکریں کھانا لکھی ہوئی ہیں۔

'وائرس' میں ڈاکٹر ذاکر فیضی نے قاتل اور معصوم کی نفسیاتی کش مکش کو صفحۂ قرطاس کی زینت بنایا ہے۔ اس کہانی میں معصوم کا زندگی کے آخری لمحے تک اپنی ماں کے لیے تڑپنا اور قاتل کا اپنے انجام تک پہنچنے کے بعد ہیجانی کیفیت میں مبتلا ہونے کے منظر کو ڈرامائی انداز میں پیش کیا ہے۔

کہانی 'اتفاق' میں ناجائز تعلقات سے پیدا شدہ حالات کے سبب ٹوٹتے اور بکھرتے گھروں کے واقعات کو پیش کیا گیا ہے۔ بے میل شادی، بے شمار دولت اور تنہائی اس کہانی کے اصل کردار ہیں۔ تنہائی عورت کا سب سے کمزور پہلو ہوتا ہے۔ اس کمزوری کو دور کرنے کے لیے امیر گھرانوں کی عورتیں اپنے ڈرائیوروں سے ناجائز تعلقات بنا لیتی ہیں۔ اس کہانی میں ذاکر فیضی نے ناجائز تعلقات کی پاداش میں رونما ہونے والے منظر کو ڈراؤنی شکل میں پیش کیا ہے۔ کہانی کا اختتام اتنا بھیانک اور خوف ناک ہے کہ قاری دم بخود رہ جاتا ہے۔ ٹرین کے واش روم میں ایک بچہ 'اتفاق' ان ناجائز تعلقات کی بھینٹ چڑھ جاتا ہے۔

'عجوبے کی کا عجائب گھر' ایک دلچسپ کہانی ہے۔ اس کہانی کو پڑھنے کے بعد قاری ایک ایسی دنیا میں پہنچ جاتا ہے جہاں اسے دنیا ایک عجوبہ محسوس ہونے لگتی ہے۔ ''مردوں کی الف لیلہ' میں بے بس اور لاچار مردے کی کہانی کو بیان کیا گیا ہے۔ ظاہر میں تو وہ زندہ ہے لیکن اپنی اور اہل خانہ کی ضرورتوں کو پورا کرتے کرتے اس کا جسم مردہ ہو چکا ہے۔ 'ہٹ بے' کہانی ایک ایسے انسان کا بیانیہ ہے جس کے اندر بدلہ لینے کی چاہت ہے۔ اگر کوئی انسان اس سے تمیز سے بات کرنے کی کوشش کرتا ہے تو اسے یہ رویہ مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ افسانہ 'بدری' میں مفلوک الحال بدری کی کہانی پیش کی گئی ہے جس کے پاس رہنے کے لیے ٹوٹا پھوٹا گھر ہے۔ لاٹری میں جیتے ہوئے پیسوں سے وہ اپنے گھر کی مرمت اور بیٹیوں کی شادی کرنا چاہتا ہے۔ لیکن جب وہ روپے لے کر گھر پہنچتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ گھر گر جانے کے سبب اس کی دونوں بیٹیاں چھت میں دب کر راہی ملک عدم ہو گئی ہیں۔

بہر نوع! ڈاکٹر فیضی نے اپنے افسانوں کی طرح افسانچوں میں بھی تجربات اور مشاہدات کو پیش کیا ہے۔ ان کے افسانچے قاری کو فوراً اپنی جانب متوجہ کرتے ہیں۔ لمحاتی تاثر فوراً قائم ہوتا ہے۔ واقعات اتنے خوب صورت کہ زیرِ لب مسکرائے بغیر نہ رہا جائے۔ منظر کشی میں جزئیات نگاری کا اہتمام کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر ذاکر فیضی نے اس مجموعے میں پروفیسر عباس رضا نیر کی نظم 'خواب کو موت آتی نہیں' کو شامل کیا ہے۔ میری نظر میں اس نظم کا اس افسانوی مجموعے میں شامل افسانوں اور افسانچوں سے کوئی ربط و ضبط نہیں ہے۔ یہاں یہ نظم گراں گزرتی ہے۔ موصوف کے افسانوں پر کئی ناقدوں نے اپنی آرا کا اظہار بھی کیا ہے۔ مرحوم پیغام آفاقی نے لکھا ''فیضی کے اندر ایک عمدہ افسانہ نگار ہے، جو اپنے انداز میں افسانے لکھ رہا ہے۔'' مشہور فکشن نگار شموئل احمد کی نظر میں ''فیضی میں بڑے افسانہ نگار کی جھلک ملتی ہے۔'' میں اس موقع پر ڈاکٹر ذاکر فیضی کو ان کے پہلے افسانوی مجموعے کی اشاعت پر بہ صمیم قلب مبارک باد پیش کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ وہ آئندہ بھی اپنے مخصوص انداز اور لب و لہجے کے ساتھ قارئین کو محظوظ کرتے رہیں گے۔

سر شاخ گل

مصنف و ناشر: صائمہ ذوالنور

صفحات: 194، قیمت: 300 روپے، سنہ اشاعت: 2020

مبصر: ڈاکٹر شمیم احمد صدیقی

مدح گنج پولیس چوکی، سیتاپور روڈ، لکھنؤ – 226020

زیرِ تبصرہ افسانوی مجموعہ 'سر شاخ گل' اور خود مصنفہ کا نام صائمہ ذوالنور، دونوں ہی ایسے پرکشش ہیں جو اردو فکشن کے قدر دانوں کی ادبی حس میں ارتعاش پیدا کیے بغیر نہ رہیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ تبصرہ نگار نے پوری کتاب ایک ہی دن میں پڑھ ڈالی اور پھر دل سے ان دانشوروں اور بزرگوں کے لیے دعا نکلی جنھوں نے رامپور کی سرزمین میں آئندہ نسلوں میں علم و ادب کی ترویج کے لیے جامعۃ المومنات، حامد انٹر کالج، گورنمنٹ رضا پوسٹ گریجویٹ کالج اور گورنمنٹ رضا اورینٹل لائبریری جیسے اداروں کی داغ بیل ڈالی تھی جن میں سے بعض سے فیض یاب ہو کر مولانا محمد علی اور شوکت علی جیسے مجاہد آزادی، محشر عنایتی اور قیس رامپوری جیسے لاتعداد شعراء، پروفیسر حسن احمد نظامی جیسے لائق اور مثالی اساتذہ، مولانا یوسف اصلاحی اور مائل خیر آبادی جیسے صحافی اور ادیب نیز دور حاضر میں ڈاکٹر اطہر مسعود خاں جیسے اردو زبان و ادب کے مخلص سپاہی وجود میں آئے۔ صائمہ ذوالنور کا خمیر بھی اسی سرزمین رامپور سے تیار ہوا تھا اور اُن کے ادبی ذوق کی آبیاری بھی اسی ادب نواز شہر کی فضا میں ہوئی۔

سر شاخ گل کے اولین 22 صفحات میں ڈاکٹر اطہر مسعود خان کی پر مغز تقریظ، مصنفہ کے برادر کلاں ڈاکٹر منصور احمد صدیقی کے مختصر تاثرات اور مصنفہ کا انکسار سے لبریز پیش لفظ ہے۔ بعد کے 166 صفحات میں چھوٹے بڑے کل 19 افسانے ہیں جن کو مصنفہ نے دو دہائی یا کچھ زائد عرصہ قبل تخلیق کیا تھا اور مختلف جرائد میں شائع کیا تھا لیکن خانگی مصروفیات کی بنا پر وہ کتابی شکل میں شائع نہ کرائے جا سکے تھے۔

اولین افسانہ 'میری محبتوں کا ریاض تھا' مجموعے کا طویل ترین افسانہ ہے جس میں مصنفہ نے بڑی چابکدستی سے مشرقی دلہن کو یہ پیغام دیا ہے کہ ازدواجی زندگی کو خوشگوار بنانے کے لیے کس قدر قربانی دی جانی چاہیے نیز کس طرح سوتیلی اولاد میں سوتیلی ماں کے تئیں گھر کر چکی بلا وجہ کی نفرت کو حکمت بھری محبت سے ختم کیا جا سکتا ہے۔

دوسرا افسانہ 'مہربان رفاقتیں' بھی خاصہ طویل ہے۔ اس میں اور ایک دوسرے مختصر افسانے 'نئے گلاب کی دنگیں' میں بڑی عمدگی سے یہ اخلاقی درس دیا گیا ہے کہ معذور انسانوں کے تئیں ہم کو کتنی ہمدردی ہونا چاہیے۔ اول الذکر میں شوہر کو ٹوٹ کر چاہنے والی ایک بیوی کو ایک معذور لڑکی کو خوشدلی سے سوکن قبول کرتا دکھایا گیا ہے جبکہ موخر الذکر میں دو جڑواں بچوں کی ماں جو بھری جوانی میں بیوہ ہو گئی ہے، سے شادی کرنے والے خوبرو نوجوان کی اعلیٰ ظرفی کی منظر کشی کی گئی ہے۔

'یہ بہار کیسی آئی' میں مصنفہ نے سماج میں رائج جہیز کی لعنت پر بڑے لطیف انداز میں طنز کیا ہے اور گھر آئی لالچی بارات کو ذلت کے ساتھ لوٹ جانے پر مجبور کیا ہے۔ اسی کے ساتھ اپنے قاری کو یہ درس بھی دیا ہے کہ آج کے مادہ پرستانہ دور میں لوگوں کے قول و فعل میں حد درجہ کا تضاد بھی پایا جاتا ہے۔ اس لیے کسی اہم معاملے میں جلد کوئی قدم نہ اٹھانا چاہیے۔

افسانہ 'اولڈ ہاؤس' میں مغربی تہذیب اور دولت کی حرص کی کامیاب نفی کی گئی ہے۔ 'جو گزر گیا سو گزر گیا' میں عورت کے اندر ودیعت مامتا کے جذبے کے تحت بچہ حاصل کرنے کی جنونی خواہش اور اس کی وجہ سے ہونے والے نقصان کی عکاسی کی گئی ہے۔ افسانہ سر شاخ گل روایتی طرز کا افسانہ ہے جس میں تبصرہ نگار کو کوئی واضح اخلاقی پیغام دکھائی نہیں دیا۔

آخری افسانہ 'رائیگاں ساعتوں کا دکھ' میں حب الوطنی اور رشتوں کے پاس و لحاظ کی اہمیت کو اُجاگر کیا گیا ہے۔

صائمہ ذوالنور کے افسانوں کی زبان سلیس اور سہل ہے، طرز تحریر خاصا متاثر کن ہے۔ بیشتر افسانے کوئی نہ کوئی اخلاقی یا اصلاحی پیغام لیے ہوئے ہیں اور مکالماتی انداز کے ہیں۔ مکالمے ہلکے پھلکے ہیں جو قاری میں قطعی کوئی اکتاہٹ نہیں پیدا کرتے۔ موقع محل کے لحاظ سے پیش کیے گئے محاوروں اور مشہور شعرا کے اشعار کے ذریعے عبارت کے حُسن میں اضافہ کیا گیا ہے۔ تمام افسانوں کے پلاٹ اور کردار یکسر جدا ہیں۔ بیشتر انسانوں کی روح محبت فاتح عالم ہے۔ اردو کے نوجوان قاری کے مزاج کی رعایت میں افسانوں میں رومانی چلبلاہٹ کو بھی سمویا گیا لیکن ابتذال اور فحاشی سے حتی الوسع گریز کیا گیا ہے۔ مجموعی طور پر سر شاخ گل کے افسانے ادب برائے حظِ نفس کے بجائے ادب برائے اصلاح معاشرہ کے عمدہ نمونے ہیں۔ تبصرہ نگار کتاب میں پیش کی گئی ڈاکٹر اطہر مسعود خاں کی تقریظ کے ان جملوں سے سو فیصد اتفاق کرتا ہے۔

''وہ اپنے افسانوں میں جابہ جا دل کو چھو لینے والے جذباتی جملے لکھتی ہیں جو نہ صرف افسانے کے حُسن کو بڑھاتے ہیں بلکہ ایک طرح ان میں جان ڈال دیتے ہیں۔ انھوں نے اپنے افسانوں کے عنوانات بھی خوبصورت رکھے ہیں جو ان کے پاکیزہ مزاج اور صالح ادبی ذوق کی نمائندگی کرتے ہیں۔''

مذکورہ بالا تمام فنی خوبیوں کی بنا پر صائمہ ذوالنور کا ہر افسانہ اپنے قاری کو آخر تک باندھے رہنے میں کامیاب دکھائی دیتا ہے۔

تبصرہ نگار کو اس مجموعے میں ایک بات کا شدت سے احساس ہوا۔ مصنفہ کی اس حد تک انکساری مناسب نہیں کہ انھوں نے اپنے سوانحی کوائف اور تعلیمی پس منظر کا ذکر نہ کر کے قاری کو قدرے تشنگی سے ہمکنار کیا ہے۔ ہماری دلی خواہش ہے کہ وہ جلد ہی اپنے افسانوں کا دوسرا مجموعہ بھی شائع کرائیں گی اور اس میں مذکورہ تشنگی کا ازالہ کریں گی۔

شاعری

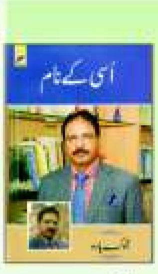

اسی کے نام

مصنف: آلوک یادو

صفحات: 119، قیمت: 150 روپے

ناشر: عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی

مبصر: ڈاکٹر یوسف رامپوری، محلہ ٹنڈولہ ٹانڈہ، رامپور، یوپی

'اسی کے نام' آلوک یادو کا پہلا شعری مجموعہ ہے جو غزلوں پر مشتمل ہے۔ یہ وہ غزلیں ہیں جو 2012 سے 2015 کے درمیان کہی گئیں۔ آلوک یادو کافی عرصے سے

شاعری کررہے ہیں۔ ان کی شاعری کی ابتدا گیتوں اور نظموں سے ہوئی۔ ان کی بہت سی نظمیں اخبارات ورسائل میں شائع بھی ہوئیں۔ اس کے بعد وہ غزل کے میدان میں آگئے۔ ان کی غزلیں اس بات کا پتہ دیتی ہیں کہ غزل گوئی کی صلاحیت ان کے اندر فطری ہے۔ آلوک یادو جی نے غزل کہنے کی صلاحیت کو نکھارنے اور اجاگر کرنے میں بڑی ریاضت ومحنت کی ہے۔ انھوں نے فنِ شاعری کو سیکھا، کئی ماہر اساتذہ کی طرف بھی مراجعت کی، یہاں تک کہ باضابطہ اردو زبان پڑھنے کی طرف بھی متوجہ ہوئے۔ جہدِ مسلسل اور محنت ولگن نے کچھ ہی وقت کے بعد انھیں اردو داں بنادیا۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ آلوک جی نے اردو شاعری یا غزل گوئی کو محض تفنن طبع کا ذریعہ نہیں سمجھا بلکہ وہ اس کے ساتھ جذباتی، قلبی اور ذہنی طور پر وابستہ ہوئے۔ یہ آلوک یادو کی دور بینی اور اردو شاعری سے گہری وابستگی کی بات تھی کہ انھوں نے اردو سیکھ کر اردو کے اصلی متن سے اپنا رشتہ استوار کرلیا جس کا ثمرہ آج ہم 'اسی کے نام' کی شکل میں دیکھ رہے ہیں۔

شعری مجموعہ 'اسی کے نام' اپنے مواد کے اعتبار سے بھی معیاری ہے اور طباعت کے لحاظ سے بھی دیدہ زیب ہے۔ مجموعے کا نام اپنے اندر کشش بھی رکھتا ہے، تجسس اور معنویت بھی۔ شعری مجموعے میں جو غزلیں شاملِ اشاعت کی گئی ہیں، ان میں سے اکثر بہت عمدہ ہیں۔ اتنی اچھی شاعری کے لیے آلوک یادو جی داد وتحسین کے مستحق ہیں۔ اس مجموعے کی غزلوں کے حوالے سے کہا جاسکتا ہے کہ آلوک جی کی غزلیہ شاعری کا کینوس بہت وسیع ہے جس میں زندگی کے بہت سے مسائل سمائے ہوئے ہیں۔ بہت سے موضوعات اور بہت سے پہلوؤں کو انھوں نے اپنی شاعری میں بخوبی برتا ہے۔ ان کی شاعری داخلی اور خارجی دونوں عناصر سے مرکب ہے۔ ان کی غزلوں سے ان کی اپنی زندگی بھی جھانکتی نظر آتی ہے اور دوسروں کی زندگی بھی۔ جہاں انھوں نے اس مجموعے کی غزلوں میں اپنے جذبات واحساسات کا برملا اظہار کیا ہے، وہیں سماج کی بھی عکاسی کی ہے۔ یہی ایک اچھے شاعر کی پہچان بھی ہے کہ وہ ایک طرف اپنی زندگی کے واقعات، واردات کو شاعری کا جامہ پہنائے، وہیں وہ اپنی شاعری میں اپنے عہد کے مسائل کو بھی اس طور پر پیش کرے کہ وہ خلقِ خدا کے لیے کسی نہ کسی درجہ میں مفید ثابت ہوں۔

آلوک یادو جی کی غزلوں میں بھرپور تغزل موجود ہے۔ انھوں نے غزلوں کے بنیادی تصور کو سامنے رکھا ہے۔ اس حوالے سے انھوں نے جو اشعار بھی کہے ہیں وہ اچھوتے اور دلچسپ ہیں اور ان میں خیال کی نزاکت پائی جاتی ہے۔ چند اشعار دیکھیں۔

چلے آؤ جان ادا دھیرے دھیرے ذرا دھیرے دھیرے، ذرا دھیرے دھیرے
مرے چارہ گر جب سے تم ہوگئے ہو اثر کررہی ہے دوا دھیرے دھیرے

آلوک جی نے اپنی شاعری میں زندگی کے اتنے مسائل کو بیان کیا ہے کہ حیرت ہوتی ہے اور اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ حالات پر گہری نظر رکھتے ہیں اور انسان کی حرکات وسکنات بھی ان کے سامنے رہتی ہیں۔ اسی کے ساتھ ان میں 'سچ کو سچ' کہنے کا جذبہ بھی ہے اور حوصلہ بھی۔ سچ چاہے کتنا ہی کڑوا کیوں نہ ہو، آلوک جی اسے علی الاعلان کہنے کی جرأت رکھتے ہیں، لیکن جو کہتے ہیں سلیقہ کے ساتھ کہتے ہیں اور اپنی شخصیت اور شاعری کے معیار سے نہیں گرتے۔ اس قبیل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

جانے کیا ہوگیا آج کا آدمی اب کہاں کھوگیا پارسا آدمی
یوں تو کردار اپنا بدلتا نہیں بس بدلتا ہے اپنی قبا آدمی
ڈھونڈتے کیا ہو آلوک اس دور میں آدمی ہے فقط نام کا آدمی

آلوک یادو کے شعری مجموعہ 'اسی کے نام' کی غزلوں کی ایک خاص بات یہ ہے کہ ان میں قافیوں اور ردیفوں کا بہت عمدہ استعمال کیا گیا ہے جس کی وجہ سے غزلوں میں نیا پن محسوس کیا جاسکتا ہے۔ خاص طور سے ردیفوں کا برتاؤ ان کے یہاں بہت خاص اور الگ ہے۔ مثلاً: کانچ کی چوڑیاں، سمجھا کرو، نہیں ہوتا، نہیں تھا، لب، کہہ دیا، پہ سجے، آدمی، زندگی، دھیرے دھیرے، الیکشن ہے کیا ہے؟ ہے صاحب، کیا ہے، کروں کیا، ادھوری ہے، وغیرہ۔ ان ردیفوں سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ آلوک یادو نے کس طرح ردیفوں کو برتا ہے اور ان ردیفوں میں کیسے کیسے شعر نکالے ہیں۔ چونکہ انھوں نے متعدد نئی ردیفوں کا استعمال کیا ہے، اس لیے ان کی غزلیہ شاعری بھی نئی اور الگ سی دکھائی دیتی ہے۔ اگر وہ اسی انداز سے غزلیں کہتے رہے تو وہ اردو شاعری میں ایک منفرد پہچان اور شان بنانے میں کامیاب ہوسکتے ہیں۔ جس تیزی کے ساتھ وہ غزلیں کہہ رہے ہیں، اس سے یہ امید کی جاسکتی ہے کہ ان کی غزلیہ شاعری کا سفر دیرا اور دور تک جاری رہے گا۔ بہرکیف یہ بات بڑے وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ اگر ان کی شاعری آگے بھی اسی طرح جاری رہی تو وہ کامیابی کی کئی اور منزلوں کو طے کرلیں گے اور موجودہ عہد کے ممتاز شعرا میں ان کا شمار ہوگا اور ان کے شعری مجموعہ 'اسی کے نام' کو ادبی حلقوں میں پسند کیا جائے گا۔ ■

پہلی تخلیق پہلا تاثر

کسی بھی رسالے میں جب آپ کی تخلیق شائع ہوتی ہے تو آپ کو بے انتہا مسرت کے ساتھ ایک نئی تحریک بھی ملتی ہے۔ ماہنامہ 'اردو دنیا' میں جب آپ کی تخلیق پہلی بار شائع ہوئی تو آپ کو کیسا محسوس ہوا؟ آپ اپنے خیالات لکھ کر ہمیں بھیجیں اور یہ بھی ضرور لکھیں کہ آپ کی ذہنی اور تحریری تربیت میں ادبی رسائل کتنا اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ ذرا سوچیے! اگر یہ رسالے نہ ہوتے تو...؟

قومی اردو کونسل کی سرگرمیاں

ہرشہری کو اپنے دستوری حقوق کے ساتھ فرائض کے تئیں بھی بیدار رہنا چاہیے: ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

یومِ آئین کے موقعے پر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان میں تقریب

نئی دہلی: آئین ہند ہمارے ملک کی روح ہے اور یہ ہمیں ایک باوقار اور ذمے دار شہری بنانے کی ضمانت دیتا ہے۔ یہ دستور نہ صرف تمام شہریوں کے حقوق کی ضمانت دیتا ہے بلکہ اس کے فرائض کی بھی تحدید کرتا ہے اور ایک ایسا سماج بنانے پر زور دیتا ہے جہاں رواداری، امن وسلامتی، ایک دوسرے کے تئیں احترام و یکجہتی کا دوردورہ ہو۔ ان خیالات کا اظہار یومِ آئین کے موقعے پر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے صدر دفتر میں منعقدہ تقریب میں ڈائرکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے کیا۔ انھوں نے کہا کہ آج کا

دن یہ عہد لینے کے لیے منایا جاتا ہے کہ ہم اپنے آئین کا نہ صرف اپنے دل میں احترام ملحوظ رکھیں بلکہ اپنی عملی زندگی میں بھی اسے نافذ کریں اور اپنے اپنے دائرۂ کار میں اپنی ذمے داریوں کو کماحقہ نبھانے کی کوشش کریں۔ انھوں نے کہا کہ موجودہ دور کا یہ المیہ ہے کہ ہر شخص اپنے حقوق کی تو بات کرتا ہے مگر اسے اپنی ذمے داریوں کا احساس نہیں ہوتا، اگر ہم اپنے حقوق کے ساتھ ساتھ اپنی ذمے داریوں کے تئیں بھی حساس ہو جائیں تو کسی کو کسی سے کوئی شکایت نہیں رہے گی، ہر شخص مطمئن رہے گا۔ اسسٹنٹ ڈائرکٹر (ایڈمن) کمل سنگھ نے کہا کہ ہمارے ملک کے آئین میں ہر شہری کو مذہبی، فکری وسماجی آزادی دی گئی ہے اور ساتھ ہی اس کے حقوق اور فرائض کی بھی نشان دہی کی گئی ہے۔ انھوں نے کہا کہ جس طرح قومی سطح پر آئین ہند پر عمل کرنا ہمارا فریضہ ہے اسی طرح ہم جس ادارے سے وابستہ ہیں اس کے قوانین پر عمل کرنا بھی ہم سب کی ذمے داری ہے۔ کونسل کی اسسٹنٹ ڈائرکٹر (اکیڈمک) ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی نے کہا کہ ہمارے ملک کا دستور نہایت جامع اور ہمہ گیر ہے جس میں ملک کے تمام طبقات، خطوں اور شہریوں کو پیش نظر رکھا گیا ہے اور سبھوں کے حقوق کے تحفظ کی ضمانت دی گئی ہے۔ انھوں نے کہا کہ آئین کا حقیقی احترام یہی ہے کہ ہم کسی جانب داری اور تعصب کے بغیر اس پر عمل کریں اور اپنے اپنے دائرۂ عمل میں صحیح طریقے سے اپنی ذمے داریوں کو نبھانے کی کوشش کریں۔ ریسرچ آفیسر ڈاکٹر کلیم اللہ نے دستور ہند کی خوبیوں اور خصوصیات پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ یہ ہمارے ملک کے آئین کا کمال ہے کہ اس میں مختلف زبانوں، تہذیبوں اور مذاہب پر عمل کرنے والے تمام شہریوں کا احاطہ کیا گیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ آئین ہند ہی ایک ایسی چیز ہے جو پورے ملک کو تمام تر مذہبی وتہذیبی تنوعات و اختلافات کے باوجود جوڑتا ہے اور پوری دنیا میں ایسا جامع دستور کہیں نہیں پایا جاتا۔

اس سے قبل یومِ آئین کے موقعے پر قومی سطح پر منعقدہ پروگرام سے ورچوئل طریقے پر جڑتے ہوئے صدر جمہوریہ رام ناتھ کووند کے ساتھ کونسل کے ڈائرکٹر اور تمام اسٹاف نے آئینی اقدار و تقاضوں پر عمل کرنے کا عہد لیتے ہوئے اس کے دیباچے کو پڑھا۔ واضح ہو کہ ملک کی آئین ساز اسمبلی نے 26 نومبر 1949 کو باقاعدہ بھارت کے آئین کو منظور کیا تھا، جسے 26 جنوری 1950 سے نافذ کیا گیا۔ اختیارات کی تفویض اور سماجی انصاف کی وزارت نے 2015 میں 26 نومبر کو یوم آئین منانے کا اعلان کیا تھا۔ جس کے بعد سے ہر سال یہ دن شہریوں کے مابین آئینی اقدار کو فروغ دینے کے لیے منایا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ اس دن کو بھارت کے پہلے وزیر قانون ڈاکٹر بی آر امبیڈکر کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے بھی منایا جاتا ہے۔ ڈاکٹر امبیڈکر نے آئین کا مسودہ تیار کرنے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ تقریب میں کونسل کے تمام اسٹاف نے شرکت کی۔ پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 26 نومبر 2020

اردو، عربی اور فارسی اسٹڈی سینٹرز کے ذمے داران کی آن لائن میٹنگ

نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے اردو عربی اور فارسی کے سینٹر انچارجز کی آن لائن میٹنگ ہوئی جس میں تمام سینٹرز کی کارکردگیوں کا جائزہ لیا گیا اور ساتھ ہی انھیں ہدایت کی گئی کہ کورونا کے دور میں کس طرح اپنی تعلیمی سرگرمیاں جاری رکھی جاسکتی ہیں۔ اس موقعے پر کونسل کے ڈائریکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے کہا کہ کورونا کے دور میں بھی کونسل کے تمام کام حسبِ معمول جاری ہیں اور ہم نے اپنی تمام اسکیموں کو جاری رکھتے ہوئے بہت سے علمی و ادبی پروگرام بھی کروائے ہیں۔ انھوں نے سینٹر انچارجوں سے کہا کہ آپ اردو زبان کے فروغ کی مہم میں پوری سنجیدگی اور لگن سے شریک رہیں اور اپنے طلبہ و طالبات کو آن لائن تعلیم دینے کا سلسلہ جاری رکھیں تاکہ بچوں کا تعلیمی نقصان نہ ہو۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ موجودہ دور سوشل میڈیا اور انٹرنیٹ کا دور ہے لہٰذا ہر سینٹر کا فیس بک، ٹوئٹر، یوٹیوب وغیرہ پر اپنا اکاؤنٹ اور چینل ہونا چاہیے اور ان کے ذریعے بچوں کو تعلیم دینے کے ساتھ اپنی سرگرمیوں کی تشہیر بھی کریں تاکہ لوگوں کو معلوم ہو کہ آپ کا سینٹر ایکٹیو ہے اور کونسل تک بھی براہِ راست معلومات پہنچتی رہیں۔ ڈاکٹر عقیل نے کہا کہ سوشل میڈیا کا مفید استعمال کرکے نہ صرف بچوں کا تعلیمی سسٹم جاری رکھا جاسکتا ہے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ آپ کے ادارے کی تشہیر بھی ہوگی اور لوگ اس کی کارکردگیوں سے بھی واقف ہوتے رہیں گے۔ ڈاکٹر عقیل نے کہا کہ کونسل نے اردو زبان کے ساتھ ساتھ طلبا و طالبات کے لیے عربی و فارسی زبان کی تعلیم کا بھی انتظام کیا ہے اور اس وقت مجموعی طور پر اردو، عربی اور فارسی کے دو ہزار سے زائد سینٹر چل رہے ہیں، ہماری کوشش ہے کہ اردو زبان کا دائرہ پورے ملک کے دور دراز خطے تک پہنچے اور نئی نسل کو دوسری زبانوں اور عصری علوم کے ساتھ اس زبان کی شیرینی سے بھی واقف کروایا جائے۔ انھوں نے اس موقعے پر تمام سینٹر انچارجز سے تبادلۂ خیال کرکے ان کے سینٹروں کی کارکردگی کے بارے میں جانکاری بھی حاصل کی اور انھیں درپیش پریشانیوں کو جلد از جلد دور کرنے کی یقین دہانی کروائی۔ اس میٹنگ میں کونسل کے اسٹاف سمیت تمام سینٹرز کے ذمے داران موجود رہے۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 3 دسمبر 2020

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے زیرِ اہتمام 'اردو فکشن کا عصری منظرنامہ' کے عنوان سے آن لائن مذاکرہ

نئی دہلی: اردو فکشن کا موجودہ منظرنامہ روشن و امید افزا ہے اور نئے افسانوی ادب نے غیر ضروری اور نامانوس علامتوں اور ابہام و پیچیدگی سے دامن چھڑا کر نئے انداز میں زندگی کا ہاتھ تھاما ہے۔ ان خیالات کا اظہار قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے کیا۔ وہ کونسل کے زیرِ اہتمام 'اردو فکشن کا عصری منظرنامہ' کے زیرِ عنوان منعقدہ آن لائن مذاکرے میں تعارفی گفتگو کر رہے تھے۔ انھوں نے کہا کہ موجودہ افسانوی ادب میں نئے رجحانات و موضوعات بڑی تیزی سے شامل ہو رہے ہیں، فنی اور فکری سطح پر بھی بہت سی تبدیلیاں ہو رہی ہیں۔ سائنسی، تاریخی، لسانی، مذہبی، سیاسی، سماجی اور معاشی میدانوں میں جس قدر وسعت اور نئی دریافت و ایجادات ہو رہی ہیں آج کے افسانے اور ناول کے موضوعات میں بھی اسی قدر اضافہ ہو رہا ہے۔ ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے کہا کہ معاصر اردو فکشن کی ان خوبیوں کے ساتھ کچھ کمزور پہلو بھی ہوسکتے ہیں چنانچہ ضرورت ہے کہ اس کے دونوں پہلوؤں پر کھل کر بات کی

جائے جو نئی نسل کے لیے کارآمد ہو۔

پروفیسر طارق چھتاری نے کہا کہ نئے عہد کے تخلیق کار جدیدیت، مابعد جدیدیت یا ترقی پسندی سے آگے بڑھ کر اپنے عہد کو خود سمجھنے اور اپنا نظریہ بنانے کی کوشش کر رہے ہیں اور بہت اچھے افسانے لکھے جا رہے ہیں۔

سلام بن رزاق نے اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا کہ اردو فکشن کا منظرنامہ اچھا تو ہے لیکن بہت اچھا نہیں ہے۔ اس کی وجہ انھوں نے یہ بتائی کہ نئی نسل میں نقاد زیادہ پیدا ہو رہے ہیں جبکہ فکشن نگار اور تخلیق کار کم پیدا ہو رہے ہیں، لہٰذا نئی نسل کو کتابوں اور افسانوں کی طرف راغب کرنا ضروری ہے۔

شموئل احمد نے اردو افسانے کی موجودہ صورتحال کو مایوس کن قرار دیتے ہوئے اس کی توجیہ یہ پیش کی کہ آج کل لکھی جانے والی زیادہ تر کہانیاں موجودہ دور کے تقاضوں پر پوری نہیں اترتیں۔ انھوں نے کہا کہ ہمارے یہاں پیشکش میں حسن تو ہے لیکن کنٹینٹ میں وہ بات نہیں ہے، اس لیے ہمیں پیش کش کے ساتھ کنٹینٹ میں بھی دھار پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔

ڈاکٹر عبدالصمد نے بھی ہم عصر فکشن کی بعض خامیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ نئے تخلیق کار پڑھتے کم ہیں اور محنت بھی کم کرتے ہیں جو خود ان کے لیے اور فن کے لیے نقصان دہ ہے۔ اپنی تحریروں کے سب سے بڑے دشمن خود بنیں اور جو لکھیں اسے تنقیدی نظر سے دیکھیں اور اس کی مسلسل اصلاح کریں۔

پروفیسر بیگ احساس نے کہا کہ ہم عصر اردو فکشن میں کئی خوبیاں ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ آج ہمارے ادیبوں کو تخلیقی آزادی ملی ہوئی ہے، مقامیت، تہذیبی حوالوں اور ثقافتی تشخص پر زور دیا جا رہا ہے۔ ایسی نثر لکھی جا رہی ہے جس میں تہ داری پر زور ہے۔ اسی طرح تانیثیت پر بھی زور دیا جا رہا ہے، بین المتونیت کی مثالیں بھی ملتی ہیں۔ اس سے پہلے اس طرح کی چیزیں اردو فکشن میں نہیں ملتی تھیں۔

پروفیسر غضنفر علی نے بحسن وخوبی اس پروگرام کی نظامت کے فرائض انجام دیے۔ انھوں نے پورے مذاکرے کی گفتگو کا ماحصل پیش کرتے ہوئے کہا کہ معاصر اردو افسانہ جو چالیس پینتالیس سال پر مشتمل ہے اس میں بہت سے اچھے افسانے لکھے گئے، بہت سے اچھے افسانہ نگار پیدا ہوئے اور اگر محاسبہ کریں تو کم سے کم بیس افسانہ نگار ایسے مل جائے گے جن کے یہاں ایک سے زیادہ افسانے ایسے ہیں جن کے تراجم بھی ہوئے ہیں اور جنھیں ہر مکتبِ فکر کے لوگ پسند کرتے ہیں۔ اخیر میں کونسل کے ڈائریکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے تمام مہمانوں اور شرکائے مذاکرہ کا شکریہ ادا کیا۔ اس مذاکرے میں کونسل کے اسٹاف کے علاوہ گوگل میٹ اور فیس بک لائیو کے ذریعے سیکڑوں اساتذہ و ریسرچ اسکالرز شریک رہے اور ہم عصر اردو فکشن پر اس اہم و قیمتی ڈسکشن سے مستفید ہوئے۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 10 دسمبر 2020

اردو اور تعلیم سے متعلق قومی اور علاقائی خبریں

قومی

ہندوستانی ادب کی 10 اہم تصانیف کے چینی اور روسی زبانوں میں تراجم

نئی دہلی: شنگھائی کوآپریشن آرگنائزیشن (ایس سی او) کی آن لائن نشست کے دوران ہندوستان کے عزت مآب نائب صدر جمہوریہ ہند وینکیا نائیڈو نے جدید ہندوستانی ادب کی 10 اہم تصانیف کے چینی اور روسی تراجم کے مکمل ہونے کا اعلان کیا۔ یہ اعلان کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ ہندوستان علاقائی ادب کی ان نایاب تصانیف کے چینی اور روسی زبانوں میں تراجم سے ہندوستان کی قدیم ثقافتی وراثت میں دیگر ممالک کے لوگوں کی دلچسپی پیدا ہوگی۔ معلوم ہو کہ ہندوستان کے وزیر اعظم نریندر مودی نے جون 2019 میں کرگستان کی راجدھانی بشکیک میں ہوئے ایس سی او سمٹ میں اعلان کیا تھا کہ ہندستانی زبانوں کی 10 اہم تصانیف کا چینی اور روسی زبانوں میں ترجمہ کیا جائے گا۔ اسی سلسلے میں ساہتیہ اکادمی نے جدید ہندستانی ادب کی 10 مختلف زبانوں کی اہم تصانیف کا انتخاب کیا اور ان کا چینی اور روسی زبانوں میں ترجمہ شائع کیا۔ ہندوستان کے وزیراعظم نریندر مودی نے 10 نومبر 2020 کو ایس سی او نمائندوں کی بیٹھک میں ساہتیہ اکادمی کے ذریعے ان تراجم کو مکمل کیے جانے کا اعلان کیا۔ ساہتیہ اکادمی نے اس موقعے پر ان تصانیف کے انگریزی ایڈیشن کی بھی اشاعت نو کی ہے۔ ذیل کی ہندستانی زبانوں کی تصانیف کا چینی اور روسی زبانوں میں ترجمہ شائع کیا گیا ہے۔ سورج مکھی سویر (مصنف: سید عبدالمالک آسامی)، آروگیہ نیکیتن (مصنف تاراشنکر بندوپادھیائے، بنگالی)، ویویشال (مصنف: جھویر چند میگھانی، گجراتی)، کوے اور کالا پانی (مصنف: نرمل ورما، ہندی)، پرو (مصنف: ایس ایل بھیرپا، کنڑ)، منوج داسنک کتھا و کہانی (مصنف: منوج داس، اڑیہ)، مڑھی دا دیوا (مصنف: گردیال سنگھ، پنجابی)، شِل نیرنگلل شل منی ترکل (مصنف: جے کانتن، تمل)، اِلّو (مصنف: راچاکونڈا وشواناتھ شاستری، تیلگو) اور ایک چادر میلی سی (مصنف: راجندر سنگھ بیدی، اردو)۔

روزنامہ 'میراوطن'، دہلی، 1 دسمبر 2020

ہندوستان تعلیم کے شعبے میں قائدانہ کردار ادا کرے گا: ڈاکٹر نشنک

نئی دہلی: مرکزی وزیر تعلیم رمیش پوکھریال نشنک نے کہا کہ ہندوستان صدیوں سے تعلیم کے شعبے میں قیادت کے منصب پر فائز رہا ہے جس کی وجہ سے بیرون ممالک

اس کی تعریف کی جاتی رہی ہے۔ ڈاکٹر نشنک نے 25 نومبر کو سری اربندو سوسائٹی کے زیر اہتمام منعقدہ ایک ورچول کانفرنس 'زیرو امپاورمنٹ' کی صدارت کرتے ہوئے کہا کہ نئی تعلیمی پالیسی 2020 کے ذریعے ہندوستان نئے چیلنجوں کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہے۔ 'واسودیوا کٹمبکم' کے ذریعے ہندوستان نے پوری دنیا کو تعلیم کے اسباق پڑھائے۔ انھوں نے مہارشی اربندو کی شخصیت کو یاد کرتے ہوئے کہا کہ انھوں نے اپنی باصلاحیت قیادت کے ذریعے ملک میں ایک نئے انقلاب کو جنم دیا۔ ہندوستان کے تعلیمی ورثہ کے شاندار ماضی کا اعادہ کرتے ہوئے مرکزی وزیر نے کہا کہ ہم نے نالندہ اور ٹیکسلا جیسی عالمی سطح پر معروف یونیورسٹیوں کے ذریعہ واسودیو کٹمبکم کے نعرے کے ساتھ پوری دنیا میں پیغام دیا ہے۔

روزنامہ 'میراوطن' دہلی، 26 نومبر 2020

نئی تعلیمی پالیسی سے ہندوستان 'سائنسی سپر پاور ملک' بنے گا: وزیر تعلیم

نئی دہلی: مرکزی وزیر تعلیم ڈاکٹر رمیش پوکھریال 'نشنک' نے کہا کہ نئی تعلیمی پالیسی 'اقدار سازی' سے لے کر 'قومی تعمیر' تک ہندوستانی اقدار پر مبنی ہے جس میں ہندوستانی و بین الاقوامی سطح پر متاثر کن عناصر شامل ہیں اور اس پالیسی میں ہر ہندوستانی کی خواہشات، خواب اور دیرینہ سوچ پنہاں ہے جو ہندوستان کو عالمی سطح پر 'سائنسی سپر پاور' بنائے گی۔ ڈاکٹر نشنک نے نئی تعلیمی پالیسی پر آئی آئی ٹی بمبئی کے زیر اہتمام ایک ورکشاپ کا افتتاح کرتے ہوئے کہا کہ ہر سال ہم اپنے ملک کے نامور ماہر تعلیم اور اولین وزیر تعلیم مولانا ابوالکلام آزاد کے یوم پیدائش 11 نومبر کو یوم تعلیم کے طور پر مناتے ہیں اور مجھے خوشی ہے کہ آئی آئی ٹی بمبئی نے قومی یوم تعلیم کو مدنظر رکھتے ہوئے ہی آج نئی تعلیمی پالیسی پر ورکشاپ کا انعقاد کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہم اپنی نئی تعلیمی پالیسی میں 'ریسرچ' کے آئیڈیا کے پختہ عزم کے ساتھ آگے بڑھ رہے ہیں اور مجھے بہت خوشی ہے کہ یہ انسٹی ٹیوٹ بھی تحقیق اور جدت طرازی کے میدان میں پوری لگن کے ساتھ کام کر رہا ہے اور یہ اسی کی مثال ہے کہ یہاں ریسرچ ایکسیلنس ایوارڈ بھی ممتاز محققین کو پیش کیا جا رہا ہے۔ اس موقعے پر مرکزی وزیر مملکت برائے تعلیم سنجے دھوترے، نئی تعلیمی پالیسی کے معمار ڈاکٹر کستوری رنگن، آئی آئی ٹی بمبئی کے ڈائرکٹر پروفیسر سبھاشیش چودھری، پروفیسر ملنداٹرے، مختلف فیکلٹیوں کے ممبران اور طلبہ بھی موجود تھے۔

روزنامہ ہندوستان ایکسپریس، دہلی، 11 نومبر 2020

دھلی

غالب: معنی آفرینی، جدلیاتی وضع، شونیتا اور شعریات

نئی دہلی: ساہتیہ اکادمی کے زیر اہتمام قومی کتب ہفتہ کے موقعے پر جاری کتاب نمائش کے دوران گوپی چند نارنگ کی تخلیق 'غالب: معنی آفرینی، جدلیاتی وضع، شونیتا اور شعریات' پر مباحثہ منعقد کیا گیا۔ اس موقعے پر اردو اور فارسی کے ممتاز اسکالر شریف حسین قاسمی نے مباحثے کے دوران کہا کہ غالب پر یہ کتاب اتنی اہم ہے کہ اس سے بہت سے اشعار اور جملوں پر پوری کتابیں لکھی جا سکتی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اس کتاب کو پڑھ کر ہم یہ سمجھ سکتے ہیں کہ غالب کی شاعری اپنے دور کے رواج سے مختلف تھی اور ایک انسان کو انسان تصور کرنے کی کوشش تھی۔ انھوں نے کہا کہ 524 صفحات پر مشتمل یہ کتاب جس میں 12 ابواب ہیں غالب کو ایک نئے انداز میں سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش

ہے۔ انھوں نے کہا کہ یہ کتاب غالب پر 100 سے زیادہ دوسری کتابوں کے مطالعے کے بعد لکھی گئی ہے جو اس کی جامعیت اور تنوع کو ظاہر کرتی ہے۔ اس کتاب میں نہ صرف غالب بلکہ غالب پر پہلی کتاب لکھنے والے ان کے شاگرد الطاف حسین حالی بھی ایک ہیرو کے طور پر پیش کیے گئے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اس کتاب میں غالب کے انداز بیان کی وجہ کو منفرد انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ انھوں نے کورونا دور میں بھی اس اہم کتاب پر گفتگو کا انعقاد کرنے پر ساہتیہ اکادمی کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ ایسے پروگراموں کے ذریعے ہی قارئین کو اہم کتابوں کے بارے میں معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ قابل ذکر ہے کہ اردو اور فارسی کے ممتاز عالم شریف حسین قاسمی کا دہلی یونیورسٹی سے تعلق ہے جہاں انھوں نے شعبۂ فارسی کے صدر کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ ان کی 10 سے زیادہ کتابیں شائع ہو چکی ہیں جنھیں ہندوستان کے صدر اور ملک و بیرون ملک بہت سارے اہم اداروں نے ایوارڈ اور اعزاز سے نوازا ہے۔ پروگرام کی نظامت ساہتیہ اکادمی کے اسسٹنٹ ایڈیٹر اجے کمار شرما نے کی۔ اس دوران علم و ادب سے وابستہ درجنوں افراد موجود تھے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 24 نومبر 2020

مولوی محمد باقر، دہلی میں ادب، ثقافت و صحافت اور 1857 کا معرکہ

نئی دھلی: انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹیو اسٹڈیز کے زیر اہتمام 'مولوی محمد باقر، دہلی میں ادب، ثقافت وصحافت اور 1857 کا معرکہ: تاریخی تناظر' کے عنوان پر ایک ویبینار کا انعقاد عمل میں آیا۔ پروفیسر رضوان قیصر سابق صدر شعبہ تاریخ جامعہ ملیہ اسلامیہ نے اپنے کلیدی خطاب میں کہا کہ مولوی

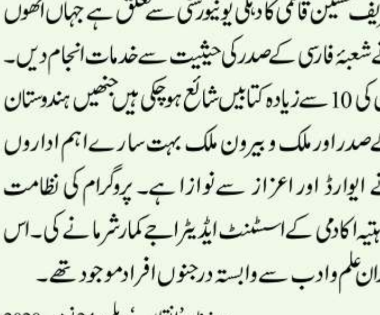

محمد باقر نے میڈیا، صحافت اور قلم کے ذریعے انگریزوں کے خلاف جنگ کی اور پہلی مرتبہ ان کے قلم سے یہ پیغام ملا کہ تلوار سے کہیں زیادہ قلم کے ذریعے ہونے والی لڑائی موثر ہوتی ہے اور اسی بنیاد پر انگریز ان کے سب سے بڑے دشمن ہو گئے۔ سینئر صحافی سہیل انجم نے کہا کہ مولوی محمد باقر صحافیوں کے لیے مشعل راہ ہیں اور ہر دور میں میڈیا اور صحافت کے میدان میں کام کرنے والوں کو ان سے رہنمائی ملتی رہے گی۔ پہلی مرتبہ دنیا میں کسی صحافی کو حق بولنے کی بنیاد پر سزا دی گئی اور وہ مولوی باقر تھے جنھیں انگریزوں نے اپنے لیے سب سے بڑا خطرہ سمجھ کر موت کی سزا دی کیونکہ مولوی محمد باقر نے اپنے اخبار اور قلم سے ہندوستان کے نوجوانوں میں آزادی کی روح پھونک دی تھی۔ مجاہد آزادی شہید اشفاق اللہ خان کے پوتے نے کہا کہ مولوی باقر نے حق کی خاطر لڑنے کا سبق دیا ہے۔ شہید اشفاق اللہ خان اور مولوی باقر کی زندگی کا مقصد ہندوستان کی ترقی اور غلامی سے آزادی تھا اور اسی لیے ان دونوں نے غلامی کے بجائے موت کو ترجیح دی۔ پروفیسر جگموہن سنگھ نے کہا کہ مولوی باقر اور ان کے ہمعصر لوگوں نے جس انداز کی صحافت کی تھی آج کے دور میں دوبارہ اس کو قائم کرنے اور اسی نہج پر کام کرنے کی ضرورت ہے۔ افتتاحی اجلاس کی صدارت مولوی محمد باقر کے خاندان سے تعلق رکھنے والی پروفیسر شیریں موسوی نے کی۔ اپنے خطاب میں انھوں نے کہا کہ مولوی محمد باقر انگریزوں کے خلاف علم جہاد بلند کرنے کے ساتھ ہندو مسلم یکجہتی کے علمبردار بھی تھے۔ وہ انگریزوں سے نفرت کے ساتھ برادران وطن سے بے پناہ محبت کرتے تھے۔ ویبینار میں مشہور مورخ رعنا صفوی نے مغلیہ عہد کی ثقافت پر اپنا مقالہ پیش کیا۔ ڈاکٹر جبیں انجم نے '1857 میں خواتین پر کیا گزری' کے عنوان پر دبئی سے اپنا مقالہ پیش کیا۔ اسعد فیصل فاروق نے 'مولوی باقر اور اردو اخبار' کے موضوع پر اپنا مقالہ پیش کیا۔ ڈاکٹر گلفشاں خان ایسوسی ایٹ پروفیسر اے ایم یو علی گڑھ، ڈاکٹر ارشاد نیازی اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی، ڈاکٹر سیف الدین احمد اسسٹنٹ پروفیسر یونیورسٹی آف دہلی، پروفیسر عبدالعزیز، پروفیسر سید سراج اجملی، پروفیسر طارق چھتاری، ڈاکٹر وسیم راجہ، ڈاکٹر پرویز نذیر، سمیت متعدد دانشوران اور اسکالروں نے اس موضوع پر اپنا مقالہ پیش کیا۔

ڈاکٹر سید ظہیر حسین نے اپنا مقالہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ مولوی باقر کا اخبار علانیہ طور پر انگریزوں کے خلاف تھا۔ لوگوں میں آزادی کا جذبہ بیدار کر رہا تھا۔ اس کے علاوہ ان لوگوں کے خلاف اس میں خبریں شائع ہوتی تھیں جو انگریزوں کے حامی تھے۔ اس اخبار سے یہ پیغام صاف جا رہا تھا کہ انگریزوں کو شکست دینا کوئی مشکل نہیں ہے۔ اسی بنیاد پر انگریز ان کے خلاف ہو گئے اور مولوی باقر کو بغیر مقدمہ اور چارج شیٹ کے مار دیا گیا۔ اختتام پر 6 نکاتی قرارداد بھی پیش کی گئی۔ اس موقعے پر آئی او ایس کے جنرل سکریٹری پروفیسر زیڈ ایم خان نے کہا کہ آئی او ایس اپنا مشن جاری رکھے گا۔ ہماری کوشش ہے کہ نئی نسل میں مولوی باقر جیسے صحافی پیدا ہوں، اس کے لیے ہم پلیٹ فارم مہیا کریں گے اور اسکالرشپ بھی دیں گے۔ ویبینار کی نظامت کا فریضہ مولانا شاہ اجمل فاروق ندوی نے انجام دیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 22 نومبر 2020

نسائی ادبی تنظیم (بنات) کا آن لائن چوتھا یوم تاسیس

نئی دھلی: بین الاقوامی نسائی ادبی تنظیم، بنات کا چوتھا جشن یوم تاسیس زوم اور فیس بک کے آن لائن پلیٹ فارم پر منایا گیا۔ افتتاحی اجلاس میں بنات کی جنرل سکریٹری تسنیم کوثر نے ممبران بنات اور شرکا کا استقبال کیا اور جلسے کی کارروائی کا آغاز کیا۔ انھوں نے جلسے کا پورا انتظام بحسن و خوبی سنبھالا۔ افتتاحی اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے بنات کی صدر ڈاکٹر نگار عظیم نے سبھی کو بنات کی کامیابی سرکردگیوں اور سرگرمیوں کے لیے مبارکباد پیش کی اور بنات کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ بنات کے قیام کا ایک اہم مقصد خواتین کے لیے ایک ایسا عالمی پلیٹ فارم تیار کرتا ہے جہاں نسائی اظہار کے آزادانہ مواقع فراہم ہوں اور زبان و ادب کی آبیاری کی جا سکے۔ بنات کے اس افتتاحی اجلاس میں بطور مہمان خصوصی ہندی ادب کی مشہور و معروف شاعرہ اور ادیبہ پروفیسر انامیکا شریک رہیں۔ بنات کی نائب صدر عذرا نقوی نے مہمان خصوصی کا تعارف پیش کیا اور کہا کہ انامیکا جی نہ صرف بہترین شاعرہ اور ادیبہ ہیں بلکہ ایک مخلص شخصیت کا بھی نام ہے۔ ان کی موجودگی میں یوم تاسیس کے دوسرے سیشن 'روبرو' کا آغاز ہوا جس میں کتابوں کی رسم اجرا انجام پائی۔ آن لائن انفرادی رسم اجرا کی تقریب میں جملہ بارہ کتابیں منظر عام پر آئیں جن میں قمر جمالی صاحبہ کی اردو کہانیوں کا پنجابی ترجمہ 'درددارشتہ'، ناول کڑوے کریلے (ثروت خان)، مضامین یادیں باتیں (نعیمہ جعفری پاشا)، شعر کتابیں یادیں (عذرا نقوی)، نذیر فتح پوری اور ادب اطفال (حسن آرا)، نذیر فتح پوری روبرو شمشاد جلیل شاد (شعری مجموعے)، آئینہ (آصف اظہار علی) روبینہ: میر کی کشمیری شاعری کا مجموعہ، رنگ زندگی کے (بینا نقوی) افسانوی مجموعے ابرنیساں (شاہدہ شاہین) عکس خیالی (نفیسہ سلطانہ انا) تنقید و تحقیق: عصمت چغتائی کے ناولوں اور افسانوں میں نسائی حسیت (عطیہ فاطمہ) اردو نظم میں مناظر فطرت قطب شاہی دور سے گلوبل وارمنگ تک (صبیحہ ناہید) شامل ہیں۔

آن لائن مشاعرہ بنات کی سرپرست مشہور شاعرہ اور ادیبہ ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی کی صدارت میں منعقد ہوا۔

مشاعرہ کی ناظمہ بنات کی نائب صدر عذرا نقوی تھیں۔ اس مشاعرے میں صرف بنات کی پچیس ممبر شاعرات شریک تھیں جن میں کناڈا سے مشہور شاعرہ تسیم سید بھی شامل تھیں۔ زیادہ تر شاعرات نے جو نظمیں اور غزلیں پیش کیں ان سب میں عصری اور نسائی حسیت مختلف انداز سے جلوہ گر تھی۔ صدر مشاعرہ نے اپنے صدارتی خطبے میں اس بات کا ذکر کیا کہ ان شاعرات کے کلام میں تازہ کاری تھی اور بعض شاعرات نے نئی ردیفوں کے ساتھ بہت کامیاب غزلیں پیش کیں۔ آصف اظہار علی اور صبیحہ سنبل (علی گڑھ) قمر سرور اور نفیسہ انا (احمد نگر)، شمشاد جلیل شاد (پونا)، روبینہ میر (جموں)، رفیعہ شبنم، تسنیم جوہر (حیدرآباد) عذرا نقوی (گریٹر نوئیڈا)، صبیحہ صدف، راسین، نفیسہ سلطانہ انا (بھوپال)، فوزیہ رباب (گوا)، شہناز رحمت (کلکتہ)، رضیہ حیدر، نسیم بیگم نسیم، صبیحہ ناہید، مینا نقوی، نگار عظیم، تسنیم کوثر (دہلی)، ایمن تنزیل (رامپور)، تبسم اعظمی (اعظم گڑھ)، طلعت سروہا، (سہارنپور)، ثریا جبین (پٹنہ)، تبسم نادکر (بمبئی) شامل رہیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 7 نومبر 2020

اتر پردیش

اردو بحیثیت مادری زبان

وارانسی: 'عالمی یوم اردو' کے موقعے پر بعنوان 'اردو بحیثیت مادری زبان' ویبینار (آن لائن سمینار) کا انعقاد کیا گیا۔ اس ویبینار میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے ضلع تعلیمی اور تربیتی ادارہ (ڈائٹ) سارناتھ وارانسی کی اردو لیکچرر ڈاکٹر نغمہ پروین نے کہا کہ اردو ایک شیریں اور محبت کی زبان ہے، اس کو سیکھنا ایک شائستہ اور مہذب انسان ہونے کی دلیل ہے۔ اپنے صدارتی خطاب میں بنارس ہندو یونیورسٹی شعبۂ اردو کے صدر پروفیسر آفتاب احمد آفاقی نے کہا کہ اردو صرف ایک زبان یا وسیلۂ اظہار نہیں ہے۔ یہ ہندوستان کی تاریخ و تہذیب کی محافظ اور امین ہے۔ ہماری جنگ آزادی کی پوری تاریخ اردو زبان کے سینے میں پوشیدہ اور محفوظ ہے۔ اس نے ہماری مشترکہ تہذیب اور ثقافت، ہماری روایات اور باہمی اتحاد و اتفاق کو فروغ دینے میں جو رول ادا کیا ہے وہ تاریخی ہے۔ اردو نے آزادی کے بعد ملک کی تعمیر نو میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے اور ناموافق حالات میں بھی ہماری سیاسی، سماجی اور ثقافتی زندگی کو مہمیز کرنے میں اہم کردار ادا کر رہی ہے۔ اردو ہماری مادری زبان ہے، اس لحاظ سے اس کی اہمیت سے صرف نظر نہیں کیا جاسکتا۔ مادری زبان اصلاً کسی قوم کی میراث ہوتی ہے جس کی ترقی میں قوم کی ترقی پوشیدہ ہوتی ہے اور اس کی تنزلی قومی و ملی وجود کے مٹ جانے کے مترادف ہے۔ مہمان اعزازی معروف شاعر ڈاکٹر چندر شیکھر پانڈے 'شمس' نے اپنی غزلوں اور نظموں سے پروگرام میں چار چاند لگا دیے۔ پروگرام کا آغاز اردو ٹیچر حافظ نفیس الحمان نے قرآن پاک کی تلاوت سے کیا، نعت پاک کا نذرانہ اردو ٹیچر نوشاد امان 'سوز بنارسی' نے پیش کیا، پروگرام کی نظامت کے فرائض اردو ٹیچر عبدالرحمٰن نے بحسن و خوبی انجام دیے، ایجے اگرہنی اور اردو ٹیچر جاوید احمد نے ٹیکنیکل سپورٹ کی اور شکریے کی رسم اردو بی ٹی سی ٹیچرس ایسوسی ایشن کے صدر ڈاکٹر احتشام الحق نے ادا کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 23 نومبر 2020

اردو صرف زبان ہی نہیں، تہذیب بھی ہے

سنبھل: سرائے ترین کے فیض گرلس انٹر کالج میں علامہ اقبال کی پیدائش کی مناسبت سے ایک پروگرام کا انعقاد کیا گیا، جس میں شہر کی معزز شخصیات نے شرکت کی اور اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اس پروگرام میں کالج کی طالبات نے خصوصی طور پر شرکت کی اور اپنی صلاحیتوں کا بھرپور مظاہرہ کیا۔ پروگرام کی ابتدا میں منزہ نے بارگاہ خداوندی میں حمدیہ اشعار کا نذرانہ پیش کیا۔ اس کے علاوہ نیہا، ایمن اور عافیہ نے ثقافتی پروگرام پیش کیے۔ اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے حسین اختر نے کہا کہ علامہ اقبال اردو زبان کے بڑے محترم شاعر تھے۔ ان کے دل میں حب الوطنی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی، اسی لیے انھوں نے قومی ترانہ لکھا، جسے سارے ملک میں بڑے جوش و خروش سے پڑھا جاتا ہے۔ ان کی خدمات کو کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ ڈاکٹر عابد حسین حیدری نے کہا کہ علامہ کے یوم پیدائش کو ہم اردو ڈے کے طور پر منا رہے ہیں اور ہماری کوشش ہے کہ نوجوان نسل کو اردو زبان سے آراستہ کریں، تاکہ اسے اپنی تاریخ کے بارے میں مکمل علم ہو۔ ان کے علاوہ مشیر خاں، ڈاکٹر کشور جہاں زیدی، سید حسین افسر، شفیق الرحمٰن برکاتی نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 9 نومبر 2020

عالمی یوم اردو کا انعقاد

مظفر نگر: اردو ٹیچر ویلفیئر ایسوسی ایشن اور اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن کے مشترکہ تعاون سے اردو شاعر علامہ اقبال کے یوم پیدائش کے موقعے پر عالمی یوم اردو کا انعقاد غیور محفل مظفر نگر میں کیا گیا جس کی صدارت ماسٹر محمد شعیب نے کی۔ اس موقعے پر اردو کے مضامین میں اعلیٰ مقام حاصل کرنے والے ہونہار طلبا، اردو ادب کے شعرا اور اساتذہ کو اعزاز سے نوازا گیا۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے پروفیسر جنید حارث، ڈائیٹ کے وائس پرنسپل محمد الطاف، ضلع پروبیشن آفیسر محمد مشفقین کو علامہ اقبال ایوارڈ، صابر خان کو بابائے اردو مولوی عبدالحق ایوارڈ، راؤ عبدالستار، رئیس الدین رانا، امیر نہٹور، ڈاکٹر عقیل ملک، ڈاکٹر نوشاد، الطاف الرحمٰن اور جاوید خان اردو اساتذہ کو تعلیم کے میدان میں عمدہ کارکردگی کا مظاہرہ کرنے پر مولانا آزاد ایوارڈ اور شعرا کو ڈاکٹر راحت اندوری ایوارڈ سے نوازا گیا۔ پروفیسر جنید حارث نے اپنے خطاب میں کہا کہ علامہ اقبال ہندوستان کے عظیم شاعر تھے۔ ان کے یوم پیدائش کے موقعے پر یوم اردو نہ صرف ہندوستان بلکہ پوری دنیا میں منایا جاتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ علامہ اقبال کو حقیقی خراج تحسین اس وقت ادا کیا جاسکتا ہے۔ جب ہم اردو کو اپنائیں اور دوسروں کو بھی اردو سیکھنے کی ترغیب دیں۔ ڈائیٹ کے وائس پرنسپل محمد الطاف نے کہا کہ اردو ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کی زبان ہے اردو بہت پیاری ہے اور اس زبان نے فرقہ وارانہ ہم آہنگی کو فروغ دیا ہے۔ ضلع پروبیشن آفیسر محمد مشفقین نے کہا کہ اردو ایک ایسی زبان ہے جو پورے ہندوستان میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ اردو اتر پردیش اور ہر سرکاری محکمہ کی دوسری سرکاری زبان ہے اور سرکاری دفاتر میں اردو مترجم موجود ہیں لہٰذا زبان کی نشو و نما کے لیے اردو بولنے والوں کو اپنی درخواستیں اردو میں پیش کرنی چاہییں۔ اردو ٹیچرس ویلفیئر ایسوسی ایشن کے اسٹیٹ کونسلر محمد صابر خان نے کونسل اسکولوں میں کم از کم 20000 اردو اساتذہ کی تقرری کا مطالبہ کیا۔ راؤ عبدالستار اور ڈاکٹر عقیل ملک نے کہا کہ جس طرح اساتذہ کو مشن پریرنا کے تحت تربیت دی جارہی ہے اسی طرح اردو اساتذہ کو بھی اردو مضامین کی تربیت دی جائے کہ وہ اردو زبان کو روزمرہ کی ضروریات میں استعمال کریں۔

روزنامہ اخبار 'مشرق' دہلی، 10 نومبر 2020

علامہ اقبال کا قانونی فلسفہ

علی گڑھ: فیکلٹی آف لا علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی لا سوسائٹی کی جانب سے 'علامہ اقبال کا قانونی فلسفہ' موضوع پر ایک ویبینار کا اہتمام کیا گیا جس میں امریکہ، انگلینڈ، ہنگری، سعودی عرب، انڈونیشیا، ایران و ماریشس سمیت پندرہ ملکوں کے نمائندوں نے حصہ لیا۔ ویبینار کا افتتاح کرتے ہوئے اے ایم یو کے پرو وائس چانسلر پروفیسر ظہیر الدین نے کہا کہ علامہ اقبال ایک عظیم شاعر، فلسفی اور سیاست داں تھے۔ وہ ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ شخص ہونے کے ساتھ

قانون کے ماہر بھی تھے، جس کے بارے میں لوگ زیادہ نہیں جانتے۔ ماہر اقبالیات پروفیسر عبدالحق نے بطور مہمان خصوصی اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ دنیا کے کسی بھی ملک اور شاعر کو دیکھا جائے تو علامہ اقبال جیسا کوئی نظر نہیں آتا۔ ایسا عظیم فلسفی، تین زبانوں کا جاننے والا شاعر اور ایسی شاعری کرنے والا شخص شاید ہی کوئی ملے۔ علامہ اقبال کی تحریروں میں بہت سی جگہوں پر قانون اور قانونی امور کا ذکر ملتا ہے، لیکن اس پر زیادہ توجہ نہیں دی گئی ہے۔ پروفیسر عبدالحق نے کہا کہ تیس سال کی وکالت علامہ اقبال کی زندگی کا اہم حصہ ہے۔ ان کی شاعری میں جگہ جگہ انصاف، دلیل، گواہ، حقوق وغیرہ کا ذکر ملتا ہے۔ علامہ اقبال نے انیسویں صدی کے شروع میں لازمی تعلیم کی بات کہی تھی اور دلیل یہ دی تھی کہ اسلام میں دس سال سے زیادہ عمر کے بچوں کو لازمی طور سے نماز پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے۔ انھوں نے لا فیکلٹی میں علامہ اقبال چیئر قائم کیے جانے پر زور دیتے ہوئے کہا کہ اے ایم یو میں ان کی یاد میں کام ہونا چاہیے۔

مقرر خاص پروفیسر سعود عالم قاسمی نے کہا کہ علامہ اقبال سر سید اور اے ایم یو سے بہت زیادہ متاثر تھے۔ انھوں نے اپنی تحریروں میں مسلمانوں کو اصل دھارا میں لانے میں سر سید کی کاوشوں کو سراہا۔ پروفیسر قاسمی نے کہا کہ علامہ اقبال چاہتے تھے کہ اے ایم یو میں نئے قانون کے ساتھ ساتھ پرانے قانون کو بھی پڑھایا جائے۔

ایم بی بی ایس کی طالبہ عائشہ صمدانی نے ویبینار سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ علامہ اقبال کی شخصیت کی نشو و نما میں ان کی والدہ کا بہت اہم کردار رہا ہے۔ وہ ایک عظیم بیرسٹر تھے اور اپنی تیس سال کی قانونی زندگی میں انھوں نے سیکڑوں کیس لڑے جن میں سے سو سے زیادہ کیس رپورٹ بھی ہوئے۔ اپنے صدارتی خطاب میں لا سوسائٹی کے صدر اور فیکلٹی آف لا کے ڈین پروفیسر شکیل احمد صمدانی نے کہا کہ علامہ اقبال کی شہرت پوری دنیا میں ہے اور ان کی نظم 'سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا' ہر جگہ پڑھی جاتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ آج سے تقریباً 90 سال قبل علامہ اقبال نے بنیادی حق، مزدوروں کے حقوق، اظہارِ خیال کی آزادی، وطن سے محبت، لازمی تعلیم وغیرہ موضوعات پر اپنے خیالات ظاہر کیے۔ علامہ اقبال نے شاعری اور فلسفہ میں جو کارنامہ انجام دیا ہے وہ کسی دوسرے کے بس کی بات نہیں۔ ان کی شاعری میں سوشل جسٹس کا تصور پایا جاتا ہے اور ان پر دنیا کی تقریباً سبھی زبانوں میں 4,500 سے زائد کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔

روزنامہ 'میرا وطن'، دہلی، 10 نومبر 2020

بہار

ایک شام خلیق الزماں نصرت کے نام

دربھنگہ: خلیق الزماں نصرت تخلیق کے پس منظر میں حالات زندگی کا غائر مطالعہ کرتے ہیں اور نفسیاتی زندگی کے ساغر و مینا سے کھیلتے ہیں۔ وہ تحقیق، تنقید اور شاعری کے آدمی ہیں۔ سنہری کرنوں سے گزر کر احساس اور نازک مزاج کو کائنات میں سموتے ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ موجیں ان کے آس پاس دلگداز و جاں سوز بنتی ہیں اور انھوں نے موجود کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر معاصر انداز میں ترجمانی کی ہے۔ یہ باتیں 'ایک شام خلیق الزماں نصرت کے نام' کے عنوان سے منعقدہ پروگرام میں منصور خوشتر نے کہیں۔ انھوں نے کہا کہ خلیق الزماں نصرت نے اردو ادب کے لیے جو کام کیا ہے وہ ناقابل فراموش ہے۔ انھوں نے گمنام اشعار پر تحقیق کر کے ان کے اصل شعرا کو تلاش کیا ہے۔ اس طرح انھوں نے بہت سے لوگوں کی غلط فہمی دور کر دی ہے۔ پروگرام کے صدر انور آفاقی نے کہا کہ خلیق الزماں نصرت کی تنقید نگاری کو پسند کرنے والوں میں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر علی احمد، ڈاکٹر خورشید نعمانی، شمس الرحمٰن فاروقی، ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی، پروفیسر جگن ناگھ آزاد ڈاکٹر اختر نجمی، ڈاکٹر مشتاق احمد، ڈاکٹر توقیر احمد خاں، ڈاکٹر علی احمد جلیلی وغیرہ جیسی معروف و معتبر شخصیتوں کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔ 'جہانِ اردو' دربھنگہ (ایڈیٹر ڈاکٹر مشتاق احمد) نے ایک خاص نمبر ان کے اعزاز میں 'نصرت فرد و فنکار' کے عنوان سے نکالا تھا جس میں ان کی شاعری اور تنقید نگاری پر مضامین شائع ہوئے تھے۔ پروگرام کی نظامت کر رہے ڈاکٹر احسان عالم نے اپنے خطاب میں کہا کہ خلیق الزماں نصرت نے اردو ادب کے لیے جو کام کیا ہے وہ ناقابل فراموش ہے۔

روزنامہ 'سچ کی آواز' دہلی، 2 دسمبر 2012

جموں کشمیر

اردو تحقیق وتنقید کی سمت و رفتار-اکیسویں صدی میں

سری نگر: شیخ العالم ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر سوسائٹی اور جی این کے پبلی کیشنز کی جانب سے سرینگر میں 'اردو تحقیق

وتنقید کی سمت و رفتار-اکیسویں صدی میں' کے موضوع پر یک روزہ قومی سمینار منعقد کیا گیا۔ جس میں ریاست جموں وکشمیر کے اطراف واکناف سے ریسرچ اسکالرس، ادبا و شعرا اور مندوبین نے شرکت کی۔ یہ سمینار دو اجلاسوں پر مشتمل تھا۔ پہلے اجلاس کی صدارت پروفیسر ناصر مرزا، وحشی سعید اور نذیر جوہر نے کی۔ نشست کا آغاز تلاوتِ کلام پاک سے کیا گیا جس کا فریضہ دانش حسین نے انجام دیا جب کہ نعت پاک پڑھنے کی سعادت مدثر حسین لٹو کو حاصل ہوئی۔ ادارے کے صدر غلام نبی کمار نے اپنے استقبالیہ خطبے میں سوسائٹی کے اغراض ومقاصد اور اس کی ادبی خدمات کے حوالے سے گفتگو کی اور اردو زبان و ادب کی موجودہ صورت حال پر بھی روشنی ڈالی۔ انھوں نے تمام مہمانوں کا استقبال کیا اور اردو زبان کے تئیں ان کے جذبے کو سراہا۔ اس اجلاس کے مقالہ نگاروں میں مقبول فیروزی، زاہد ظفر، نثار احمد چیچی، زمرودہ محمد میر، محمد الطاف ملک، ڈاکٹر منصور خوشتر، ڈاکٹر ریحان احمد قادری اور ڈاکٹر محمد سالم کے نام قابل ذکر ہیں جب کہ ڈاکٹر احسان عالم کے مقالے کی قرأت آصف علی نے کی۔ اس دوران تین کتابوں کی رسم رونمائی بھی انجام دی گئی جن میں فقیر عبدالرحیم شاہ پلوامی کی کتاب 'درِ وحدت' فاروق شاہین کی کتاب 'مولانا نورالدین قاری حیات اور کارنامے' اور سہ ماہی 'پنج آب' مدیر سالک جمیل براڑ، غلام نبی کمار کے نام قابل ذکر ہیں۔ اس کے بعد پروفیسر ناصر مرزا نے کنو ینز سمینار کی اردو زبان وادب میں نمایاں کارکردگی کی ستائش کی۔ انھوں نے سبھی مقالہ نگاروں کے مقالات پر مختصر مگر بہت جامع انداز میں تبصرہ کیا۔ پروفیسر ناصر مرزا نے جموں وکشمیر میں اردو تنقید کی سمت و رفتار کے حوالے سے بھی پر مغز گفتگو کی۔ دوسرے اجلاس میں محفل مشاعرہ کا اہتمام کیا گیا۔

روزنامہ 'میرا وطن' دہلی، 25 نومبر 2020

اعزاز و اکرام

رمیش پوکھریال نشنک واتاین لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ سے سرفراز

نئی دھلی: مرکزی وزیر تعلیم جناب رمیش پوکھریال نشنک کو ورچوول طریقے سے منعقدہ ایک تقریب میں واتاین لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ سے نوازا گیا۔ اس موقعے پر نہرو سینٹر، لندن کے ڈائرکٹر اور مشہور مصنف ڈاکٹر امیش ترپاٹھی

مہمان خصوصی تھے۔ واتاین کی چیئرمین، میرا کوشک، سینٹرل ہندی بورڈ، آگرہ کے نائب چیئرمین اور شاعر انل شرما جوشی اور وانی پرکاش کی ایگزیکیوٹیو ڈائرکٹر، آدیتی مہیشوری بھی اس موقعے پر موجود تھیں۔ ایوارڈ عطا کرنے کے لیے واتاین، برطانیہ کا شکریہ ادا کرتے ہوئے جناب پوکھریال نے کہا کہ کثرت میں وحدت بھارت کی شناخت ہے اور ہماری ثقافت میں زبانوں کی خصوصی اہمیت ہے۔ ثقافت اور زبان ایک دوسرے کے ساتھ مربوط ہیں جیسے جیسے زبان مضبوط ہوتی ہے ویسے ویسے ثقافت اور تہذیب کو توسیع حاصل ہوتی ہے۔ اسی طرح لکھنے سے ملک کی تہذیب اور ثقافت بھی مضبوط ہوتی ہے۔ وزیر تعلیم نے اس بات پر روشنی ڈالی کہ ادب ہمارا ثقافتی، روحانی اور تعلیمی ورثہ ہے جو ملک کو غیر مرئی انداز میں مضبوط کرتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ واتاین ایوارڈ نہ صرف ان کی تحریر اور ادب بلکہ ہندوستانی اقدار اور روایتوں کو بھی سند فراہم کرتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ان کی تحریریں، ان کے تجربات، جدوجہد، زندگی کے اقدار اور اصولوں سے متعلق ہیں۔ وزیر تعلیم نے کہا کہ ان کی تحریروں نے ہمیشہ غریبوں اور مظلوموں کو پیش کیا ہے اور ان کے بھی گیت ہندوستانی زندگی کے اقدار ہندوستانیت اور قومیت کے لیے وقف ہیں۔

پوکھریال کو اس سے پہلے ادب اور انتظامیہ کے شعبے میں کئی ایوارڈ ملے ہیں، جس میں اس وقت کے وزیر اعظم جناب اٹل بہاری واجپئی کے ذریعے ساہتیہ گورو سمان، سابق صدر ڈاکٹر اے پی جے عبدالکلام کے ذریعے بھارت گورو سمان، دہلی سرکار کے ذریعے گڈ گورننس ایوارڈ، ماریشس کے ذریعے گلوبل آرگنائزیشن آف پرسن آف انڈین اوریجن کے ذریعے قابل ذکر ایوارڈ اور ماحولیات کے تحفظ کے شعبے میں یوکرین میں اعزاز دیا گیا۔ جناب نشنک کو نیپال کے 'ہیمال گورو سمان' سے بھی نوازا جا چکا ہے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 25 نومبر 2020

عالمی یوم اردو کے موقعے پر 18 افراد قومی ایوارڈ سے سرفراز

نئی دھلی: نئی دہلی کے این ڈی تیواری بھون میں عالمی یوم اردو کے موقعے پر منعقدہ پروگرام میں ملک کے ان 18 افراد کو قومی ایوارڈ سے نوازا گیا، جنھوں نے اپنے میدان میں قابل ستائش شراکت کی ہے۔ ان میں اترپردیش کے مظفرنگر سے تعلق رکھنے والے سینئر صحافی اور سماجی کارکن گلفام احمد کو تعلیم، طویل مدتی منصفانہ صحافت اور اردو زبان کی ترقی کے میدان میں قابل ستائش کام کرنے پر مولوی عبدالحق ایوارڈ سے نوازا گیا۔ شاملی سے تعلق رکھنے والے سینئر صحافی کے پی ملک کو صحافت کے میدان میں ایوارڈ دیا گیا۔ اس کے علاوہ دہلی اقلیتی کمیشن کے سابق چیئرمین ڈاکٹر ظفرالاسلام کو لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ دیا گیا۔ حکیم عطاء الرحمٰن اجملی کو الامت یاسین میموریل اردو ایوارڈ سے نوازا گیا اور ہندوستان کی مختلف ریاستوں کے لوگوں کو بھی نوازا گیا جن میں جیلانی خان علی گڑھی، اشرف علی بستوی، ڈاکٹر منور حسن کمال، سید اجمل حسین، پرویز اشرفی، شرافت حسین قاسمی، کے پی تیاگی، ضمیر ہاشمی، وسیم راشد، علی عادل، محمد سراج عظیم، محمد اکرم، زاہدہ بیگم اور زاہد علی شامل ہیں۔ اس موقعے پر اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن کے قومی صدر ڈاکٹر سید احمد خان، پروفیسر اختر، یوڈی او کو آرڈینیٹر تحسین علی، پروفیسر عبدالحق، خواجہ محمد اکرام الدین، ڈاکٹر سید فاروق، مولانا محمد رحمانی، سید منصور، ڈاکٹر عبدالحق نے خطاب کیا۔ قومی پروگرام میں اترپردیش کے 4 افراد نے یہ اعزاز حاصل کیا۔ دہلی، گوا، راجستھان، پنجاب وغیرہ جیسی ریاستوں کو بھی نمائندگی ملی۔ نظامت ڈاکٹر خبیب اور صدارت پروفیسر خواجہ اکرام الدین نے کی۔

روزنامہ 'اخبار مشرق' دہلی، 10 نومبر 2020

محمد اسداللہ

ناگپور: ہر زبان پر اس سے متعلق تہذیب کے اثرات لازمی طور پر مرتب ہوتے ہیں اس لحاظ سے ادبی تراجم کی مدد سے ہم تہذیبی ہم آہنگی کے عمل کو فروغ دے سکتے ہیں۔ مراٹھی زبان کی مختلف اصناف میں پائے جانے والے ادب کی امتیازی خصوصیت دیہی زندگی اور زمینی حقیقتوں کی فنکارانہ عکاسی ہے۔ اردو میں اس کی بیشتر اصناف کا ادب تراجم کی مدد سے منتقل ہو چکا ہے۔ ان خیالات کا اظہار معروف انشائیہ نگار محمد اسداللہ نے یشونت راؤ چوہان پرتشٹھان، ناگپور کی جانب سے منعقدہ ایک تقریب میں کیا۔ مہاراشٹر کے اولین سابق وزیر اعلیٰ یشونت راؤ چوہان کی 36 ویں برسی کے موقعے پر منعقد کی گئی۔ اس تقریب میں محمد اسداللہ کو اردو مراٹھی تراجم کے سلسلے میں ان کی خدمت پر اس سال کے 'دور بھنگ' گورو پرسکار' شال اور کیسۂ زر سے نوازا گیا۔ محمد اسداللہ نے مراٹھی ادب کے انشائیوں اور ظریفانہ ادب کو اردو میں منتقل کیا ہے۔ مختلف رسائل میں شائع ہونے والے تراجم کے علاوہ ان کی تراجم کی دو کتابیں 'جمال ہمنشیں' اور 'دانت ہمارے' منظر عام پر آ چکی ہے۔

روزنامہ 'میرا وطن' دہلی، 30 نومبر 2020

فیاض فاروقی

پانی پت / جالندھری: اردو زبان کے میدان میں نمایاں خدمات انجام دینے والے پنجاب کے سینئر پولیس آفیسر فیاض فاروقی (آئی پی ایس) کی لکھی اردو شاعری کی کتاب کا اعتراف کرتے ہوئے پنجاب سرکار نے انھیں ساحر لدھیانوی ایوارڈ 2020 سے نوازا۔ ان کی کتاب 'کچھ چراغ مدھم سے' کو پنجاب بھر کی بہترین شاعری کی کتاب قرار دیا۔ اس سلسلہ میں پنجاب سرکار کی طرف سے بھاشا وبھاگ پٹیالہ میں ایوارڈ تقریب کا انعقاد کیا گیا جس میں مہمان خصوصی کے طور پر وزیر تعلیم راجندر سنگھ باجوہ نے فیاض فاروقی کو اردو کی بہترین شاعری کا ایوارڈ دیا۔ اس ایوارڈ میں 21 ہزار روپے نقد، شاہ اور توصیف نامہ شامل ہیں۔

اس موقعے پر شاعر فیاض فارقی نے کہا کہ میری اردو شاعری کی کتاب کو ساحر لدھیانوی ایوارڈ ملنا میرے لیے فخر کی بات ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہم نے ہندی اور اردو کو اپنے جگر پارے بنائے رکھا ہے اور انسانیت کو اپنی شاعری کا مقصد بنایا ہے۔ فیاض فاروقی نے ساری دنیا کے شاعروں اور ادیبوں سے اپیل کی کہ انسانیت کے جذبے کو فروغ دیں اور ہندوستانی تہذیب کو مضبوط بنائیں جس کی بنیاد محبت، قربانی اور ایثار پر ہے اور جس کا پیغام ساحر لدھیانوی نے دیا تھا۔ شاعر فیاض فاروقی نے کہا کہ اردو زبان پنجاب کی گنگا جمنی تہذیب کی دین ہے جو آج بھی ہر ریاست میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ انھوں نے زور دیتے ہوئے کہا کہ کوئی بھی زبان کسی خاص مذہب، فرقے یا ذات کی جاگیر نہیں ہوتی ہے، جو بھی اسے بولے، سمجھے اور لکھے اسی کی ہو جاتی ہے، اس لیے ملک کی

تمام زبانوں کا احترام کیا جانا چاہیے۔ قابل ذکر ہے کہ فیاض فاروقی کی اردو شاعری عوام کی نہ صرف ترجمانی کرتی ہے بلکہ ان کی شاعری میں عوام الناس اپنے دلی جذبات اور احساسات کو محسوس کرتے ہیں۔ آپ کے اشعار ہندی اردو دونوں زبانوں کے لوگوں میں احساسات، جذبات، دکھ، سکھ، غم و ملال، جرأت اظہار کے ساتھ ماضی کے تجربات اور مستقبل کے لائحہ عمل کے لیے مشعل راہ ثابت ہو رہے ہیں۔ یہ بھی قابل ذکر ہے کہ فیاض فاروقی اس وقت ضلع جالندھر میں آئی جی کے عہدے پر فائز ہیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 28 نومبر 2020

جلال قریشی

فیروز آباد: 'یادِ رفیع' کے موقعے پر کاملی اردو مرکز کے زیر اہتمام اردو کے فروغ میں اہم کردار ادا کرنے والے ادیب و شاعر الحاج سلطان جلال الدین قریشی کو 'کاملی ایوارڈ 2020' سے سرفراز کیا گیا، اس موقعے پر حالی پبلک اسکول میں منعقد تقریب میں مرکز کے صدر میاں بصارالدین نے شال اڑھا کر ان کا استقبال کیا۔ تقریب کی صدارت

کر رہے صغریٰ بیگم انٹر کالج کے سابق منیجر افضال احمد نے ان کو کاملی ایوارڈ کے طور پر مومنٹو اور توصیفی سند پیش کرتے ہوئے کہا کہ ہمیں خوشی ہے کہ ہمارے شہر میں بھی اردو کے اعلیٰ معیار کے ادیب و شاعر موجود ہیں، کاملی اردو مرکز کی اس پہل پر انھوں نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اردو ادب کو زندہ رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم اپنے ادیب وشعرا کی ستائش کریں، ان کی حوصلہ افزائی کریں اور اپنی نئی نسل میں اردو پڑھنے، لکھنے کا شوق پیدا کریں۔ ایوارڈ حاصل کرنے کے بعد حاضرین کو خطاب کرتے ہوئے الحاج جلال قریشی نے کہا کہ مجھے خوشی ہے کہ مجھے 'کاملی ایوارڈ' کا مستحق سمجھا گیا، اردو کے متعلق انھوں نے کہا کہ جدید دور کچھ ایسا آیا ہے کہ اب والدین اپنے بچوں کو اردو پڑھانا نہیں چاہتے، وجہ یہ ہے کہ اس میں انھیں کوئی مالی منفعت نظر نہیں آتی۔ یعنی غلطی نئی نسل کی نہیں بلکہ ہماری اپنی ہے، یہ ہماری ہی ذمے داری ہے کہ ہم نئی نسل کو اردو سے روشناس کرائیں۔

روزنامہ 'میرا وطن' دہلی، 17 نومبر 2020

ایک شام رفیقوں کے نام

رامپور: گذشتہ شب یوم اردو کی نسبت سے صولت پبلک لائبریری کے 'حمایت ہال' میں 'ایک شام رفیقوں کے ساتھ' کے عنوان سے ایک خوبصورت و پروقار محفل ادب آراستہ کی گئی۔ فخرالدین میموریل کمیٹی اتر پردیش کے سابق چیئرمین ڈاکٹر حسن احمد نظامی کے زیر صدارت منعقدہ تقریب میں نامور دانشوروں، ادیبوں، شاعروں، صحافیوں اور سماجی کارکنان کی بہترین اور بیش قیمت علمی، ادبی اور سماجی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے انھیں 'اردو ایوارڈ' کے ساتھ 'ردائے فضیلت' سے نوازا گیا۔ اس پروقار تقریب میں مہمان خصوصی کے طور پر نامور شاعر و ادیب طالب رامپوری مدیر 'مہکتا آنچل' دہلی) نے شرکت کی جب کہ مہمان ذی وقار کی حیثیت سے ایس فضیلت، اظہر عنایتی، مظفر اللہ خاں، محمد زبیر شمسی، اور ڈاکٹر الف ناظم موجود رہے۔ تقریب کے پہلے دور کی نظامت کے فرائض مسلم ڈگری کالج مراد آباد کی معاون پروفیسر ڈاکٹر رباب انجم اور آکاشوانی رامپور اردو سروس کی اناؤنسر فائزہ زبیر نے ادا کیے جب کہ دوسرے دور میں منعقدہ شعری نشست کی نظامت کی ذمے داری معروف شاعر سید شکیل غوث نے بحسن وخوبی نبھائی۔ لائبریری سکریٹری مولانا محمد اسلم جاوید القاسمی کی تلاوت کلام الٰہی اور کہنہ مشق شاعر اظہر عنایتی کے نذرانہ نعت سے شروع ہونے والی بزم ادب کی ابتدا میں لائبریری کے صدر سین شمین عالم نے تقریب کے انعقاد کی غرض وغایت پر روشنی ڈالتے ہوئے تمام مہمانان کا خیر مقدم کیا۔ اس موقعے پر خاص مہمانان نے اپنے تاثرات وخیالات کا اظہار کرتے ہوئے لائبریری انتظامیہ کی جانب سے لائبریری عمارت کی جدید کاری اور تزئین وترتیب پر تشفی کا اظہار کیا اور اپنے تعاون کا یقین دلایا۔

روزنامہ 'اخبار مشرق' دہلی، 10 نومبر 2020

یوم اردو تقریب میں طلبا وطالبات کو پیش کیے گئے انعامات

سنبھل: مشن انٹرنیشنل اکادمی میں یوم اردو تقسیم انعامات کا انعقاد کیا گیا جس میں 2 نومبر سے 9 نومبر تک مختلف تعلیمی اداروں میں منعقدہ پروگرام میں حصہ لینے والے طلبا وطالبات کو انعامات پیش کیے گئے پروگرام کا آغاز محمد آیان نے قرآن کریم کی تلاوت سے کیا۔ بعد میں محمد علی، زید رضا، سلمان نبی اور ظفر علی نے نعت پاک پیش کی۔ اس موقعے پر پرنسپل میری ڈی سوزا نے مہمانوں کے استقبال میں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اس موقعے پر طلبا وطالبات کے علاوہ مقالہ نگاروں اور معزز شخصیات کو اعزاز سے نوازا گیا۔ مشیر خاں ترین نے یوم اردو کی تقریب کے حوالے سے تفصیلات پیش کیں اور کہا کہ اردو محبت و بھائی چارہ کی زبان ہے۔ اس کو عام کرنا ہم سب کا اولین فریضہ ہے۔ پروگرام میں محترمہ شبانہ کوثر، شان رب، پروین تاج، درخشاں پروین، نہال احمد، جنید شیخ، محمد تنظیم، فرح دیبہ، شائستہ، میر شاہ حسین، تنویر اشرفی، توفیق آزاد ایڈووکیٹ، امتیاز خاں، وامق قمر برکاتی، مزمل خاں مزل، عبدالحفیظ خاں وغیرہ شریک رہے۔

روزنامہ 'سچ کی آواز' دہلی، 25 نومبر 2020

سلیم پور میں نعتیہ مقابلہ وتقسیم انعامات کا انعقاد

نئی دہلی: عوامی ایکتا ویلفیئر ایسوی ایشن دہلی واور یکل پبلک اسکول کے زیر اہتمام دہلی کا عظیم الشان نعتیہ مقابلہ و انعامی جلسہ سیم پور میں منعقد ہوا۔ مہمان خصوصی مولانا محمد ابرار بستوی اور حکیم سید احمد خان صاحب سکریٹری جنرل آل انڈیا یونانی طبی کانگریس وانچارج یونانی میڈیکل سینٹر صفدر جنگ اسپتال کی صدارت میں منعقد ہوا۔ کنوینر پروگرام حکیم عطاالرحمٰن اجملی جنرل منیجر اے اینڈ ایس فارمیسی دہلی نے بتایا کہ اس مقابلے میں 120 شرکا نے شرکت کی۔ فاتحین شرکا میں انعامات وسند تقسیم کی گئی۔ اس موقعے پر حکیم مرتضٰی دہلوی، حکیم محمد شازان، یوسف ملک، محمد شارق، محمد آصف خان، زبیر شیخ، حافظ لقمان چودھری، مرزا نواب بیگ کے علاوہ دیگر حضرات موجود تھے۔

روزنامہ 'اخبار مشرق' دہلی، 30 نومبر 2020

رسم اجرا

مقالات سرسید

علی گڑھ: سرسید اکادمی اور دارا شکوہ مرکز تفاہم بین المذاہب وڈائیلاگ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے دو اہم ادارے ہیں جو کتابوں کی اشاعت کے ساتھ ساتھ عوام پر بھی براہِ راست

توجہ مرکوز کرتے ہیں تاکہ سماج کو مجموعی طور سے فائدہ ہو۔ کتابوں کو دیگر ہندوستانی زبانوں میں بھی ترجمہ کرکے

شائع کرتے ہیں تاکہ سرسید اور علی گڑھ تحریک کا پیغام زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچ سکے۔ ان خیالات کا اظہار اے ایم یو کے وائس چانسلر پروفیسر طارق منصور نے سرسید اکادمی کے زیر اہتمام 'مقالات سرسید' سمیت دیگر کتابوں اور مونوگراف کے آن لائن اجرا کی تقریب سے خطاب کرتے ہوئے کیا۔ وائس چانسلر کے بدست 'مقالات سرسید' (مولانا محمد اسماعیل پانی پتی)، جلد اول، 'علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کیلنڈر- 1932'، 'تفہیم سرسید' (الطاف احمد اعظمی)، 'شیخ محمد عبداللہ (پاپا میاں)، از ڈاکٹر محمد فرقان'، 'جسٹس سر شاہ محمد سلیمان از ڈاکٹر اسد فیصل فاروقی اور 'مولوی چراغ علی' از ڈاکٹر رضا عباس کا اجرا عمل میں آیا۔ پروفیسر منصور نے کہا کہ اے ایم یو کے صدی سال میں سرسید اور علی گڑھ تحریک سے متعلق قدیم کتابوں کی اشاعت باعث مسرت ہے۔ انھوں نے کہا کہ اشاعتوں کا معیار بلند ہونا چاہیے، ساتھ ہی کتابوں کا ہندوستانی اور انگریزی سمیت دیگر غیر ملکی زبانوں میں ترجمہ بھی ہونا چاہیے تاکہ سرسید اور علی گڑھ تحریک کا پیغام دور دراز تک پہنچے۔ ملٹی ڈسپلنری یونیورسٹی ہونے کے باعث اے ایم یو میں یہ کام آسان ہے۔ پروفیسر منصور نے کہا کہ سرسید اکادمی میں ریسرچ کا سلسلہ بھی شروع کیا جائے۔ انھوں نے کہا کہ شیخ محمد عبداللہ پاپا میاں کو ہندوستان میں خواتین کی جدید تعلیم کا بابائے آدم کہا جاسکتا ہے۔ جسٹس سر شاہ محمد سلیمان اور مولوی چراغ علی، علی گڑھ تحریک کا اہم باب ہیں۔ ان کتابوں کی اشاعت کے لیے اکادمی کے ذمہ داران مبارکباد کے مستحق ہیں۔ اس سے قبل 'مقالات سرسید' پر اظہار خیال کرتے ہوئے پروفیسر شافع قدوائی (صدر، شعبۂ ترسیل عامہ، اے ایم یو) نے کہا کہ مولانا اسماعیل پانی پتی کی مرتب کردہ 'مقالات سرسید' 1955 میں شائع ہوئی تھی جس میں نقل نویسوں کی غلطیوں کے باعث کئی کمیاں رہ گئی تھیں۔ سرسید اکادمی نے یونیورسٹی کے صدی سال میں اس کتاب کی اغلاط کو درست کرکے اسے شائع کیا ہے۔ پروفیسر شافع قدوائی نے کہا کہ اس اشاعت کی دوسری اہم بات یہ ہے کہ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں کئی مضامین جو سرسید کے نام سے شائع نہیں ہوئے تھے، انھیں سرسید کے مضامین میں شامل کردیا گیا ہے۔ مشہور انگریزی انشائیہ نویس جوزف اڈیسن اور رچرڈ اسٹیل کے انشائیوں کے تراجم جن کی صراحت خود سرسید نے کی ہے، انھیں مولانا اسماعیل پانی پتی نے 'مقالات سرسید' میں شامل کرلیا تھا۔ اس غلط مبحث کو سرسید اکادمی نے اپنی تازہ اشاعت میں دور کردیا ہے۔ پروفیسر قدوائی نے کہا کہ جسٹس سر شاہ محمد سلیمان کے انتقال پر مشہور نوبل انعام یافتہ سائنسداں سی وی رمن نے 1941 میں تعزیتی تحریر لکھی تھی جو 'نیچر' میں شائع ہوئی تھی۔ وہ اے ایم یو کے وی سی رہے ہیں۔ ان پر اور شیخ محمد عبداللہ پاپا میاں و مولوی چراغ علی پر مونوگراف کی اشاعت ایک گراں قدر علمی اضافہ ہے۔ پروفیسر عبدالرحیم قدوائی نے 'تفہیم سرسید' پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ مصنف کتاب الطاف احمد اعظمی نے ایک متوازن رویہ اختیار کرتے ہوئے سرسید کے افکار کے ارتقا کا مطالعہ کیا ہے۔ پروفیسر قدوائی نے کہا کہ سرسید کی مذہبی فکر روایتی فکر سے مختلف ہے۔ انھوں نے تقلید کی مخالفت کی اور حریت فکر کی دعوت دی۔ سرسید نے تعقل پسندی پر زور دیتے ہوئے آزاد تحقیق کی بنیاد ڈالی۔ الطاف احمد اعظمی نے سرسید کا بے جا دفاع کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اس اعتبار سے یہ کتاب سرسید شناسی میں ایک گراں قدر اضافہ ہے جو ہمیں ان کی فکر کے بنیادی نکات کی جانب متوجہ کرتی ہے۔

روزنامہ 'میرا وطن'، دہلی 17 نومبر 2020

اردو کی چند اہم داستانیں ایک مطالعہ

علی گڑھ: اردو ادبی و ثقافتی زبان ہے۔ اس میں قدیم داستانوں کا غیر معمولی سرمایہ ہے۔ ان خیالات کا اظہار مسلم یونیورسٹی کے معروف استاد پروفیسر صغیر افراہیم نے کیا۔ وہ آج شعبہ اردو کی ریسرچ اسکالر صبا نوشاد کی تصنیف 'اردو کی چند اہم داستانیں: ایک مطالعہ' کی رسم اجرا کے موقعے پر دھرم پور میں منعقد تقریب کو خطاب کررہے تھے۔ انھوں نے مزید کہا کہ قدیم داستانیں جو ہزار ہا صفحات پر پھیلی ہوئی ہیں ان کے غائر مطالعہ کے بعد صبا نوشاد نے بہت ہی محنت کے ساتھ یہ کام کیا ہے۔ جو طلبا جے آر ایف اور نیٹ کے امتحانات میں شرکت کرنے کے خواہاں ہیں، ان کے لیے بھی یہ کتاب بہت مفید ثابت ہوگی۔ انھوں نے صبا نوشاد کو مبارکباد دیتے ہوئے کہا کہ مذکورہ کام داستانوں کے مطالعہ کرنے والوں کے لیے مزید آسانیاں فراہم کرے گا اور تحقیق کے لیے مشعل راہ بنے گا۔

سابق ممبر اسمبلی و ویک بنسل نے انجمن محبان اردو علی گڑھ کے منتظمین کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ اردو کی داستانوں کے سلسلہ میں آج میری معلومات میں غیر معمولی اضافہ ہوا ہے۔ انھوں نے معروف کانگریسی رہنما نوشاد قریشی کی بیٹی صبا نوشاد کے کام کی ستائش کی اور کہا کہ اس میں نوشاد قریشی کی کاوشوں کا ثمرہ ہے۔ صبا نوشاد کی سپروائزر ڈاکٹر سیما صغیر نے کہا کہ صبا نوشاد بہت لائق طالبہ رہی ہیں۔ اس سے قبل بھی ان کی ایک کتاب منظر عام پر آچکی ہے اور ان کی یہ کوشش مبارکباد کی مستحق ہے۔ اس موقعے پر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ ہندی کے معروف استاد پروفیسر عبدالعلیم نے بھی خطاب کرتے ہوئے کتاب کے تعلق سے اپنے تاثرات کا اظہار کیا اور صبا نوشاد کو مبارکباد پیش کی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 18 نومبر 2020

مولانا اسماعیل میرٹھی کی حیات وخدمات پر مشتمل یادگار مجلّہ

مظفر نگر: اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن کے زیر اہتمام مظفر نگر کے یوگیندر پوری واقع اردو گھر میں ایک پروگرام کا انعقاد عمل میں آیا۔ اس موقعے پر ماہر تعلیم مولانا اسماعیل میرٹھی کی حیات وخدمات پر مشتمل ایک یادگار مجلّہ کا اجرا عمل میں آیا۔ اردو ٹیچرس ویلفیئر ایسوسی ایشن اور اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن کے عہدیداران و ذمے داران نے مشترکہ طور پر اس یادگار مجلّہ کا اجرا کیا۔ اس موقعے پر یوڈی او کے ضلع صدر کلیم تیاگی نے تمہیدی کلمات میں کہا کہ مولانا محمد اسماعیل میرٹھی نے بچوں کے لیے اردو میں بہت سی درسی کتابیں تحریر کیں۔ ان درسی کتب کے زیادہ تر مضامین، نظمیں، حکایات اور کہانیاں خود مولوی محمد اسماعیل میرٹھی کی تصنیف کردہ ہیں اور کچھ فارسی اور انگریزی سے ماخوذ ہیں۔ مولوی محمد اسماعیل میرٹھی کی مرتب کردہ یہ درسی کتابیں ایک صدی گزرنے کے بھی بچوں کے ادب میں مقبولیت اور اہمیت کی حامل ہیں اور آج بھی بڑے ذوق وشوق سے پڑھی جاتی ہیں۔ نائب صدر مولانا محمد موسیٰ قاسمی نے کہا کہ مولانا اسماعیل میرٹھی نے بچوں کے لیے بہت عمدہ اور معیاری نظمیں اور اشعار انھوں نے بچوں کے لیے لکھے ہیں۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ صرف بچوں کے شاعر تھے۔ اردو انو وادک راجیہ کرمچاری سنگھ کے صوبائی نائب صدر تحسین علی نے کہا کہ مولانا اسماعیل میرٹھی کی ادبی خدمات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ وہ اردو ادب کا ایک ناقابل فراموش کردار ہیں۔ ماسٹر شعیب نے کہا کہ محمد اسماعیل میرٹھی کا نام اردو کے افق پر روشن رہے گا۔ لوح مزار پر ان کا نام کندہ رہے یا نہ رہے لوح ذہن پر مولوی اسماعیل میرٹھی کا نام ہمیشہ زندہ اور محفوظ رہے گا۔ شرکا نے اس مجلّہ کو ان کے لیے خراج عقیدت کے طور پر پیش کرتے ہوئے امید ظاہر کی کہ سبھی لوگ اس سے استفادہ کریں گے۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 18 نومبر 2020

علی گڑھ تحریک اور سرسید احمد خاں کی حیات وخدمات پر دو کتابوں کا اجرا

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی صدی تقریبات کے تحت علی گڑھ تحریک اور سرسید احمد خاں علیہ الرحمہ کی حیات وخدمات پر مبنی دو خاص کتابوں کا اجرا اے ایم یو رجسٹرار مسٹر عبدالحمید آئی پی ایس نے کیا۔ 'اے ایم یو: دَ فاؤنٹ آف مسلم ریناساں' ترتیب وتدوین از محمد حارث بن منصور اور 'علی گڑھ مسلم یونیورسٹی: مرکز علم ودانش' ترتیب و تدوین از یاسر علی خاں کا اجرا ایک سادہ تقریب میں عمل میں آیا۔ دونوں کتابوں میں وائس چانسلر پروفیسر طارق منصور کا پیغام، رجسٹرار مسٹر عبدالحمید کا تحریر کردہ مقدمہ اور پروفیسر اے آر قدوائی کے ابتدائی کلمات شامل ہیں۔ کتاب کے اجرا کے موقعے پر پروفیسر اے آر قدوائی اور ڈاکٹر فائزہ عباسی موجود تھے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 21 نومبر 2020

سالنامہ آئینۂ اردو صحافت

مرادآباد: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے قیام کے سو سال مکمل ہونے کا جشن مناتے ہوئے بانی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سرسید احمد خاں کو سچا خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے ان کی خدمات کا اعتراف کرنے کی غرض سے شہر کی تاریخی عمارت شوکت باغ میں جشن یوم اردو صحافت کا انعقاد کیا گیا۔ اس موقعے پر ہندی واردو سالنامہ آئینۂ اردو صحافت کی رسم اجرا بھی عمل میں آئی۔ اس پروگرام میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے ممبر پارلیمنٹ ڈاکٹر شفیق الرحمٰن برق نے مہمان اعزازی کی حیثیت سے ممبر پارلیمنٹ ڈاکٹر ایس ٹی حسن، ممبر اسمبلی دیہات حاجی اکرام قریشی، صولت لائبریری رامپور کے صدر ش عالم نے شرکت کی۔ نظامت کے فرائض آکاش وانی رامپور کی اناؤنسر ڈاکٹر رباب انجم نے انجام دیے۔ پروگرام کے صدر ممبر پارلیمنٹ ڈاکٹر شفیق الرحمٰن برق نے اپنی تقریر میں اردو صحافیوں کے جنگ آزادی میں ادا کیے گئے کردار پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ جنگ آزادی میں ان صحافیوں نے ہندوستان کے عوام میں جو جوش اور ولولہ آزادی کے لیے بھرا اسی کا ثمرہ ہے کہ آج ہم آزاد ہندوستان میں سانس لے رہے ہیں۔ انھوں نے اردو کو بڑھاوا دینے کے ساتھ ہی سبھی سے بچوں کو اچھی تعلیم دلانے کی اپیل کی اور تعلیم کی خدمت کے لیے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے بانی سرسید احمد خاں کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ زندہ دل قوم ہمیشہ تکلیف وپریشانیوں سے مقابلہ کرتی ہے۔ مہمان خصوصی ممبر پارلیمنٹ ڈاکٹر ایس ٹی حسن نے سالنامہ کی رونمائی کرتے ہوئے کہا کہ باہمی اتحاد کے ساتھ ہی مشکلات کا سامنا کیا جا سکتا ہے۔ ہندوستان فرقہ وارانہ ہم آہنگی کا ملک ہے اور تمام ہی مذاہب وطبقوں کو ساتھ لے کر ہی ملک کی ترقی ہو سکتی ہے۔ اس پروگرام کے مہمان ذی وقار ممبر اسمبلی حاجی اکرام قریشی نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ رامپور صولت لائبریری کے صدر ش عالم نے اردو کی خدمت کے لیے پروگرام کے کنوینر مرزا مرتضیٰ اقبال کو اعزاز سے سرفراز کیا۔ شرم جیوی پترکار یونین کے ضلع صدر محمد راشد صدیقی نے مہمانوں کا استقبال کیا اور ان کا شکریہ ادا کیا، پروگرام میں مہمانان کو نشان اعزاز سے بھی نوازا گیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 24 نومبر 2020

جون ایلیا ہونا کوئی مذاق نہیں

امروهه: ڈاکٹر نیہا اقبال کی دوسری تصنیف 'جون ایلیا ہونا کوئی مذاق نہیں' کی رسم رونمائی ہاشمی گرلس پی جی کالج میں انجمن ترقی اردو کے زیر اہتمام منعقد ایک مختصر تقریب کے دوران نائب صدر انجمن ڈاکٹر سراج الدین ہاشمی کے بدست عمل میں آئی۔ قابل ذکر ہے کہ ہاشمی گرلس ڈگری کالج امروہہ شعبہ اردو کی طالبہ رہیں ڈاکٹر نیہا اقبال نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے جون کی ادبی خدمات پر پی ایچ ڈی مکمل کی جس کے بعد پہلی تصنیف جون ایلیا حیات و شاعری کے بعد اب دوسری تصنیف 'جون ایلیا ہونا کوئی مذاق نہیں' منظر عام پر آئی ہے۔ اس موقعے پر نائب صدر انجمن ترقی اردو اور چیئرمین ہاشمی ایجوکیشنل گروپ ڈاکٹر سراج الدین ہاشمی نے نیہا اقبال کی ادبی خدمات پر خوشی کا اظہار کیا۔ ڈاکٹر ہاشمی نے کہا کہ ڈاکٹر نیہا اقبال نے چھوٹی سی عمر میں اردو ادبی حلقوں میں مقام بنایا، وہ ہم سب کے لیے قابل فخر ہے۔ انھوں نے کہا کہ نیہا کی کامیابی میں ان کی والدہ ماجدہ کا بھی اہم کردار ہے اور ڈاکٹر نیہا اقبال کی کامیابی ان کی والدہ کی دعاؤں اور اعتماد کا ہی نتیجہ ہے۔ ڈاکٹر ہاشمی نے ڈاکٹر نیہا اقبال کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے کہا کہ جون ایلیا جیسے عظیم شاعر پر تحقیق کرنا اپنے آپ میں کارنامہ ہے۔ ڈاکٹر نیہال اقبال نے اپنے خطاب کے دوران انجمن ترقی اردو ہاشمی ایجوکیشنل گروپ کا شکریہ ادا کیا۔ انھوں نے کہا کہ ہاشمی ادارے کی طالبہ ہونا میرے لیے فخر کی بات ہے۔ میں جو کچھ بھی اردو ادب کے تعلق سے سیکھنے اور حاصل کرنے کی کوشش کررہی ہوں، اس سب کی شروعات ہاشمی پی جی کالج سے ہی ہوئی۔ اس موقعے پر کارگزار پرنسپل ڈاکٹر رضوانہ کلثوم صدر شعبہ بی ایڈ ڈاکٹر سنت کمار مشرا ڈاکٹر آصف علی نور، محمد اویش، منوج کمار وغیرہ موجود رہے۔

روزنامہ 'ہچ کی آواز' دہلی، 21 نومبر 2020

کہانی پنجاب

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے جدید ہندوستانی زبانوں کے شعبہ کے سربراہ ڈاکٹر کرانتی پال کی ادارت میں موقر ادبی مجلّہ 'کہانی پنجاب' نے اپنے 100 ویں شمارے کی تیسری جلد کی اشاعت کے ساتھ ہی ایک اور سنگ میل حاصل کرلیا ہے۔ اے ایم یو کے شعبۂ ترسیل عامہ کے سربراہ پروفیسر شافع قدوائی نے اس شمارے کا اجرا کرتے ہوئے کہا کہ پنجابی زبان کا یہ رسالہ ادبی تنقید اور تخلیقات کے لیے خاص شہرت رکھتا ہے اور نئے ادبی موضوعات پنجابی زبان وادب کے قارئین کے سامنے پیش کرتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اس شمارے میں ہندی، اردو اور یورپی ادب کی درجنوں نثری تخلیقات کا پنجابی ترجمہ شامل ہے۔ اس میں ہنگری کے مشہور قلمکار نوبل انعام یافتہ امرے کیرتج کے ناول کا پنجابی ترجمہ بھی ہے۔ ڈاکٹر کرانتی پال نے کہا کہ امرے کی کہانی، وحشیانہ جبر کے خلاف فرد کے تجربات واحساسات کو اجاگر کرتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ 'کہانی پنجاب' میں اصغر وجاہت کے پاکستانی سفرنامہ کا ترجمہ بھی شامل ہے جو پنجابی قارئین کو مشہور ہندی قلمکار، کہانی نویس، ڈرامہ نویس اور دستاویزی فلموں کے پروڈیوسر کی تحریر سے تعارف کرتا ہے۔ اس شمارہ میں قرۃ العین حیدر، معین احسن جذبی، آل احمد سرور اور شہریار جیسے ادبا وشعرا کے انٹرویو شامل ہیں۔ اس کے علاوہ دوستووسکی، بلراج ساہنی، انتظار حسین، جگن گل، مہتری پشپا، جوگندر پال اور چن چندرا کے مکالموں پر مبنی ابواب بھی شامل ہیں۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 23 نومبر 2020

شہنشاہ تغزل جگر مرادآبادی

رامپور: رادھا روڈ جی ایم پلازہ بلڈنگ میں گلوبل سوشل ویلفیئر سوسائٹی کی جانب سے جشن شگفتہ غزل کے موقعے پر ڈاکٹر شگفتہ غزل کی تصنیف 'شہنشاہ تغزل جگر مرادآبادی'

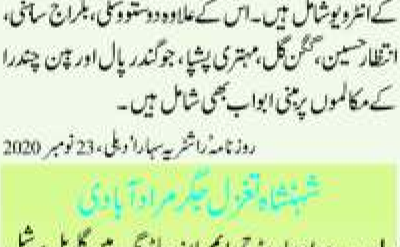

کا اجرا گلوبل سوشل ویلفیئر سوسائٹی کے صدر محمد زبیر شمسی کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ تلاوت کلام الٰہی سے اس تقریب کا انعقاد عمل میں آیا۔ کلیدی خطبہ ڈاکٹر شریف احمد قریشی نے پیش کرتے ہوئے کہا کہ ڈاکٹر شگفتہ غزل کی شخصیت ادبی ذوق اور تصنیف کی کثرت کو دیکھ کر خوش گوار حیرانی

بھی ہوتی ہے اور مسرت بھی ہوتی ہے۔ بریلی سے آئے مہمان ثروت پرویز سہسوانی نے اپنا کلام پیش کیا اور ان کو مبارکباد پیش کی۔ بریلی سے تعلق رکھنے والی سماجی کارکن نیلوفر ملک نے ڈاکٹر شگفتہ غزل کی زندگی کے اہم گوشوں پر روشنی ڈالی۔ ڈاکٹر شگفتہ غزل نے اپنے ادبی حالات پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ جگر کی شاعری سے مجھے بے حد لگاؤ ہے۔ ناظم جلسہ کی معاونت کرنے والے الف ناظم نے کہا کہ ڈاکٹر شگفتہ غزل نے نہ صرف اپنی شاعری کے میدان میں یادگار نقوش چھوڑے ہیں بلکہ نثر کے میدان میں بھی اہم خدمات انجام دی ہیں۔ پروگرام کو آرڈی نیٹر محمد زبیر شمسی نے کہا کہ اردو کو بڑھاوا دینے کے لیے اس طرح کے پروگرام ہوتے رہنے چاہئیں۔ صدارتی خطاب میں ڈاکٹر حسن احمد نظامی نے کہا کہ اردو ادب میں خاتون قلم کاروں کی تعداد کم ہو رہی ہے۔ شعیب رضا خاں وارثی، س ش عالم، ڈاکٹر رضیہ پروین، الیس فضیلت، اظہر عنایتی، آل احمد سرور نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ نظامت کے فرائض سید شکیل غوث نے انجام دیے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 23 نومبر 2020

عشق ہی محبوب ہے

امروهه: شہر کے سینئر شاعر میثم زیدی امروہوی کے شعری مجموعہ 'عشق ہی محبوب ہے' کی رسم اجرا کی تقریب بر مکان نوازش نقوی، محلہ کالی پگڑی، امروہہ منعقد ہوئی جس کی سرپرستی جناب مولانا سید محمد سیادت نقوی صاحب نے کی۔ صدارت شہر کے استاد شاعر سید مسرور حسن (جوہر) نے کی۔ رسم رونمائی مولانا سید محمد سیادت نقوی کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ مہمانانِ خصوصی کے طور پر سید ابوالحسنین نقوی، سید منعیم رضوی، ڈاکٹر ناشر نقوی، ڈاکٹر مصباح احمد صدیقی، ڈاکٹر جمشید کمال، مسلم کمیٹی کے سابق صدر حاجی خورشید موجود رہے۔ نظامت کے فرائض نوجوان شاعر سید شیبان قادری نے انجام دیے۔ مولانا سید محمد سیادت نقوی نے کہا کہ غزل اردو ادب کی بڑی نازک صنف ہے اور میثم زیدی نے اس کی زلفوں کو بڑی فنکاری اور خوبصورتی کے ساتھ سنوارا ہے۔ ڈاکٹر مصباح احمد صدیقی نے میثم زیدی کے فن پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ غزل کی تمام نزاکتوں کا خیال رکھتے ہوئے میثم زیدی نے اپنا کلام یکجا کیا ہے۔ مجھے امید ہے کہ ادبی دنیا میں ان کا شعری مجموعہ خوب پذیرائی حاصل کرے گا۔

روزنامہ 'میرا وطن'، 23 نومبر 2020

ڈاکٹر عبدالعزیز عرفان کی تین کتابوں کا اجرا

اورنگ آباد: رومان پبلی کشن اور تکمیل بک ہاؤس اورنگ آباد کے اشتراک سے بروز بدھ 18 نومبر 2020 بمکان ڈاکٹر رفیع الدین ناصر ڈاکٹر عبدالعزیز عرفان کی تین اہم تاریخی

کتابوں کا اجرا بدست معروف افسانہ نگار نورالحسنین عمل میں آیا جن میں 'ٹیپو سلطان' 'پہلی جنگ آزادی 1857 اور بہادر شاہ ظفر' اور 'گلدستہ آزاد' شامل ہیں۔ موصوف کی ان تینوں کتابوں کو تین اردو اکادمیوں نے مالی تعاون سے نوازا ہے۔ 'ادب اطفال کے درخشاں ستارے' کو مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکادمی ممبئی، 'گلدستہ آزاد' کو فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی لکھنؤ کے تعاون سے شائع کیا ہے اور 'ٹیپو سلطان' کو کرناٹک اردو اکادمی بنگلور نے شائع کیا ہے۔ واضح ہو کہ رسم اجرا کی اس پروقار تقریب میں ڈاکٹر اظہرالدین، ڈاکٹر یوسف صابر، ڈاکٹر رفیع الدین ناصر، ڈاکٹر عبدالعزیز عرفان، شیخ عبدالصمد سر، سرتاج شاکر، محمد عرفان خان سوداگر، معین عبدالرزاق سر، محمد مصطفیٰ الخیری، محمد سلیم خان ندوی، عبداللہ سر، محمد اکبر قادری اور محمد نعمان خان سوداگر کے علاوہ کثیر تعداد میں لوگ موجود تھے۔ ڈاکٹر رفیع الدین ناصر کے کلمات تشکر پر اس پروگرام کا اختتام عمل میں آیا۔

رپورٹ: محمد مصطفیٰ الخیری ندوی، صدر شعبہ عربی، سرسید کالج، اورنگ آباد،

22 نومبر 2020

وفیات

مولانا ڈاکٹر کلب صادق

لکھنؤ: مولانا کلب صادق 81 برس کی عمر میں انتقال کر گئے وہ طویل عرصے سے زیر علاج تھے تاہم جانبر

نہ ہو سکے اور 24 نومبر 2020 کو لکھنؤ کے ایک اسپتال میں آخری سانس لی۔ قابل ذکر ہے کہ گذشتہ 17 نومبر کو سانس لینے میں دقت اور نمونیا کی شکایت کے بعد انھیں اسپتال میں داخل کیا گیا تھا۔ جانچ کے دوران پتہ چلا کہ نمونیا کے ساتھ ہی وہ یو ٹی آئی اور سیپٹک شاک میں مبتلا ہیں۔ ویسے مولانا کلب صادق طویل مدت سے علیل تھے اور کئی بار وہ اسپتال سے صحت یاب ہو کر باہر آئے تھے، لیکن اس مرتبہ وہ صحت یاب نہیں ہو سکے۔ ملک اور بیرون ملک مشہور مولانا صادق تعلیم، خصوصاً لڑکیوں اور کمزور بچوں کی تعلیم کے لیے ہمیشہ سرگرم رہے۔ وہ یونٹی کالج اور ایرا میڈیکل کالج کے ذمے دار بھی تھے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 25 نومبر 2020

پروفیسر عبدالرحمٰن مومن

نئی دهلی: معروف دانشور پروفیسر عبدالرحمٰن مومن کے 23 نومبر کو بنگلور میں انتقال ہو گیا۔ وہ انگریزی اور اردو میں درجنوں کتابوں کے مصنف تھے جن میں ان کی سات بہت مشہور اور مقبول عام ہیں۔ برطانیہ، امریکہ، چین، روس، ترکی، آسٹریا، جرمنی، ملیشیا، مصر سمیت تقریباً 16 سے زیادہ ملکوں میں انھوں نے کانفرنس میں شرکت کی اور اہم موضوعات پر اپنا مقالہ پیش کیا۔ وہ ممبئی یونیورسٹی کے شعبۂ عمرانیات/ سوشیالوجی میں پروفیسر رہ چکے تھے۔ انگریزی اخبار میں حالات حاضرہ پر مستقل لکھتے تھے۔ آئی او ایس کی مقبول ویب میگزین منارات کے وہ ایڈیٹر بھی تھے۔ اس کے علاوہ 2005 میں وہ آسٹریا کی گراز یونیورسٹی میں وزیٹنگ پروفیسر رہے۔ بیرون ممالک اور بھارت کے متعدد تعلیمی اور سماجی اداروں میں بھی بہت سے مناصب ان کے سپرد تھے اور ہر ایک کو انھوں نے بخوبی نبھانے کی کوشش کی۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 25 نومبر 2020

ڈاکٹر حنیف ترین

سری نگر: عالمی اردو مجلس، دہلی کے صدر اور نامور شاعر و ادیب ڈاکٹر حنیف ترین 3 دسمبر 2020 کو راولپورہ

میں واقع اپنی رہائش گاہ پر انتقال کر گئے۔ مرحوم کے پسماندگان میں ان کی اہلیہ کے علاوہ دو بیٹے اور ایک بیٹی شامل ہیں۔ بیٹوں میں سے ایک ڈاکٹر اور دوسرا انجینئر ہے

جب کہ بیٹی بھی پیشے سے ڈاکٹر ہے۔ ڈاکٹر حنیف ترین کا تعلق دراصل اتر پردیش کے ضلع سنبھل کے سرائے ترین علاقہ سے تھا اور وہ ایک کشمیری ڈاکٹر سے نکاح کرنے کے بعد سری نگر کے راولپورہ علاقہ میں رہائش پذیر تھے۔ خاندانی ذرائع نے بتایا کہ ڈاکٹر حنیف ترین نے جمعرات کی صبح تقریباً چھ بجے راولپورہ میں واقع اپنی رہائش گاہ پر داعی اجل کو لبیک کہا۔ انھوں نے بتایا کہ مرحوم کی تجہیز وتکفین میں لوگوں کی بھاری تعداد نے شرکت کی اور انھیں راولپورہ میں ہی ایک قبرستان میں سپرد خاک کیا گیا۔ انھوں نے بتایا کہ مرحوم کینسر کے موذی مرض میں مبتلا تھے اور حرکت قلب بند ہونے سے ان کی موت واقع ہوئی۔ ڈاکٹر حنیف ترین ایک بہترین ماہر نفسیات کے علاوہ ایک خوبصورت شاعر بھی تھے۔ ان کا اپنا ایک الگ اسلوب تھا جس میں عشق کی رمق بھی اور عصر حاضر کے حالات کی ترجمانی بھی ہوتی تھی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 4 دسمبر 2020

رہبر جونپوری

جونپور: مشرقی یوپی کے معروف شاعر رہبر جونپوری کا طویل علالت کے بعد 3 دسمبر کو انتقال ہوگیا۔ ان کا اصلی نام شیخ منہاج احمد انصاری تھا۔ رہبر جونپوری 2 جنوری 1939 کو موضع جیگہاں میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام شیخ عبدالحمید تھا، سینٹ تھامس اسکول شاہ گنج سے بنیادی تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد گریجویٹ کی ڈگری حاصل کی۔ رہبر جونپوری نے 1953 سے شاعری کی ابتدا کی۔ نظم کے شعرا میں رہبر جونپوری کو بڑا مقام حاصل تھا اور بھارت کے چند معتبر شعرا میں ان کا نام لیا جاتا تھا۔ آوازۂ زنجیر، موج سراب، متاع فکر، رقص قلم، پیغام حق، ضرب احساس کے علاوہ مضامین کی کتاب بولتے حروف ان کا تخلیقی سرمایہ ہے۔ انھیں مختلف اداروں، اکیڈمیوں کے علاوہ صدر جمہوریہ کے ہاتھوں ایوارڈ حاصل ہوا تھا۔ رہبر جونپوری کی تخلیق کردہ نظموں کو لوگوں نے خوب سراہا۔ شاعر رہبر جونپوری کی آخری رسومات موضع جیگہاں میں آبائی قبرستان میں ادا کی گئیں۔ ان کے پسماندگان میں چار لڑکے اور ایک لڑکی شامل ہیں۔

روزنامہ 'اخبار مشرق' دہلی، 4 دسمبر 2020

مینا نقوی

مرادآباد: اپنی شاعری سے پورے ملک میں شہرت حاصل کرنے والی مرادآباد کی مشہور شاعرہ ڈاکٹر مینا نقوی کا 15 نومبر 2020 کو انتقال ہوگیا۔ وہ ایک طویل عرصے سے پھیپھڑوں کے کینسر میں مبتلا تھیں۔ ڈاکٹر مینا نقوی کے

انتقال کی خبر سے ادبی دنیا میں سوگ کی لہر دوڑ گئی۔ ضلع کے قصبہ اغوان پور رہائشی ڈاکٹر مینا نقوی نے ملک بھر کے مختلف ادبی اسٹیجوں پر اپنا کلام پیش کیا، وہ پیشے سے ڈاکٹر تھیں۔ ادب کی خدمت کے عوض انھیں بہت سارے اعزازات ملے۔ ڈاکٹر مینا نقوی کچھ عرصے سے علاج کے لیے نوئیڈا میں مقیم تھیں۔ ڈاکٹر مینا نقوی کے انتقال کی خبر ملتے ہی مرادآباد میں سوگ کی لہر دوڑ گئی اور مقامی ادبا و شعرا نے انھیں خراج تحسین پیش کیا۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 16 نومبر 2020

انور حسین جعفری

نئی دھلی: روزنامہ 'صحافت' کے سابق نامہ نگار سینئر صحافی انور حسین جعفری کا 20 نومبر کو حرکت قلب بند ہوجانے سے اچانک انتقال ہوگیا۔ خاندانی ذرائع کے مطابق مرحوم کو تقریباً 5 بجے ہارٹ اٹیک کی شکایت ہوئی اور اسپتال کے راستے میں داعی اجل کو لبیک کہا۔ مرحوم تقریباً 48 برس کے تھے۔ پسماندگان میں اہلیہ کے ساتھ ایک بیٹا اور دو بیٹیاں ہیں۔ بڑی بیٹی 15 سالہ ام فاطمہ، دوسرا بیٹا 12 سالہ سمبر مہدی اور تیسری بچی 9 سالہ مشیت زہرہ ہیں۔ تدفین مرحوم کے آبائی وطن مظفر نگر ضلع کے بڑھانہ میں سنیچر کو بعد نماز ظہر ہوئی۔ مرحوم جعفری انتہائی ملنسار، انسان دوست اور دوستوں کے کام آنے والے انسان تھے۔ انور جعفری کے انتقال کی خبر سے پوری صحافی برادری میں غم واندوہ کی لہر دوڑ گئی۔ سبھی دوست انتہائی صدمے میں ہیں اور ان کے ساتھ بتائے ہوئے خوشگوار لمحات کو اشکبار آنکھوں سے یاد کر رہے ہیں۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 21 نومبر 2020

شاہد نعیم

نئی دھلی: سینئر صحافی سید شاہد نعیم کا دہلی کے رنجیت نگر میں ان کی رہائش گاہ پر تقریباً 65 سال کی عمر میں حرکت قلب بند ہونے سے انتقال ہوگیا، ان کے انتقال سے صحافتی دنیا سمیت علمی اور ادبی حلقوں میں غم کی لہر دوڑ گئی، مرحوم کی تدفین ان کے آبائی وطن موضع جڑودہ میں عمل میں آئی، ان کے جنازے میں قرب و جوار کی سرکردہ شخصیات سمیت کئی ادبی شخصیات نے شرکت کی۔ مرحوم شاہد نعیم نے اپنے صحافتی سفر کا آغاز ضلع رامپور کے قومی جنگ اخبار سے کیا تھا، اس کے بعد دہلی سے شائع ہونے والے ماہنامہ جرائم میں وہ بطور ایڈیٹر طویل عرصے تک وابستہ رہے، ساتھ ہی انھوں نے ماہنامہ بھیا نک جرائم اور نکہت گل میں بھی اپنی خدمات انجام دیں۔ اس کے بعد انھوں نے ہفت روزہ اردو اخبار چوتھی دنیا سے منسلک ہوکر ادارتی امور انجام دیے۔ سید شاہد نعیم میرٹھ کے موضع جڑودہ میں سید احمد علی اور رحمت النسا کے یہاں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم گاؤں میں ہی حاصل کی اور اعلی تعلیم سے مزین ہوکر صحافت کے میدان میں قدم رکھا۔ مرحوم کے پسماندگان میں بیوہ کے علاوہ دو بیٹے سید ازل نعیم، سید انظر نعیم اور ایک بیٹی سیدہ ثانیہ نعیم ہیں۔

روزنامہ 'میرا وطن' دہلی، 7 دسمبر 2020

مشتاق احمد مشتاق

حاجی پور: ڈاکٹر مشتاق احمد مشتاق صاحب بھیرو پور حاجی پور ویشالی اللہ کو پیارے ہوگئے۔ وہ ویشالی ضلع میں اردو کے بڑے ستون تھے۔ انھوں نے مختلف کتابیں تصنیف کیں، انھوں نے ان تمام مقالات کو جو انجمن ترقی اردو ویشالی کے سمیناروں میں پڑھے گئے کتابی شکل میں جمع کیا، ان میں ایک کتاب ثناء الہدیٰ قاسمی شخصیت اور خدمات بھی ہے جس میں انھوں نے 2001 میں انجمن ترقی اردو کے زیر اہتمام پڑھے گئے مقالات کو جمع کیا تھا۔ مشتاق صاحب نے اردو کے کاز، کام اور اردو کے فروغ کے لیے آخری دم تک جدوجہد کی۔

روزنامہ 'سچ کی آواز' دہلی، 5 دسمبر 2020

ماسٹر رونق علی

رامپور: 15 نومبر کی صبح 10:38 بجے رامپور کا ایک علمی ادبی، روحانی اور سماجی چراغ گل ہوگیا۔ بدایوں میں پیدا ہونے والے ماسٹر رونق علی کا 1956 میں اس وقت کی عالمی دانش گاہ مرکزی درسگاہ اسلامی میں ریاضی کے استاد کے طور پر تقرر کیا گیا تھا جس کے بعد سے وہ یہیں مقیم ہوگئے تھے اور 1954 سے پہلے ہی وہ جماعت اسلامی ہند کے رکن تھے۔ درسگاہ اسلامی سے باعزت سبکدوش ہونے والے ماسٹر رونق علی رامپور سمیت کئی اضلاع کے امیر جماعت اسلامی رہے۔ ان میں تربیت اور درس دینے کا بہترین ملکہ تھا اور ہمیشہ اپنے محبین کو سچ کی تلقین اور حق بات کہنے کی ہدایات کیا کرتے تھے۔ جب جماعت اسلامی کے امیر ہوئے تب انھوں نے بیوہ خواتین کا ماہانہ وظیفہ باندھ دیا تھا اور بچوں کی تعلیم کے لیے الگ سے وظائف جاری کرائے جس سے بڑی تعداد میں طلبا سیراب

ہوئے۔ ان کی اہلیہ کا پہلے ہی انتقال ہوگیا تھا جب کہ چند سال قبل جواں سال صاحبزادے ڈاکٹر محمد طیب بھی ان کی آنکھوں کے سامنے ہی داغ مفارقت دے گئے تھے۔ ان کی بے شمار سماجی، دینی اور علمی خدمات ہیں جن کو رامپور کبھی فراموش نہیں کرسکتا۔

روزنامہ 'سچ کی آواز'، دہلی، 16 نومبر 2020

ناشر کاظمی

نئی دهلی: چوہان بانگر کی بلال مسجد کے نزدیک رہنے والے بزرگ شاعر ناشر کاظمی کا طویل علالت کے بعد 29 نومبر کو انتقال ہوگیا۔ وہ 85 برس کے تھے۔ ان کے پسماندگان میں چار لڑکے اور دو لڑکیاں شامل ہیں۔ مرحوم کا آبائی وطن اتر پردیش کا معروف قصبہ امروہہ ہے۔ شاعر نواز شاہد چنگیزی کا کہنا ہے کہ ناشر کاظمی کہنہ مشق شاعر تھے جن کے انتقال سے شعر و ادب کی دنیا میں خلا پیدا ہوا ہے۔ ان کے انتقال پر اقبال اشہر، شرف نانپاروی، اقبال مسعودی ہنر، امیر امروہوی، آفتاب آذر، سیف سحری، قاصر سہوانی و دیگر سرکردہ شخصیات نے اظہار تعزیت کیا ہے۔

روزنامہ 'اخبار مشرق' دہلی، 30 نومبر 2020

ذوالفقار خان زلفی

نئی دهلی: دنیائے موسیقی کے نامور گلوکار ذوالفقار احمد خان کا 53 سال کی عمر میں 1 دسمبر کو انتقال ہوگیا۔ ذوالفقار خان کے بڑے بھائی ظفر احمد خان نے میرا وطن سے بات کرتے ہوئے بتایا کہ ان کے چھوٹے بھائی کو بچپن سے ہی گلوکاری سے گہری دلچسپی تھی جس کی وجہ سے پہلے وہ اسکول سطح پر اور اس کے بعد کالج میں گلوکاری کے مقابلوں میں حصہ لیتے رہے۔ بعد میں وہ ایک معروف غزل سنگر کے طور پر ابھرے۔ وہ زلفی کے نام سے مشہور تھے۔ انھوں نے اپنی گلوکاری کے دم پر خوب شہرت حاصل کی۔ وہ اپنے فن کا مظاہرہ کرنے کے لیے دنیا کے کئی ممالک سنگاپور، دبئی، کویت وغیرہ جاتے رہے۔ انھوں نے غلام علی خان کے ساتھ بھی گلوکاری کی ہے۔ وہ جگجیت سنگھ کے چہیتے بھی تھے۔ ان کی ایک اور خصوصیت یہ بھی تھی کہ وہ ہو بہو جگجیت سنگھ کے انداز میں غزل گاتے تھے۔ ان کے اچانک انتقال سے دنیائے موسیقی میں غم کی لہر دوڑ گئی ہے۔ ان کی تدفین اجمیر کے ویشالی نگر میں آبائی قبرستان میں عمل میں آئی۔ ان کے پسماندگان میں اہلیہ، بیٹی اور بیٹا ہیں۔

روزنامہ 'میرا وطن' دہلی، 2 دسمبر 2020

خراج عقیدت

مولانا ابوالکلام آزاد

ممبئی: مولانا ابوالکلام آزاد کے یوم پیدائش 11 نومبر کے موقعے پر اردو کارواں کی جانب سے بعنوان 'مولانا آزاد کی صحافتی خدمات اور اکیسویں صدی میں اردو

صحافت' ویبینار کا انعقاد کیا گیا۔ پروفیسر شبانہ خان نے اردو کارواں کا تعارف پیش کرتے ہوئے کہا کہ صحافت جمہوریت کا تیسرا ستون ہے اور سماج پر صحافت کا گہرا اثر پڑتا ہے۔ مولانا آزا کی صحافتی سرگرمیوں اور موجودہ دور کی صحافت میں کیا کچھ فرق آچکا ہے، اسے طلبا کے لیے جاننا بے حد ضروری ہے جو صحافت میں اپنا مستقبل محفوظ کرنا چاہتے ہیں۔ فرید احمد خان صدر اردو کارواں نے ویبینار کی غرض و غایت بیان کرتے ہوئے کہا کہ مولانا آزاد کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے۔ وہ اپنی ذات میں انجمن تھے، ان کی شخصیت کے کئی پہلو ہیں مگر جہاں تک ان کی صحافتی خدمات کا تعلق ہے، وہ قلم کے سپاہی تھے اور ان کی صحافتی زندگی صحافی برادری کے لیے مشعل راہ ہے۔ ان کی صحافت کی روشنی میں یہ دیکھنا ہے کہ آج کی صحافت کہاں پر ہے اور اس میں کیا کیا تبدیلیاں آچکی ہیں۔ انھوں نے ویبینار میں موجود مہمان مقررین شاہد لطیف (ایڈیٹر انقلاب)، شافع قدوائی (صدر جرنلزم علی گڑھ مسلم یونیورسٹی)، پروفیسر سلطان احمد (شعبۂ اردو)، شکیل رشید (ایڈیٹر اردو نیوز) اور امان عباس (مالک و مدیر روزنامہ صحافت) کا تفصیلی تعارف بھی پیش کیا۔ شاہد لطیف نے مولانا آزاد کی صحافت کے تعلق سے کہی کہ آج کل زیادہ تر ہوتا یہ ہے کہ یا تو مولانا آزاد کی شخصیت کے تعلق سے تقریر کی جاتی ہے یا ان کی تحریر کے اقتباس سے اپنی تقریر کو خوبصورت بنانے کی کوشش کی جاتی ہے اور یہ بھی سال کے سال ہوتا ہے۔ ہونا تو یہ چاہیے کہ ہر سیکولر مزاج انسان کا رابطہ مولانا کی تحریروں سے روزانہ کے معمول میں شامل ہونا چاہیے۔ پروفیسر شافع قدوائی نے کہا کہ پہلے تو ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ سو سال پہلے کی صحافت موجودہ دور کی صحافت سے کس قدر مطابقت رکھتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ مولانا آزاد کی صحافت کی طرف نظر ڈالیں تو پتہ چلے گا کہ مولانا کا ذہن سوچتا ہوا ذہن ہے، فکر ہے مشورے ہیں، اشتعال انگیزی نہیں ہے، ان کے یہاں صحافت کا ارتقا نظر آتا ہے۔ ان کے ہاں قومیت انسان دوستی کی شکل میں برقرار ہے، ان کی تحریروں میں تابناکی ہے۔ نفرت اور اشتعال انگیزی نہیں ہے۔ ایک اچھی اور بنیادی صحافت کے لیے مولانا کی تحریروں کی طرف آج کی نسل کو رجوع کرنا پڑے گا۔ ڈاکٹر سلطان احمد نے مولانا آزاد کی صحافت اور صحافتی سرگرمیوں کے تعلق سے مقالہ میں کہا کہ مولانا آزاد نے اپنی صحافت کے ذریعے آنے والی نسلوں کے لیے تفصیل سے رہنمائی کی۔ امان عباس نے کہا کہ اردو اخبارات اور ان کا سرکولیشن تب تک نہیں بڑھ سکتا جب تک اردو اخبارات گھر گھر نہیں پہنچتے۔ انھوں نے کہا کہ کسی بھی کام کے لیے مستقل مزاج ہونا بہت ضروری ہے اور مولانا کے ہاں مستقل مزاجی بدرجۂ اتم موجود تھی۔ ویبینار کی صدارت اور رسم شکریہ کے فرائض شبانہ خان نے انجام دیے۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 13 نومبر 2020

یوم شبلی کے موقعے پر تقریب کا انعقاد

اعظم گڑھ: علامہ شبلی نعمانی ایک فرد نہیں بلکہ ایک ادارے کا نام ہے، شبلی کی زندگی کا جو مقصد تھا اس کو عملی

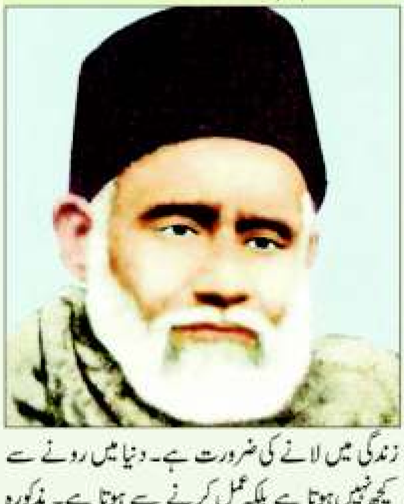

زندگی میں لانے کی ضرورت ہے۔ دنیا میں رونے سے کچھ نہیں ہوتا ہے بلکہ عمل کرنے سے ہوتا ہے۔ مذکورہ خیالات کا اظہار رکن اسمبلی و شبلی نیشنل کالج کے منیجر شاہ عالم گڈو جمالی نے یوم شبلی کے موقعے پر شبلی نیشنل پوسٹ

گریجویٹ کالج میں منعقد ایک تقریب میں خطاب کرتے ہوئے کیا۔ انھوں نے مزید کہا کہ اگر اس ادارے کے ذمہ داران تھوڑی سی کوشش کریں تو اس ادارے کو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور جامعہ ملیہ دہلی کے معیار تک لے جایا جاسکتا ہے۔ صدارتی خطبہ مولانا عمیر الصدیق ندوی نے پیش کیا۔ بحیثیت مہمان خصوصی ابوسعد اصلاحی نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ شبلی کی جو فکر و بصیرت ہے وہاں تک صرف چند لوگ پہنچے ہیں۔ اس وقت دیوبند اور سرسید کی تحریک ترقی وعروج پر تھی، دیوبند نے اپنے ماضی کی عظمتوں کو سمیٹا اور قوم و مغرب کی یلغار سے بچایا، سرسید نے مغربی نظریات کا استقبال کیا لیکن شبلی نے ان دونوں تحریکوں کے بیچ کا راستہ نکالا اور کہا کہ ماضی کی عظمتوں کو سمیٹنے کے ساتھ ساتھ یوروپ سے جو کچھ آرہا ہے اس میں سے مثبت چیزوں کو قبول کرنا چاہیے۔ ڈاکٹر فخر عالم اعظمی استاذ خواجہ معین الدین چشتی یونیورسٹی لکھنؤ نے کہا کہ شبلی کو ان کی کم عمری میں علی گڑھ میں مدعو کیا گیا تھا، اس سے ان کی علمی عظمت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ شبلی اردو کے پہلے تاثراتی نقاد تھے۔ ڈاکٹر الیاس اعظمی نے کہا کہ ابوالکلام آزاد نے کہا تھا کہ ہندوستان میں فارسی شاعری کا خاتمہ شبلی پر ہوتا ہے۔ جب اعظم گڑھ میں شبلی نے ادارہ قائم کیا تھا تو وہ اس کے پہلے سکریٹری تھے اور آج بھی ہم اس کالج کے سکریٹری سے اسی طرح کی امید رکھتے ہیں۔ شبلی نے زندگی میں کبھی بھی اپنی ذات کے لیے کچھ نہیں کیا بلکہ جو کچھ کیا وہ قوم کے لیے کیا۔ آج کا دن ہمارے لیے یوم احتساب ہے۔ ان کے علاوہ شبلی انٹر کالج کے پرنسپل نثار احمد، شبلی کالج کے استاد ڈاکٹر سرفراز نواز اور ڈاکٹر علاؤالدین خان نے بھی خطاب کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 19 نومبر 2020

جشن یوم تعلیم

دیوبند: دیوبند کے مختلف دینی تعلیمی اداروں میں مولانا ابوالکلام آزاد کا یوم پیدائش جشن یوم تعلیم کے طور پر منایا گیا۔ محلہ خانقاہ میں واقع شاہ منزل پر ایک پروگرام کا انعقاد کیا گیا جس میں شہر کے اردو ٹیچروں نے شرکت کرکے مولانا ابوالکلام آزاد کی ادبی وملی خدمات پر روشنی ڈالی۔ اس موقعے پر معروف ادیب وقلم کار سید وجاہت شاہ نے کہا کہ مولانا آزاد نے جس ماحول میں مسلمانوں میں شعور پیدا کرنے کا کام کیا وہ بہت نازک تھا۔ سید وجاہت شاہ نے کہا کہ مولانا ابوالکلام آزاد نے قرآن وحدیث وفقہ کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ ان کا عقیدہ تھا کہ قرآن ہماری زندگی کے ہر شعبے میں ہماری رہنمائی کرتا ہے۔ مولانا کی ادبی، سماجی، تاریخی اور سیاسی تحریروں میں قرآن کے حوالے موجود ہیں۔ سید وجاہت شاہ نے بتایا کہ مولانا ابوالکلام آزاد نے بہت سے رسالوں میں مضامین لکھے اور کئی ادبی رسالے شائع کیے۔ انھوں نے جب پہلا رسالہ جاری کیا۔ اس وقت ان کی عمر صرف گیارہ برس تھی۔ یہ رسالہ سات، آٹھ مہینے جاری رہا۔ بعد میں المصباح، احسن الاخبار ہفت روزہ پیغام، الجامعہ وغیرہ رسائل میں خدمات انجام دیں۔ 1909 میں 'لسان الصدق' ماہ نامہ رسالہ کا پہلا شمارہ کلکتہ سے شائع کیا جس کا اول مقصد اصلاح معاشرت، دوسرا مقصد ترقی، تیسرا مقصد علمی ذوق کی اشاعت اور چوتھا مقصد تنقید یعنی اردو تصانیف کا منصفانہ جائزہ لینا تھا۔ مولانا نے 1912 میں ہفت روزہ 'الہلال' کا پہلا شمارہ شائع کیا۔ اس کا اہم مقصد ہندوؤں اور مسلمانوں میں اتحاد پیدا کرنا تھا۔ سید وجاہت شاہ نے مولانا ابوالکلام آزاد کے بتائے ہوئے راستہ پر چل کر ملک کی ترقی کے لیے کام کرنے کی اپیل کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 13 نومبر 2020

■

Subscription Form "Urdu Duniya"

سالانہ خریداری فارم

میں 'اردو دنیا' کا رکی سالانہ خریدار بننا چاہتا رچاہتی ہوں۔

150 روپے کا ڈرافٹ/ منی آرڈر.................. بتاریخ.................. بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔

میں نے زرتعاون سالانہ -/150 روپے IFSC: SYNB0009009، A/C: 90092010045326 میں جمع کروادیا ہے۔

آپ 'اردو دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام : ....

پتہ : ....

....

....

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں:

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing7, RK Puram, New Delhi - 110066

فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159، E-mail.:sales@ncpul.in

دستخط

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

قومی پالیسی برائے تعلیم 2020

وزارت تعلیم، حکومت ہند

پہلی اشاعت: 2020

صفحات: 116

قیمت: 35 روپے

بھارت کا آئین

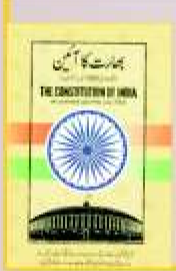

چھٹی اشاعت: 2019

صفحات: 515

قیمت: 330 روپے

اردو ادب کی سماجیاتی تاریخ

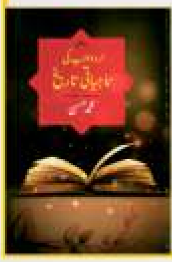

مصنف: محمد حسن

دوسری طباعت: 2020

صفحات: 334

قیمت: 160 روپے

آج کے عالمی تناظر میں اردو کا تحفظ اور فروغ

مرتب: شیخ عقیل احمد

پہلی اشاعت: 2020

صفحات: 467

قیمت: 240 روپے

گرونانک: حیات وخدمات

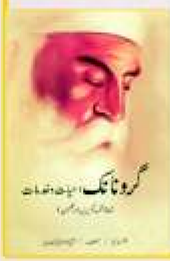

مرتبین: اختر الواسع، محمد حبیب

مفتی محمد مشتاق تجاروی

پہلی اشاعت: 2020

صفحات: 190، قیمت: 110 روپے

دربار اکبری

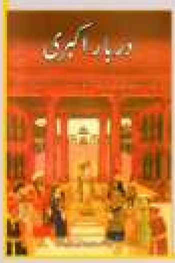

مصنف: شمس العلما مولانا محمد حسین آزاد

تیسری طباعت: 2020

صفحات: 1070

قیمت: 475 روپے

راسخ عظیم آبادی: کلاسیکیت، شعریت اور انفرادیت

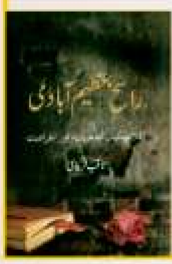

مصنف: ثاقب فریدی

پہلی اشاعت: 2020

صفحات: 422

قیمت: 200 روپے

حیاتیاتی تنوع اور ماحولیات کے مسائل

مصنف/مترجم: حافظ شائق احمد یحیٰ

پہلی اشاعت: 2020

صفحات: 132

قیمت: 90 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

URDU DUNIYA Monthly, January-2021, Vol.23, Issue:01
National Council for Promotion of Urdu Language
Ministry of Education, Department of Higher Education, Government of India

RNI NO. 70323/99
DL (S) - 01/3394/2020-22
ISSN 2249 - 0639
Date of Publication:24/12/2020
Date of Dispatch : 25 & 26 of advance month

سوچھ بھارت
ایک قدم صفائی کی جانب

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش

اردو زبان وادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے
مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظرِ عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!

ہندستانی خَریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے

(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ، http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

منگانے کے لیے رابطہ کریں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

Printed and Published by Dr. Aquil Ahmad, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at S.Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II. New Delhi-110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 institutional Area Jasola New Delhi-110025